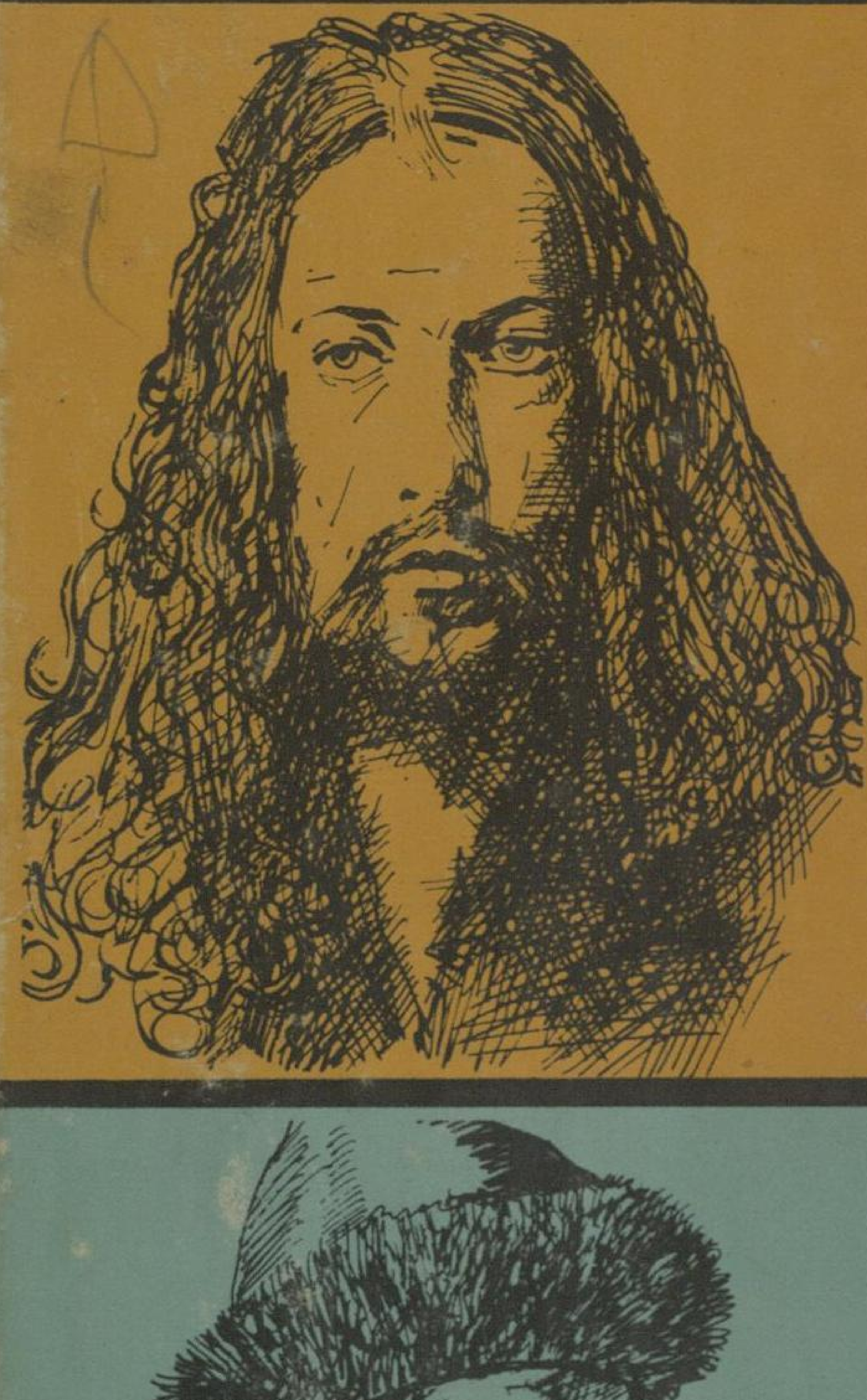
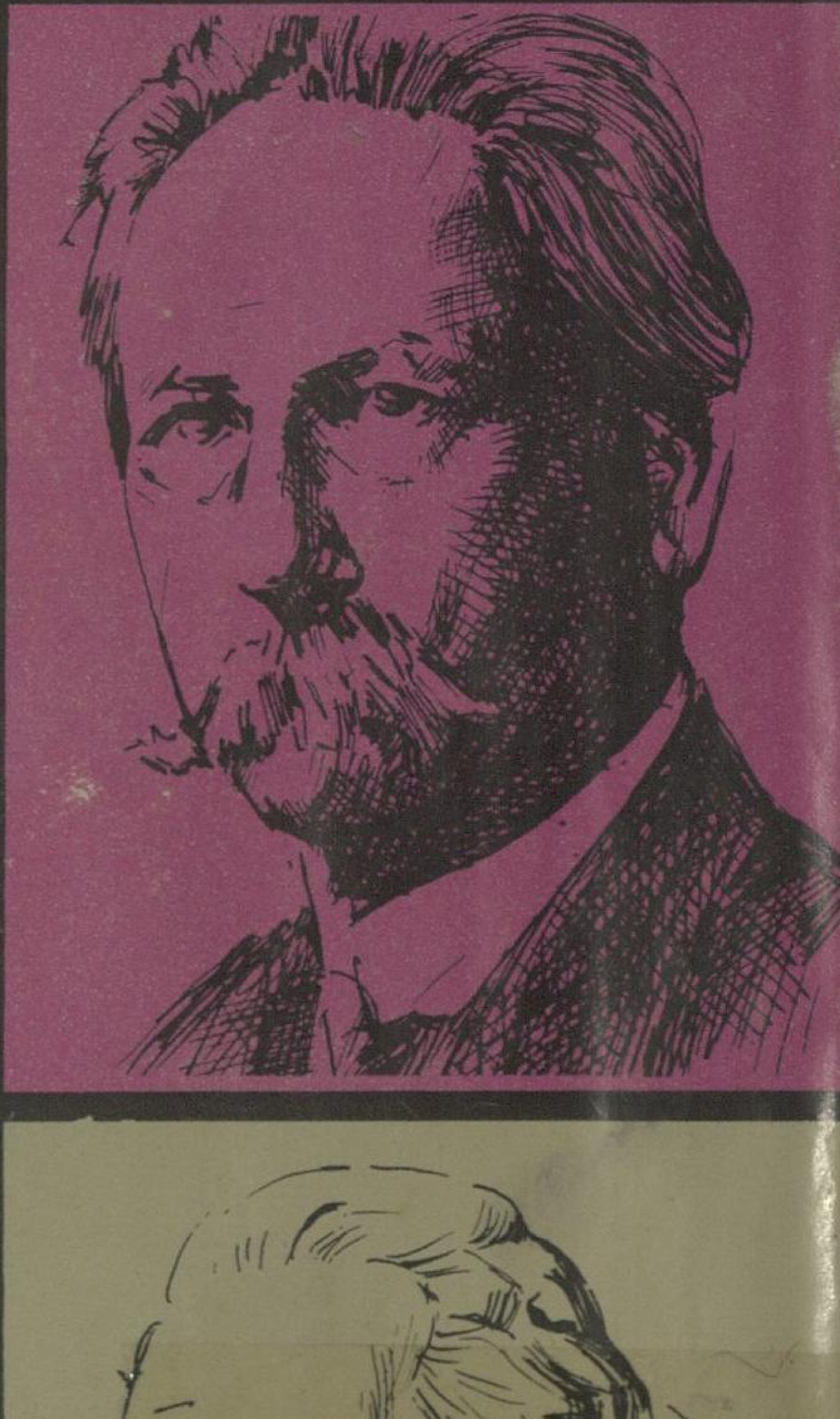
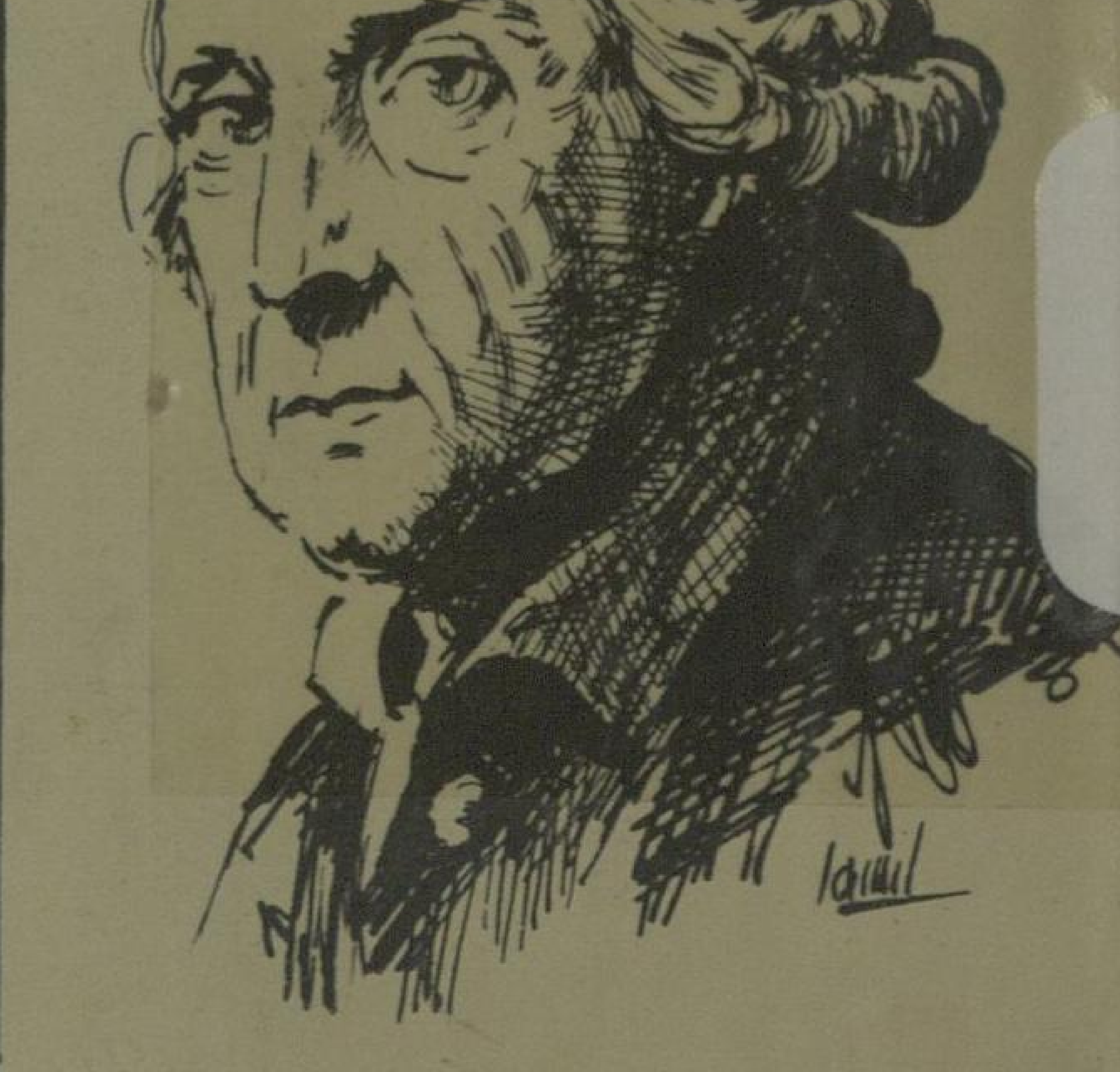
مشاہیرِ جرمنی









مشاہیرِ جرمنی

مترجمہ

سیّد سعید احمد
ایم۔اے۔ایم۔ایس۔سی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ، راولپنڈی ، منگلا ، پشاور ، حیدرآباد ، کراچی

This is an authorised Urdu translation of "German Heritage" published by Ferozsons Ltd. in cooperation with Horst Erdmann Verlag, Tubingen/Germany. Basis for this anthology are broadcasting-features of the Radio Station VOICE OF GERMANY.

First Urdu edition.
Printed in Pakistan.

بار اوّل ——— اگست ۱۹۷۰ء
تعداد طبع ——— ۶۰۰۰
قیمت ——— [illegible]۰۰

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ - لاہور • باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

ترتیب

اِفتتاحیہ

یہ جرمن ریڈیو "ڈیوٹشے ویلے" کا کارنامہ ہے کہ اس نے دُنیا کے سامنے جرمنی کی ایک تصویر پیش کر دی۔ یہ تصویر اِٹھائیس زبانوں میں منتقل کی جا رہی ہے جو حالاتِ حاضرہ کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل پر بھی مشتمل ہے اور متمدّن زندگی کے ثقافتی اور اِقتصادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔

کِسی اِنسان کی موجودہ زِندگی اس کے ماضی کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے۔ جرمنی کے دُوسرے اقوام سے روابط میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کو بالکل نیا کہا جا سکے، بیشتر باتیں روایات پر مبنی ہیں اور بعض باتوں کی جڑیں تو ماضی بعید میں بہت دُور تک چلی گئی ہیں۔ "ڈیوٹشے ویلے" یا تو اقوام و ممالک سے نئے رشتے قائم کرتا ہے یا پُرانے تعلقات کو بحال کرتا ہے تاکہ روابط کی اقدار مشترک میں حال و مُستقبل ماضی سے یکساں طور پر متاثر ہو سکیں۔
"ڈیوٹشے ویلے" کا شعبۂ جنوبی ایشیا ایک مدّت سے سنسکرت کے مستقل پروگرام نشر کر رہا ہے۔ یہ نہ صرف چار پانچ صدی قبل مسیح کے

ہندوستان کی معیاری زبان کے احترام کی علامت کی نشان دہی اور متذکرہ زبان کے احیار کا اعتراف ہے بلکہ اس بات کا بھی مظاہرہ ہے کہ جرمن علمار نے کس حد تک سنسکرت کا مطالعہ کیا ہے، جرمن ذہانت نے ہندوستان کے مذہب، سائنس اور ثقافت پر کتنی توجّہ کی ہے اور اس کو کہاں تک اپنی زندگی میں داخل کیا ہے ؟ اس کتاب میں ایسے جو بھی حوالے ہیں، ان کو کسی اِتّفاق پر محمُول نہ کیا جائے۔

یہ کتاب جرمنی کی ان ممتاز ہستیوں کی زندگیوں اور کارناموں کو پیش کرتی ہے جنھوں نے مادرِ وطن کی حدُود سے باہر بھی اپنی اہمیت کے اثرات مُرتّب کیے اور اس طرح دُوسری اقوام سے جرمنی کے رِشتوں کو استوار کیا۔ مجھے پُورا یقین ہے کہ قارئین اس کتاب کو موجُودہ جرمنی کی ثقافتی میراث کا ایک نشان قرار دیں گے۔

ڈاکٹر ہینس۔ اوٹو وسیمان

تعارف

"ڈیوٹشے ویلے" کا شعبہ جنوبی ایشیا، "وائس آف جرمنی" کئی سال سے "جرمن وراثت" کے عنوان سے ایک سلسلہ نشر کر رہا ہے جو ان جرمن مشاہیر کی زندگیوں سے متعلّق ہے جنھوں نے مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کردار ادا کیے ہیں۔

اِس سِلسلے کے اجراء کے دو وجُوہ تھے۔ پہلی وجہ جرمنی پر نیشنل سوشلسٹوں کی بارہ سالہ حکومت تھی جس نے جرمنی کے تصوّر کو عوامی نگاہوں میں سفاکانہ بنا دیا اور جرمنی کی حقیقی آواز کو بجبر دبا دیا تھا۔ دُوسری وجہ مشرق کا کمیونسٹ پراپیگنڈا تھا۔ بالخصوص سوویٹ یونین کا پروپیگنڈا، جس کو وفادار حاشیہ نشینوں کا تعاون حاصل تھا اور جس میں جرمنی کا سوویٹ زون پیش پیش تھا۔ مقصد یہ تھا کہ دُنیا میں مشہُور کر دیا جائے کہ جرمنی کی فیڈرل ری پبلک میں جنگ جویانہ وطن پرستی کی حکومت ہے حالانکہ کوئی غیر جانبدار اہلِ نظر حقیقتاً وہاں ایسی کوئی بات نہیں پاتا بلکہ اس کے برعکس اس کو نہ صرف بڑے شہروں میں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبات میں بھی متمدّن زندگی کی چہل پہل ملتی ہے۔

بکثرت تھیٹر، تفریبات کی دعوتیں اور عوامی ہائی اسکول اس پر دلالت کرتے ہیں۔

آج کا جرمنی اس کتاب کے مشاہیر کا رُوحانی وارث ہے جن میں صرف ایک عورت کی شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ کسی نمایاں سطح پر پہنچنے کے لیے عورتوں کی آزادی ابھی کل کی بات ہے، تاہم موجودہ صدی اس سے بالکل مختلف ہے جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ہم نے "خواتین خبروں میں" کے عنوان سے نشریات کا ایک سلسلہ شرُوع کیا ہے جس میں دورِ حاضر کی ان خواتین کو لیا گیا ہے جنھوں نے کسی بھی شعبے میں کوئی نمایاں مقام حاصِل کیا ہے۔

اس کتاب کے سوانح نگار ڈیوٹشے ویلے سے منسلک صحافی اور آزاد لکھنے والے حضرات ہیں۔ ایک بات اِن سب میں مشترک ہے جس کو جرمنیت کہا جا سکتا ہے مگر اس کا تعلّق غرور یا تکبّر سے نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر قوم کے افراد میں اس ملک کے کردار کی خصُوصیت کے لحاظ سے پائی جاتی ہے۔

ہمیں پُوری اُمید ہے کہ قارئین ان کارناموں سے اِتنی ہی مسرّت محسُوس کریں گے جتنی ہمیں اس کتاب کی تحریر و ترتیب میں ان مشاہیر کے اِنتخاب میں ہوئی۔

چیف ایڈیٹر شعبۂ جنوبی ایشیا



گٹن برگ

جرمن ٹائپ کا موجد

یان گٹن برگ

جرمن ٹائپ کا موجد ۱۳۹۴ء — ۱۴۶۸ء

حرکت پذیر ٹائپ کے ذریعے طباعت کا کام یورپ میں پندرھویں صدی کے وسط سے کچھ پہلے شروع ہوا۔ اِس طریقہ طباعت کا موجد یان گٹن برگ تھا مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ یورپ نے اس ایجاد میں بڑی تاخیر کی۔ کتابوں کی نشر و اشاعت کے لیے ہاتھ سے نقل کرنے کے بجائے کسی بہتر طریقۂ کار کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی تھی لیکن اِس سلسلے میں حروف کی نوعیت کے بارے میں بعض دشواریاں رُکاوٹ بنی رہیں۔

چینی، جنھیں طباعت میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے، آئیڈیو گراف اِستعمال کرتے تھے جو لکڑی پر کھدائی کر کے تیار کیے جاتے۔ آئیڈیو گراف ایک صفحے پر درجنوں استعمال ہوتے تھے لیکن مغربی زبانوں کے حروفِ تہجّی اِس قدر چھوٹے تھے کہ ایک صفحے کے لیے بعض اوقات سو آئیڈیو گرافوں کی ضرورت ہوتی۔ آخر گٹن برگ نے ایک بڑی تعداد میں صاف ستھرے ٹائپ تیار کر کے اِس مسئلے کا حل دریافت کر لیا۔ کاغذ کی تو کوئی کمی تھی ہی نہیں کیونکہ یہ گیارھویں صدی عیسوی میں

اسپین اور اٹلی کے راستے یورپ پہنچ چکا تھا۔ ناشرین کے لیے کتابوں کے بازار بھی موجود تھے، جامعات میں طلبہ کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ رہی تھی اور تجارت کی توسیع کی وجہ سے متوسط طبقے کے بھی دن پھر رہے تھے لہٰذا دونوں طبقوں میں کتب بینی کا شوق پروان چڑھنے لگا۔

یان گٹن برگ ۱۳۹۵ کے قریب جرمنی کے ایک قدیم شہر مینز میں پیدا ہوا جہاں دریائے سین دریائے رہان سے آکر ملتا ہے۔ وہ رؤسا کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے جرمنی میں جاگیرداروں، تاجروں اور اعلیٰ افسران کو رؤسا میں شمار کیا جاتا۔ اس کا باپ آرک بشپ کے محل سے ملحق ایک ٹیکسال میں ملازم تھا۔ گٹن برگ نے یہاں سناری کا کام سیکھا اور یہی کام اس کی شہرۂ آفاق ایجاد کا پیش خیمہ ہوا۔ وہ ساری زندگی مینز میں قیام نہ کر سکا۔ ۱۴۲۸ء میں اسے اپنے آبائی شہر کو خیرباد کہنا پڑا کیونکہ وہاں کی انجمنوں نے، جو گلڈ کہلاتی تھیں، رؤسا کو امتیازی حیثیت سے دستبردار کرنے کی ایک زبردست مہم شروع کر دی تھی۔

یان گٹن برگ مینز سے اسٹراس برگ پہنچا۔ یہ شہر بھی دریائے رہائن پر واقع ہے۔ ۱۴۳۹ء میں وہ ایک مقدمے میں ماخوذ ہو گیا۔ اس مقدمے کی کارروائی سے اس کے مشاغل پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ پھر گٹن برگ نے کچھ لوگوں کے تعاون سے ایک جماعت کی تشکیل کی

جس کا مقصد شرکا کو بعض فنون کی تعلیم دینا تھا۔ ان فنون کا ہر پہلو طباعت سے متعلق تھا۔ کچھ دنوں بعد اچانک اس کے ایک شریکِ کار کا انتقال ہوگیا جس سے معاہدے کی بعض شرائط کے ذیل میں مقدمے بازی کی نوبت آگئی کیونکہ انھیں مرتب کرتے وقت ضروری احتیاط نہیں برتی گئی تھی۔ اِس مقدمے کی کارروائی سے پتہ چلتا ہے کہ گٹن برگ نے ایک پریس کے ساز و سامان کی خریداری پر کافی روپیہ خرچ کیا تھا۔ ریکارڈ میں ایک لفظ فارمن (FORMEN) کا استعمال جابجا پایا جاتا ہے جو بعد میں جرمن ٹائپ میں ٹائپ کے لیے مستعمل ہوا۔
مزید برآں ۱۴۳۶ء میں یان گٹن برگ نے ایک سنار ہنس ڈیون کو بھی کچھ روپیہ فراہم کیا تھا تاکہ وہ طباعت کے متعلق کسی کام میں اُس کی کچھ مدد کر سکے۔

اِن حقائق کے باوجود اس کی کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی کہ گٹن برگ نے اسٹراس برگ میں قیام کے دوران میں کوئی چیز چھاپی ہو۔ کم از کم ہم تک تو کوئی ایسی بات پہنچی نہیں۔ بہر حال اس نے مقدمہ جیت لیا، اور نتیجتہً پانچ سالہ معاہدہ کو ۱۴۴۲ء میں ختم کرنے کی اجازت مل گئی۔ گٹن برگ کے قیام اسٹراس برگ کی آخری تاریخ ۱۲ مارچ ۱۴۴۴ء ہے۔ اِسی تاریخ کو اس نے شراب خانے کا محصول ادا کیا تھا۔ اس کے بعد جس تاریخ کے بارے میں یقین سے کچھ کہا جا سکتا ہے وہ ۱۷ اپریل ۱۴۴۸ء ہے کیونکہ اسی تاریخ کو اس کا دوسری بار مینز پہنچنا

ثابت ہوتا ہے جہاں وہ ایک بار پھر قرض پر زندگی بسر کرنے لگا۔

۱۴۴۸ء یا ۱۴۴۹ء میں گٹن برگ نے شہر کے ایک وکیل جان فسٹ کے تعاون سے ایک نئی انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب دُنیا اس کے ٹائپ کے طریقۂ طباعت سے عملی طور پر واقف ہوئی۔ فسٹ نے گٹن کے ساز و سامان کے تحفّظ کی خاطر سرمایہ بھی فراہم کیا۔ بعد میں جب ضرورت پڑی تو اس نے مزید روپیہ لگانے میں بھی دریغ نہیں کیا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ خود بھی اس کا شریک بن گیا اور ۱۴۵۵ء میں فسٹ نے گٹن برگ پر قرض کی وصولیابی کے لیے دعویٰ دائر کر دیا۔ یہ قرض مجموعی طور پر دو ہزار چھبیس گلڈ (جرمنی کا پُرانا سکّہ) بنتا تھا۔ گٹن برگ اِتنی بڑی رقم ادا نہ کر سکا اور مقدمہ ہار گیا۔ چنانچہ اس کے تمام ساز و سامان پر فسٹ کا قبضہ ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ یہی وہ وقت تھا جب کہ مشہورِ زمانہ بیالیس سطری بائیبل قریب قریب مکمّل ہو چُکی تھی۔

اگر اس بات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ اصل سرمائے کی ادائی کا اِمکان پیدا ہو چلا تھا۔ سوال یہ ہے کہ فسٹ نے گٹن برگ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لیے اِسی وقت کا تعیّن کیوں کیا؟ قرینِ قیاس نہیں کہ وہ اپنی رقم واپس لینا چاہتا ہو کیونکہ عنقریب اُسے معقول منافع مِلنے والا تھا۔ ایک بات یہ ہو سکتی ہے کہ شاید وہ چھاپہ خانہ پر پُورا قبضہ کرنا چاہتا ہو۔ اس کے علاوہ اس کا اور کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک بار بائیبل اور

تفصیلی چرچ سروس بک، جس پر گٹن برگ کام کر رہا تھا، بازار میں آ گئی تو وہ تمام اگلے پچھلے قرضے چکانے کے قابل ہو جائے گا اور اس طرح آیندہ سارا کام اپنے طور پر کرنے لگے گا اور فسٹ کو اپنی لگائی ہوئی پونجی پر بس تھوڑا سا منافع مل کر رہ جائے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے قرض کی ادائیگی سے کچھ ہی پہلے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا دیا لیکن یہ ایک مفروضہ ہے جو حقیقت سے قریب معلوم ہوتا ہے۔ بہر کیف یہ طے شدہ ہے کہ دونوں کی آپس میں نہ بن سکی۔ اس ان بن کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ گٹن برگ نسلاً طبقۂ امرار سے تعلق رکھتا تھا جب کہ فسٹ اس نئے اُبھرتے ہوئے طبقہ کا ایک رکن تھا جس نے گٹن برگ کے اعلیٰ خاندان کو جلاوطن کیا تھا۔

گمان غالب ہے کہ گٹن برگ نے کچھ اور ٹائپ بھی ضرور تیار کیے ہوں گے کیونکہ ۱۴ اگست ۱۴۵۷ء کو فسٹ اور اس کے نائب شوفر نے لاطینی سالٹر (LATIN PSALTER) بھی تیار کر ڈالی جو یورپ میں پہلی کتاب تھی اور جس پر تاریخ طباعت بھی درج تھی۔ گٹن برگ اس زمانے میں مینز میں تھا۔ اس دوران میں اس کے مشاغل کے بارے میں ہمیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ البتہ خیال یہ ہوتا ہے کہ اس نے کچھ اور کتابیں مثلاً ایک لاطینی لغات اور ایک انسائیکلوپیڈیا بنام کیتھولیکان آف جوہانز بلابوس (CATHOLICON OF JOHANNES BABBUS) بھی مینز میں چھپوائیں جو ۱۴۶۰ء

میں منظرِ عام پر آئیں۔ یہ خیال اگر صحیح ہے اور واقعی اس نے مذکورہ بالا کتابیں چھپوائی تھیں تو یقیناً اسے کوئی رئیس آدمی مل گیا ہوگا جس نے سرمایہ فراہم کر دیا۔ کیونکہ وہ کتابیں نہایت بیش قیمت تھیں۔ بہرکیف گٹن برگ کے مطبع سے شائع ہونے والی کتابیں الفاظ کی درستی اور حسنِ طباعت کے اعتبار سے اپنے زمانے میں بے نظیر تھیں۔

اس کی آخری زندگی کے بارے میں معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ مینز کے آرک بشپ نے اسے جنوری ۱۴۶۵ء میں اپنے عملے کا رکن مقرر کیا تھا اور اس لیے اس کی سماجی حیثیت کافی بلند ہو گئی تھی۔ اس کا انتقال تیسری فروری ۱۴۶۸ء کو اپنے وطن مینز میں ہوا۔

گٹن برگ کے جو کام آج موجود ہیں ان میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس کا نام درج ہو۔ اس کے باوجود اس کا یہ دعویٰ شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ یورپ میں طباعت کا موجد وہی ہے حالانکہ یہ دعویٰ ہنوز متنازعہ ہے کیونکہ ہالینڈ میں بھی حرکت پذیر ٹائپ کی مدد سے طبع کیے ہوئے بعض خام نمونے ملتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ گٹن برگ کے عظیم کام سے زیادہ پرانے ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی کوئی شخص لارنس جانسن کاسٹر نامی گزرا ہے جو لکڑی پر حروف کندہ کیا کرتا تھا۔ آگے چل کر یہی کام اس نے دھات پر شروع کر دیا۔ ہالینڈ کے علاوہ اٹلی میں بھی ایسے ہی ایک

ٹائپ کا سُراغ ملتا ہے۔ پھر بھی گٹن برگ کا امتیاز یہ ہے کہ وہ کسی ایسے طریقۂ کار کو دریافت کرنے کی جدّوجہد میں تھا جس سے اس قسم کے ٹائپ بڑی تعداد میں اور تیزی کے ساتھ تیّار ہو سکیں۔ چنانچہ اس نے اس کام میں اپنی عُمر کے بیس سال صرف کر دیے۔ آخر اس نے ایک ایسا سادہ سانچہ تیّار کر لیا جس کو حرُوف کی مختلف چوڑائیوں کے مُطابق چھوٹا بڑا کیا جا سکتا اور آسانی سے اِستعمال میں لایا جا سکتا تھا۔ گٹن برگ کے اس اقدام کے ساتھ ہی سارے یورپ میں طباعت زور شور سے شرُوع ہو گئی اور پندرھویں صدی کے آخر تک ڈیڑھ دو کروڑ جلدیں چھپ کر تیّار ہو گئیں جن میں بیشتر مذہبی کتابیں تھیں۔ بعد میں دُوسری کتابیں بھی منظرِ عام پر آکر مقبُول ہُوئیں۔

یورپ میں ایجادِ طباعت کی اہمیت کا اندازہ لگانا بہت مُشکل ہے۔ اس نے علم کی اشاعت کو وہ فروغ دیا جو اور کسی ذریعے سے ممکن نہ تھا اور نہ کِسی اور طریقہ سے ذہنِ اِنسانی کے دریچے اس طرح کشادہ ہو سکتے تھے۔ اس اِیجاد ہی کی بدولت اِنسان کو ایسی بہُت سی قوتوں سے نجات حاصِل ہو گئی جن کا مفاد حالات کو جُوں کا توُں برقرار رکھنے میں وابستہ تھا۔ اِسی اِیجاد سے تجارت کی توسیع ہُوئی اور عام ترقّی و خوشحالی کے دروازے کھُل گئے۔ آج بھی جرمنی کے شہر مینز میں آنے والا ان ماڈلوں کو دیکھ سکتا

ہے جن کے متعلق اہلِ فن کا خیال ہے کہ وہ ہُو بہُو گٹن برگ کے آلات کی نقل ہیں اور ان کی طباعت بھی نقل مُطابِق اصل ہے۔ گٹن برگ کی سوسائٹی آج بھی اس کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے سرگرمِ عمل ہے اور دُنیا بھر کے چھاپے خانے اس کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں لہٰذا یہ دعوٰی حق بجانب ہو گا کہ یان گٹن برگ کی ایجاد تاریخِ عالم کی سب سے زیادہ اثر انگیز ایجاد ہے۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)

تلمن ریمین اسکنائڈر

(۱۴۶۰ء ——— ۱۵۳۱ء) سنگتراشی اور مجسمہ سازی کا ماہر

"روتھن برگ اوب ڈر تابر" جرمن کے مشہور علاقہ بویریا کے ان دِل کش شہروں میں ہے جسے جرمنی آنے والا ہر سیّاح یقیناً دیکھنا چاہتا ہے۔ شہر کی قدیم فصیل، جو آج بھی ماضی کی طرح شہر کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ہر نو وارد کے لیے ایک قابلِ دید منظر رکھتی ہے۔ آنے والے کو اگر فنِ سنگتراشی سے کچھ دِل چسپی ہو تو وہ سینٹ جیمس کا کلیسا دیکھنے کے لیے ضرور جائے گا جس کی مقدس قربانگاہ میں حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کے آخری طعامِ شب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ سیّاح بلاشبہہ اُستادِ فن تلمن ریمین اسکنائڈر کے دُوسرے شاہکار کو دیکھنے کے لیے قریبی کریگ لنگن کا رُخ کرے گا جہاں کے گرجا کی قُربان گاہ میں حضرت مریم مادرِ مسیحؑ کو آسمان کی جانب بلند ہوتے دکھایا گیا ہے۔

ریمین اسکنائڈر کی زندگی کا زیادہ حِصّہ دریائے مین کے کنارے شہر "ورزبرگ" میں گزرا تاہم اس کی صحیح تاریخِ پیدائش اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ قیاس غالب ہے کہ وہ ۱۴۶۰ء میں پیدا ہوا تھا اور یہ

بھی مسلّم ہے کہ وہ وسط جرمنی کے کوہستان ہارز کے قصبہ اوسٹیروڈے سے آیا تھا۔ دستاویزوں کی چھان بین سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ۷ دسمبر ۱۴۸۳ء کو ورزبرگ کے شیشہ کاروں، مُصوّروں اور سنگتراشوں کی انجمن میں تلمن ریمین اسکنائڈر نام کے ایک شخص کو رُکن کی حیثیت سے قبول کیا گیا تھا جس نے جلد ہی اپنا راستہ بنا لیا اور ۲۸ فروری ۱۴۸۵ء کو اسے شہریت کے حقوق حاصل ہو گئے جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مُلکی معاملات میں حصّہ لینے کا مجاز ہو گیا تھا۔ ان دنوں اس شہر پر نواب پادری کی حکومت تھی۔ اسی سال کے آغاز میں اس نے شادی بھی کر لی۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۰۱ء میں اس کی کارگاہ میں اس کے بارہ مددگار ملازم تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کاروبار خاصی ترقی پر تھا۔

ریمین اسکنائڈر کئی سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہا جس میں ایک عہدہ شہر کے میئر کا بھی تھا، جس کے لیے وہ ۱۵۲۰ء میں منتخب ہُوا تھا۔ ۱۵۲۵ء میں جب کسانوں نے حکومت کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا تو اس نے جنگ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس موقع پر عام خیال یہی تھا کہ کسانوں کے اختتامِ غلامی اور بہتر زندگی کے مُطالبات جائز ہیں جنھیں پُورا کیا جانا چاہیے۔ ممکن ہے کہ شہریوں کے ان خیالات کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ اس بغاوت کی کامیابی میں انھیں یہ امید نظر آتی تھی کہ وہ نواب پادری کے اقتدار سے نجات

پا جائیں گے اور وفاقیہ جرمنی کے تحت ایک آزاد ریاست کے شہری کی حیثیت سے اپنے معاملات خود انجام دیا کریں گے۔ نواب پادری بھی کسانوں کی بیداری کو اپنے اقتدار اور روایتی نظام کے لیے شدید خطرہ تصوّر کر رہا تھا اور اس نے اسے ختم کر دینے کے لیے طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ریمین اسکینائڈر اس قسم کی کارروائی کے خلاف تھا۔ شہر کے اکثر ممتاز افراد کی بھی یہی رائے تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب نواب پادری اور روایتی نظام کی جیت ہو گئی، تو ریمین اسکینائڈر کو بعض دُوسرے شہریوں کے ساتھ جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے قید میں اذیتیں بھی دی گئیں۔ بہرحال جب اس نے اس بات کا حلف اُٹھا لیا کہ اب وہ نواب پادری کا وفادار رہے گا تو اسے رہا کر دیا گیا جس کے بعد وہ ہمیشہ تنہائی میں مُرجھایا مُرجھایا سا نظر آتا رہا اور اس کی ذات سے کوئی تخلیقی کام سرانجام نہ پا سکا۔ ۱۵۳۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

ریمین اسکینائڈر کے فن پاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں ہونے والی ان تبدیلیوں سے بہت کم متاثر تھا جو فنون و خیالات میں ہمہ گیری کے ساتھ پیدا ہو رہی تھیں۔ اس کے بنائے کتنے ہی مردانے مجسّموں کے چہروں سے یہ احساسِ گناہ اور قرونِ وسطیٰ کا روایتی خوف جھلکتا ہے، جیسے انھیں یہ یقین ہو کہ دوسرے جہان میں جس کی طرف وہ بڑھتے جا رہے تھے، ان سے انتقام لیا

جائے گا۔ اس حقیقت کی روشنی میں، کہ ان دنوں مذہبی عقاید شدّت کے ساتھ متزلزل ہو رہے تھے، یہ بات توجّہ طلب ہے کہ ریمین اسکینائڈر وقوع پذیر تغیّرات سے متاثّر کیوں نہیں ہوا؟ جبکہ کسانوں کی بغاوت کے وقت اس کا رویّہ اس بات کا مظہر تھا کہ اس نے وقت کے سیاسی افکار کو قبول کرنے کے لیے اپنے ذہن کو کھُلا چھوڑ رکھا ہے ـــــ بلاشک وشبہہ وہ گوتھی فن سنگتراشی کا اعلیٰ نمائندہ تھا۔

اس کی تخلیقات خصُوصی طور پر مذہبی نوعیت کی ہیں یا مُردہ پرستی سے تعلّق رکھتی ہیں مگر اسی کے ساتھ اس نے کتنے ہی لاٹ پادریوں اعزاز یافتہ نائٹوں اور دولت مند خواتین کی یادگاریں بنائیں جن میں انتہائی مؤثّر شاہکاروں میں اس سنگِ مزار کی بنّت کاری ہے جو اس نے پادری نواب روڈولف وان شرن برگ کے لیے تیّار کیا تھا۔ اس کام کو مکمّل کرنے میں اس کو ۱۴۹۶ء سے ۱۴۹۹ء تک کی مدّت صرف کرنا پڑی تھی مگر اس کی وجہ سے اس نے جرمنی میں نقّاش کی حیثیت سے شہرت بھی پائی ـــ پھر بھی وہ شاہکار جن پر اس کی شہرت کی بُنیادیں رکھی ہوئی ہیں محولہ بالا تراشیدہ قربان گاہیں ہی ہیں۔ یہ فن پارے حقیقتاً انتہائی پختہ کارانہ تخلیقی دور کے شاہکاروں سے بھی ممتاز ہیں۔ ان میں سب سے اچھّا کام کریگ لنگن میں "ہمارے معبود کے گرجا" کا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ۱۱ میٹر بلند قربان گاہ پر کیا ہُوا کام ۱۵۰۵ء سے ۱۵۱۰ء تک مکمّل مرکزِ توجّہ مادرِ مسیح حضرت مریم

کا مجسّمہ ہے جو آسمان کی جانب مائل پرواز محسوس ہوتا ہے۔ اس کی شبیہیں ہلکے چونے کی لکڑی کی بنی ہوئی ہیں جن کے ہاتھوں کا انداز توضیحی ہے اور لبادوں کی اُبھری ہوئی شکنیں سلسلہ وار فرش تک چلی آئی ہیں۔ ریمین اسکینائڈر کو اپنے مجسّموں کے ہاتھوں میں حسن، اور وضاحتی کیفیات پیدا کرنے اور لباس کے تراش خراش کی بڑی صلاحیت ہے۔ دائیں گوشے کے نشیبی حصّے میں پرتو کے طور پر وہ مجسّمہ نظر آتا ہے جو خود اس کا ہے۔ یہ مجسّمہ گہرے عقیدت مندانہ جذبات کے ساتھ حضرت مریم کو دیکھتا ہُوا پایا گیا ہے جو اپنے شوہر جوزف کے ساتھ عبادت گاہ اپنے فرزند عیسیٰ کو تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔

ریمین اسکینائڈر کے دُوسرے مشہور ترین شہ پارے روتھن برگ کو مقدّس قربان گاہ میں نظر آتے ہیں جہاں حضرت عیسیٰؑ اور ان کے حواریوں کے آخری طعام شب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ وہ اس موقع کی کیفیات کا مرقّع ہے جب حواری مسیحؑ سے دریافت کر رہے تھے کہ ان میں سے کون کون ان کے ساتھ غدّاری کرے گا؟ قربان گاہ کا ایک بازو مسیحؑ کے یروشلم میں داخل ہونے کا ترجمان ہے، دُوسرا بازو مسیحؑ کو کوہِ زیتون پر دکھاتا ہے۔

ریمین اسکینائڈر انتہائی عملی انسان تھا۔ وہ ڈورر کی طرح صرف نظریاتی شخص نہیں تھا۔ پھر بھی اس کا فن کسی حد تک تخیلی رجحانات کو

بھی ظاہر کرتا ہے مگر عموماً یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ان مذہبی موضوعات کے لیے موزوں تھا جنھیں اس نے پیش کیا ہے۔ جو لوگ اس کے فن پاروں کو دیکھتے ہیں، وہ اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہتے کہ آج بھی وہ نگاہوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان خصوصیات کے لحاظ سے ریمین اسکینائڈر جرمن اور یوروپی آرٹ کے ممتاز فن کاروں میں ایک درجہ رکھتا ہے۔

(ڈاکٹر، ولفرام۔ جارج۔ رگرٹ)



البرخ ڈورر

رنگ آمیزی پینٹنگ کا ماہر

البرخ ڈورر

(۱۴۷۱-۱۵۲۸ء) رنگ آمیزی اور پینٹنگ کا ماہر

"چیزوں کی فطری حیثیت ان کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ اِس لیے محنت کش بنو اور اپنی فِطری صلاحیت کا استعمال کرو، حقیقی فن فطری تقاضوں میں ہی مضمر ہوتا ہے۔ جو اِن تقاضوں کو سمجھ لیتا ہے وہ فطرت کو پا جاتا ہے۔"

البرخ ڈورر، جو جرمن مصوّروں میں عموماً سب سے بڑا مصوّر خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک کتابچہ "تناسب" پر لکھا ہے جو اس کے سنہ وفات ۱۵۲۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کتابچہ برسوں کے حاصِل تحقیق پر مشتمل ہے اور اس زندگی کا ثمرہ ہے جو فن کی جستجو میں صرف ہوئی۔

ڈورر کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا جب قرونِ وسطیٰ کی تنگ نگاہی اور مذہبی عصبیت کے بادل منڈلا رہے تھے اور چہار جانب ایک امید و بیم کی کیفیت طاری تھی۔ لوگوں میں علوم و فنون کے حصول کا ایک شوق اور جذبہ ضرور تھا لیکن نہ ان کے پاس اپنے مُشاہدات کو سمجھنے کی دماغی قوّت تھی اور نہ ایسے آلات ہی موجود تھے جن سے وہ اپنی فکر کو آگے بڑھا سکتے۔ مثال میں ڈورر کی وہ تصویر لی جا سکتی

ہے جو (مغموم کے نام سے موسوم ہے۔

—— یاس و دِل شکستگی کے عالم میں ایک عورت بالکل ساکت و صامت بیٹھی ہے جس کے گرد ایسی چیزیں بکھری ہوئی ہیں جو تلاشِ حقیقت میں بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔

ابتدائی دنوں کی بنائی ہوئی ڈیورر کی خود اپنی تصویر بھی نظیر میں لی جا سکتی ہے جس میں حقیقت کی جستجو خود شناسی اور اپنے اندرونی جائزے سے شروع ہوتی ہے —— یہ ایک کمزور سے لڑکے کی تصویر ہے جس کے چہرے پر ہلکی سی زردی چھائی ہوئی ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مشاہدۂ نفس کا عادی ہے۔

یہ تصویر جرمنی میں مرقّع سازی کی بالکل ابتدائی کوشش تھی جس میں اندرونی آدمی کو منعکس کیا گیا تھا۔ اور خد و خال میں متعلق آدمی کی شناخت کو بھی ملحوظ رکھا گیا تھا۔

البرخ ڈیورر ۲۱ مئی ۱۴۷۱ء کو قدیم بویریا کے ایک پرانے اور کاروباری شہر نورمبرگ میں پیدا ہوا جہاں مشہور فن کار، محقق و موجد اور عالم و فاضل رہتے بستے تھے۔ ڈیورر کا باپ سناری کا کام کرتا تھا اور ابتداءً اس نے بھی یہی پیشہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے محسوس کیا کہ اس کا طبعی رجحان کسی اور طرف ہے جس سے اس کے باپ نے بھی اتفاق کر لیا اور اس کو میکل ولجمٹ کی شاگردی میں دے دیا جو اپنے وقت کا مشہور نقّاش اور تصویر ساز تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ولجمٹ نے فی الفور اپنے نئے شاگرد کی غیر معمولی صلاحیتوں کو سمجھ لیا مگر شروع میں اس کو رنگ بھرنے کا کام دینے کی بجائے محنت طلب تربیت کی خاطر معمولی کاموں پر لگا دیا اور ڈورر کو اصل کام حاصل کرنے سے قبل برشوں کی صفائی اور خاکوں کی تیاری کی مشق کرنا پڑی — جب ولجمٹ ہر طرح مطمئن ہو گیا تو اس نے دماغ کو روشن کرنے کے لیے اپنے شاگرد کو سفر کا مشورہ دیا اور ڈورر جنوبی جرمنی کے دورے پر روانہ ہو گیا جہاں وہ کارخانوں کے مالکوں سے ملا، ان کے طریقِ کار کو دیکھا اور اس اثنا میں ہر وقت کچھ نہ کچھ سیکھتا رہا۔ بیسل کے زمانۂ قیام میں وہ پہلی بار اٹلی کے رنگ بھرنے کے طریقے سے متعارف ہوا جو اس زمانے کے جرمن طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا اور جس میں رنگوں کے ذریعے نقل و حرکت دکھائی جاتی تھی — نتیجے میں وہ خود اٹلی پہنچ گیا۔

عظیم اطالوی مصوّر بالخصوص کارپاشیو، مینٹگنا اور گیوونی بلینی سے وہ بہت متاثر ہوا جن کی تصاویر اس نے وینس میں دیکھیں۔ ان تصاویر میں رنگوں کے استعمال میں حدِ کمال تک اختراعات کی گئی تھیں اور ان کے انداز کو بدل بدل کر ایک لطیف امتزاج پیدا کیا گیا تھا جو حقیقت پر مبنی تھا۔ ڈورر خود فطری حقیقت کا متلاشی تھا۔ لہٰذا اسے ان تصاویر کو پسند ہی کرنا چاہیے تھا۔

بلینی کی تصویریں رواں، متحرک اور پوری طرح رنگ برنگی تھیں

اور ان کے مناظر تو آپ اپنی مثال تھے۔ ان تصاویر میں صرف حاشیہ آرائی ہی نہ تھی جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا بلکہ جس سے ہٹ کر اور بہت کچھ تھا۔ اس بات نے ڈورر کی توجہ اپنی جانب مبذول کی کیونکہ وہ پہلے ہی سے اِسی انداز پر کام کر رہا تھا ــــ بلینی نے اس فن میں بڑی ترقّی کی تھی۔ وہ اِنسان کی اندرونی کیفیات کے نقوش کو پس منظر میں اس طرح اُبھارتا کہ وہ فطرت کے بالکل مُطابق معلُوم ہوتے تھے۔ ڈورر نے اس سے بھی کافی تاثّر قبول کیا مگر اِنجامِ کار اس کی جیب خالی ہونا شرُوع ہو گئی اور اس کو واپسی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

وینس کے قیام میں وہ جو کچُھ سیکھ سکتا تھا، قریب قریب اس کا مشاہدہ کر چُکا تھا اور دوبارہ وینس آنے سے قبل اس پر عمل بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال ۱۴۹۵ء میں وہ نورمبرگ میں اپنی بیوی اگینز کے پاس آگیا۔ جس کے ساتھ اس نے پچھلے سال شادی کی تھی۔

وینس کی شان و شوکت کے بعد نورمبرگ یقیناً اسے سُونا سُونا معلوم ہوتا ہوگا بالخصوص ان حالات میں جبکہ کسی بڑے پیمانے پر مصوّری وہاں محدُود تھی اور کسی غیر شہرُت یافتہ مصوّر کو آرڈر ملنا تو ممکن ہی نہ تھا۔ نقّاشی اور لکڑی کا کام شہرُت کا ذریعہ بن سکتے تھے اور ان سے روزی بھی حاصِل کی جاسکتی تھی مگر ابھی اس کا ذہن اور انداز کار اگرچہ غیر متعیّن تھا پھر بھی اس کی تصاویر زمانے کے لحاظ سے مکمّل تھیں اور اس کے شاندار مستقبل کا پیش خیمہ تھیں۔

۱۴۹۸ء میں اس نے (APOCALYPSE) کشف یوحنا کے مطابق لکڑی کی ان نقشی تصاویر کا سلسلہ مکمّل کیا جو نئی انجیل کی رو سے علاماتِ قیامت کے مناظر پیش کرتی ہیں۔

ڈورر کے اس موضوع کے انتخاب کو کوئی اتفاق نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ پندرھویں صدی عیسوی میں شگون و توہم کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ قصبوں کے لوگ عموماً عجیب و غریب بیماریوں میں مُبتلا رہتے۔ قحط آئے دن پڑتا اور اس کو ایک قہرِ الٰہی تصوّر کیا جاتا۔ صاحبانِ کشف قیامت کی پیشین گوئیاں کرتے رہتے اور لوگوں کو اس پر عام اعتقاد بھی بھی تھا۔ ناقابلِ یقین ہے کہ ڈورر کوشش کے باوجود اپنے کو اس ماحول سے بچا سکا ہوگا۔ یقیناً وہ بھی ایسے ہی کچھ نظریات رکھتا تھا، جیسا کہ اس کی بھولی بھالی تصویر "واک" سے ظاہر ہوتا ہے جس کو اس نے ۱۴۹۷ء میں مکمّل کیا۔ اِس تصویر میں ایک جوڑا نہایت دِل کش پس منظر میں چہل قدمی کرتا دکھایا گیا ہے جو بہت ہشاش بشاش نظر آتا ہے اور ہر چیز اس وقت تک بڑی خوشگوار دکھائی دیتی ہے جب تک موت کا مکروہ چہرہ ایک درخت کی آڑ سے سامنے آکر انھیں دہشت زدہ نہیں کر دیتا۔

اپوکلائپس میں ہر بات بھیانک ہے۔ اس میں چار گھوڑ سوار ہیں جن میں ایک شاید حضرت عیسیٰؑ ہیں، باقی تین جنگ، قحط اور موت کے تصوّر ہیں مگر منظر فطرت سے اِتنا قریب ہے گویا گھوڑ سواروں نے

واقعی کبھی اس دُنیا میں نقل و حرکت کی تھی۔ ان کی تصویریں ہوا کے ایک شدید جھونکے سے دھندلا جاتی ہیں جو پیغمبر کی معجز نمائی کا ایک مظاہرہ ہے اور ڈورر کے فنکارانہ قلم کا ایک کرشمہ۔

۱۵۰۰ء میں اس نے خود اپنی ایک تصویر بنائی، ایسی تصویر شاید ہی کبھی بنائی گئی ہوگی —— ایک حساس چہرہ، ہلکا ہلکا رنگین، دونوں ہونٹ خوب صورتی کے ساتھ واضح، خود ڈورر اپنے پیروں پر مخصوص اسٹائل اور فنکارانہ انداز میں اقتصادی طور پر بھی اس کے حالات قدرے بہتر تھے۔ اس نے اپنا ذاتی چھاپہ خانہ قائم کر لیا تھا تاکہ اپنے مربیوں پر بوجھ نہ بنے۔

۱۵۰۵ء میں، جب وہ چھتیس سال کا تھا، اس نے دُوسری بار اِٹلی جانے کا عزم کیا۔ اس بار اسے وینس میں جرمن اقلیت کی سفارت کا موقع مل گیا جو کافی مالدار تھی اور با اثر بھی۔ اب وہ کوئی طالب علم نہ رہا تھا بلکہ ایک فن کار بھی بن چکا تھا۔ مگر ابکی وہ وینس سے اِتنا محظوظ نہ ہو سکا جتنا پچھلی بار ہُوا تھا اور نہ اس مرتبہ اِٹلی کی مصوّری اس کو زیادہ متاثر کر سکی کیونکہ اس کی بیشتر باتوں سے وہ پہلے ہی اِستفادہ کر چکا تھا۔

اس بار بھی وہ ظاہری و باطنی "تناسب کے مطالعے کے لیے پہلے سے مستعد تھا جس کو وہ خوبصورتی کی کلید قرار دیتا تھا۔ بعد کے ڈورر نے اپنی نظریاتی تحریروں میں قلم بند کیا ہے کہ کلیدی راز پانے کے صبر آزما مسلک میں بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ" ایک اچھے مصوّر میں شکل کی

پوری گرفت کرنے کی صلاحیت ہونی چاہیے"۔ اور بلاشبہ ڈورر میں یہ صلاحیت موجود تھی۔ جو اس کی آئل پینٹنگ میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ پھر بھی اس نے ہر موقع پر فطرت کا مطالعہ جاری رکھا اور دیکھتا رہا کہ کہیں وہ اپنی تصویروں اور ان کے رنگوں میں فطرت سے دُور تو نہیں ہو رہا ہے؛ حالانکہ وہ بڑی نازک تصویریں پیش کر رہا تھا جن میں معروف تصاویر (FIELD HARE) (میدانی خرگوش)، (STAG BEETLE) (بے قاعدہ بھونرا) (THE LARGE AND SMALL TUFTS OF GRASS) (گھاس کے چھوٹے بڑے گچھے) ہیں۔ لیکن جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے کہ انسان کا انتہائی تفکّر غم کی تخلیق کرتا ہے اس لیے (MELONCHOLIA) (مغموم) کو اس کے ذاتی تصوّرات کی تصویر کہا جا سکتا ہے۔ اسی زمانے کی اس کی ایک مشہور تصویر ہے (DEATH AND THE NIGHT) (رات اور موت) جو صرف تیقّن پر روشنی ڈالتی ہے۔ جس میں رات خود اس کے نزدیک وحشت ناک موت کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی۔ وہ ایک کاروباری تصویر ہے مگر موت آخر میں خود اس کو پا لیتی ہے۔

۱۵۱۵ء میں شہنشاہ میکسیملین نے ہیمبرگ کے شاہی خاندان کی بانوے ۹۲ اعزازی تصاویر کے اعتراف میں ڈورر کی پنشن مقرّر کی۔ ڈورر نے بھی شہنشاہ کے لیے ایک البم تیار کیا جس کی ساری تصاویر شہنشاہ کی مدح کرتی ہوئی بنائی گئی تھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے خود شہنشاہ کی بھی سینکڑوں تصویریں بنا ڈالیں۔ اس کے بعد ڈورر نے اپنا

زیادہ وقت حضرت عیسیٰؑ کی ماں جناب مریم کی تصویروں پر صرف کیا جو کاغذی بھی تھیں اور لکڑی پر بھی اور جن میں بعض کی رنگ آمیزی مصوّری کا نادر نمونہ تھی۔ اسی زمانے میں اس نے لوتھر کے کیتھولک مسلک کو ترک کر دیا۔

۱۵۲۰ء میں ڈورر نے پچاس سال کی عُمر میں پہنچ کر اپنی زندگی کا آخری سفر کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب چارلس پنجم میکسملین کا جانشین بن چکا تھا۔ ڈورر اس سے یہ کہنے کے لیے نیدر لینڈ گیا تھا کہ اس کو اپنے پیشرو کی منظور کی ہوئی پنشن کو جاری رکھنا چاہیے۔ اس سفر میں اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے یکے بعد دیگرے مین اور رائن دریاؤں میں سفر کیا اور ہر مقام پر عزّت کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چارلس نے اس کی پنشن کی توثیق کر دی اور وہ اپنی آخری اور یادگار تصویر پر کام کرنے کے لیے وطن واپس آ گیا۔ جس میں اس نے چار فرشتے دکھائے تھے اور نیورمبرگ کی شہری کونسل کو پیش کی گئی۔

۱۵۲۸ء میں وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گیا۔ مگر اب تک اپنے کام سے پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے:

"میں جب اپنے کام کا جائزہ لیتا ہوں تو وہ مجھے بہت حقیر نظر آتا ہے کیونکہ میں اپنی کوتاہیوں سے واقف ہوں۔"

(جینٹ روبرٹ)

نکولس کوپرنیکس

ماہر فلکیات
(۱۴۷۳ — ۱۵۴۳ء)

قدیم یونانی سائنس میں تخلیق کائنات کے دو متضاد نظریے پائے جاتے تھے۔ ایک تو یہ کہ سُورج مرکز ہے اور زمین اور دیگر سیّارے اس کے اطراف گردش کرتے ہیں، دُوسرا نظریہ یہ تھا کہ زمین مرکز ہے اور سُورج دُوسرے سیّاروں کے ساتھ خلا میں گردش کر رہا ہے۔ سُورج کے مرکز ہونے کا تصوّر اتنا جاذبِ نظر نہ تھا جتنا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ اس کا ذکر صرف بعض علمی کتابوں تک محدود تھا۔ اور عام طور پر اس نظریے کو تسلیم کیا جاتا کہ زمین کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ نکولس کوپرنیکس نے اس نظریے کی پیچیدگیوں پر غور کرتے ہُوئے کائنات کا وہ نظریہ پیش کیا جس پر آج ہم یقین رکھے ہُوئے ہیں۔

وہ ۱۴۷۳ء میں دریائے وسنولا کے کنارے تھارن نامی قصبے میں پیدا ہُوا جو شمالی جرمنی کے ان علاقوں کا مشرقی حصّہ ہے جہاں جرمن آباد تھے۔ حالانکہ جرمنی اور پولینڈ کے لوگ اب تک اس بات پر متفق نہیں ہو سکے کہ کوپرنیکس کو جرمن کہا جائے یا پول۔ بہر حال متعدد شہادتوں

کی بنا پر اسے جرمن سمجھا جاتا ہے۔
کوپرنیکس کے باپ کا انتقال اس کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا لہٰذا اسے چچا کی کفالت میں دے دیا گیا جو ایرملینڈ کا پادری تھا۔ ۱۴۹۱ء میں میں اٹھارہ سال کی عمر میں کوپرنیکس کو کراکو یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔ ۱۴۹۶ء میں اسے ساحل بالٹک پر فرائنبرگ کی پادریوں کی کونسل کا رُکن بنا دیا گیا جس کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اِٹلی روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں اس مُلک کو مرکزِ علوم کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ وہ بالونا اور پادوا کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور ۱۵۰۳ء میں ۳۲ سال کی عمر میں اس نے "قانون شفا" میں ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ چھتّیس سال کی عمر میں اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر کے اِٹلی سے وطن واپس آ گیا۔ اس وقت تک اسے فرائنبرگ کا کینن بنے ہوئے ۱۳ سال ہو گئے تھے حالانکہ وہ وہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ اب اس کے چچا نے اسے ہاؤس فزیشن بنا دیا اور چند ذمہ داریاں بھی اس پر عاید کر دیں اور ساتھ ہی ساتھ اسے سفارتی عملوں کے ساتھ بھی بھیجتا رہا۔ ایرملینڈ اگرچہ ایک سرحدی علاقہ تھا اور سیاسی افراتفری کا مرکز بنا ہوا تھا پھر بھی اسے ذاتی دلچسپیوں میں حصّہ لینے کا وقت مِل جاتا جس میں عِلم فلکیات کا مطالعہ بھی شامل تھا۔ مگر اس سلسلے میں اس کا زیادہ تر وقت سیاروں کے مشاہدے کے بجائے کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ یہ خیال کوپرنیکس کے بارے میں یقیناً غلط ہو گا کہ وہ کوئی عظیم سائنس داں تھا

جو اپنی دوربین کے ذریعے بنگاہِ غائر سیّاروں کا مشاہدہ کرتا ہو اور جس نے چند برسوں میں علمِ فلکیات میں کوئی بنیادی انقلاب برپا کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اوّل تو اس کے پاس کوئی دُوربین تھی ہی نہیں کیونکہ اس وقت تک دُوربین ایجاد ہی نہیں ہُوئی تھی، دُوسرے اس نے سیّاروں کا بہت کم مشاہدہ کیا تھا جو ضابطۂ تحریر میں لایا جا سکتا۔ تیسرے یہ کہ وہ ایک اصلاحی مہم کے لیے اُٹھا تھا نہ کہ کوئی انقلاب برپا کرنے کے لیے۔

۱۵۱۰ء میں کوپرنیکس نے ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان تھا "سیاروں کی گردش کے بارے میں نکولائی کوپرنکس کے نظریات کا مختصر جائزہ"۔ اس مقالے سے پہلی بار یہ خیال گزرا کہ علم فلکیات کے میدان میں وہ کوئی بڑا اقدام کرے گا۔

یہ مقالہ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ کائنات کی مروّجہ توضیح غیر اطمینان بخش ہے۔ وہ اس شرط کو پُورا نہیں کرتی کہ سیّاروں کو یکساں رفتار کے ساتھ مکمّل دائروں میں گردش کرنا چاہیے لیکن دائروں میں گردش کرنے کے باوجود زمین سے ان کا مُشاہدہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رفتار یکساں نہیں ہے۔ کوپرنیکس نے محسُوس کیا کہ وہ ان نظریوں کو از سرِ نو ترتیب دے کر اس مشکل کا کوئی حل تلاش کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے منصُوبہ بنایا کہ آزمائش یا تجربے کے طور پر چند باتیں فرض کر لی جائیں جن میں ایک مفروضہ یہ تھا کہ زمین کے بجائے سُورج کو کائنات

کا مرکز تصوّر کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اس نے یہ بھی سوچا کہ زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اور سیارے بہت زیادہ فاصلوں پر واقع ہیں۔

اس کے خیال کو مفروضہ ہی سمجھ لیا جائے تب بھی وہ یقیناً ایک بڑا انقلابی اقدام تھا اور اسے اس امید پر پیش کیا گیا تھا کہ شاید اس سے گردش دوراں کی یکسانیت کا مسئلہ ثابت ہو جائے لیکن حقیقتاً اس مسئلے کی حیثیت ایسی تھی جیسے کوئی شخص صحیح معنی میں تلاش کیے بغیر کسی صداقت کا سُراغ لگانا چاہتا ہو۔ یہ نظریات مسوّدے کی صورت میں متعدد ممتاز ہستیوں کو روانہ کیے گئے اور جلد ہی کوپرنیکس کو علمی حلقوں میں ایک مقام حاصل ہو گیا۔

اس نے اپنی عمر کے آخری دور تک کوئی مکمّل تصنیف شائع نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے مذہبی حلقوں کی طرف سے تعزیر کا خوف تھا بلکہ وہ بجا طور پر یہ محسوس کرتا تھا کہ وہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے۔ جن کے مروّجہ اور مسلمہ نظریات تخلیق کو وہ اس طرح معرضِ بحث میں لائے گا —— اور حقیقتاً وہ جس دور سے گزر رہا تھا اس میں تحمّل اور رواداری کی کوئی لازمی قیمت نہ تھی۔

کوپرنیکس کے نظریات کی پہلی مطبوعہ شکل وہ جائزہ تھا جو ریٹکس نامی ایک سائنس دان نے تحریر کیا تھا۔ ۱۵۳۹ء میں اسے یکجا کر کے ۱۵۴۰ء میں ڈینبرگ سے شائع کیا گیا جو دراصل کوپرنیکس کی ایک اہم تصنیف "کتاب گردش سیّارگان" کا ملخص تھا جسے وہ لکھ تو چکا تھا لیکن

اس کی اشاعت کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ جائزہ بڑا حقیقت پسندانہ تھا۔ اس زمانے کے سائنس دانوں اور اہل علم نے جب اس کا مطالعہ کیا تو انھوں نے کوپرنیکس سے درخواست کی کہ وہ اپنی اس اہم تصنیف کی اشاعت پر رضامند ہو جائے۔ آخر کار اس نے رضامندی کا اظہار کر دیا اور ممکن ہے اس نے خود بھی محسوس کیا ہو کہ اس کا جائزہ مختلف حلقوں تک اور اس کے نظریات عوام تک پہنچ چکے ہیں۔ اس لیے اس کی اشاعت سے گریز کرنا مناسب نہیں۔

مئی ۱۵۴۲ء میں اس کی طباعت شروع ہوئی۔ ریٹکس جس نے پہلا جائزہ لکھا تھا، اس بار طباعت کی نگرانی نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ لائپزگ یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر کی حیثیت سے متعین ہو گیا تھا چنانچہ کتاب سیارگاں، آسیاندر نامی ایک شخص کے دیباچے کے ساتھ منظرِ عام پر آئی۔ قاری کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ کوپرنیکس نے خود اسے تحریر کیا ہے اور چونکہ اس کے مفروضات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس نے اپنے نظریات کو خود ہی منسوخ کر دیا ہے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ۲۴ مئی ۱۵۴۳ء کو مرنے سے پہلے کوپرنیکس نے یہ دیباچہ دیکھا تھا یا نہیں؟ اور اگر دیکھا تھا تو اس کے پاس اس کو تبدیل کرنے کا وقت بھی تھا؟

کتاب "گردشِ سیّارگاں" کائنات سے متعلّق اصولوں کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ ان کا انداز بالکل وہی ہے جو کوپرنیکس نے

کئی سال پہلے اپنی اوّلین جائزے میں اختیار کیا تھا۔ سورج سیاراتی نظام کے مرکز میں واقع ہے۔ زہرہ، زمین، مریخ، مشتری اور زحل بالترتیب اس کے گرد گھومتے ہیں۔ چاند زمین کے گرد چکّر لگاتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ زمین اپنے محور پہ بھی گردش کرتی ہے۔ اور ان سب ستاروں کے آگے غیر متحرک ستاروں کا دائرہ ہے۔

یہ بیان اس حد تک تو بے جا نہ تھا لیکن دلائل سے اسے ثابت کرنا اور گردش کو یکسانیت برقرار رکھنا ایک مسئلہ تھا جب کہ سیاروں کی حرکت بیضوی ہے۔ کتاب جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی کوپرنیکس بحث کا بڑا حصّہ خارج کرتا گیا اور بعد میں اسے اس قسم کا بیان دینا پڑا کہ زمین سورج کے گرد نہیں گھومتی بلکہ خلا میں ایک فرضی نقطے کے گرد گردش کرتی ہے اور یہ نقطہ سورج کے قطر کے تقریباً تین گُنے فاصلے پر واقع ہے لیکن یہ تشریح ایک سعی لاحاصل تھی کیونکہ اس سے کائنات کے بارے میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا تاہم یہ نظریہ زمین کے کائنات کا مرکز ہونے کے نظریے سے بہتر اور حقیقت سے قریب تر تھا جس میں بلاشبہ سورج کو دوسرے سیاروں کی گردش پر فوقیت دی گئی تھی۔

کوپرنیکس کی فروگزاشتوں کا جائزہ لیتے وقت یہ حقیقت فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اس نے اپنی بحث میں زمین کو اس جگہ سے ہٹا دیا تھا اور اپنے غلط نظریے کے باوجود متعدد ایسے صحیح تصوّرات سے

کام لیا تھا جو پہلے سے رائج تھے۔ اِس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عِلم کی ترقّی میں لغزشوں سے بھی یقینی طور پر آگے بڑھنے میں مدد مِلتی ہے۔

کوپرنیکس کے اس نظریے کی اہمیت، کہ زمین گردش کرتی ہے، وقت کی تدریجی ترقی کے ساتھ واضح ہوتی گئی۔ اس نے درحقیقت اس روایت کی بنیادوں پر ایک کاری ضرب لگائی تھی کہ قدما کے ہر قول کو سچ ہونا چاہیے۔ کھُلے لفظوں میں نہ سہی مگر اشارے اور کنایے میں اس نے کہہ دیا تھا کہ علم محدود نہیں اور قدیم کائناتی نظریے کی مرکزی حیثیت کو تو اس نے پارہ پارہ ہی کر دیا تھا۔ کلیسا اس کی طرف سے ۱۶۱۶ء میں چوکنا ہُوا اور اس نے اس کی کتاب بیارکان کا مطالعہ دین دار کیتھولک افراد کے لیے ممنوع قرار دے دیا۔ اب کلیسا کو احساس ہو رہا تھا کہ تخلیق کے عمل میں خدا کو جو مقام حاصل تھا، کوپرنیکس نے اس کو گھٹا دیا ہے مگر قدیم تصوّرات کو غلط ثابت کرنے کی جانب پہلا قدم اُٹھایا جا چکا تھا اور مزید تحقیقات کے لیے راستہ ہموار ہو گیا تھا۔

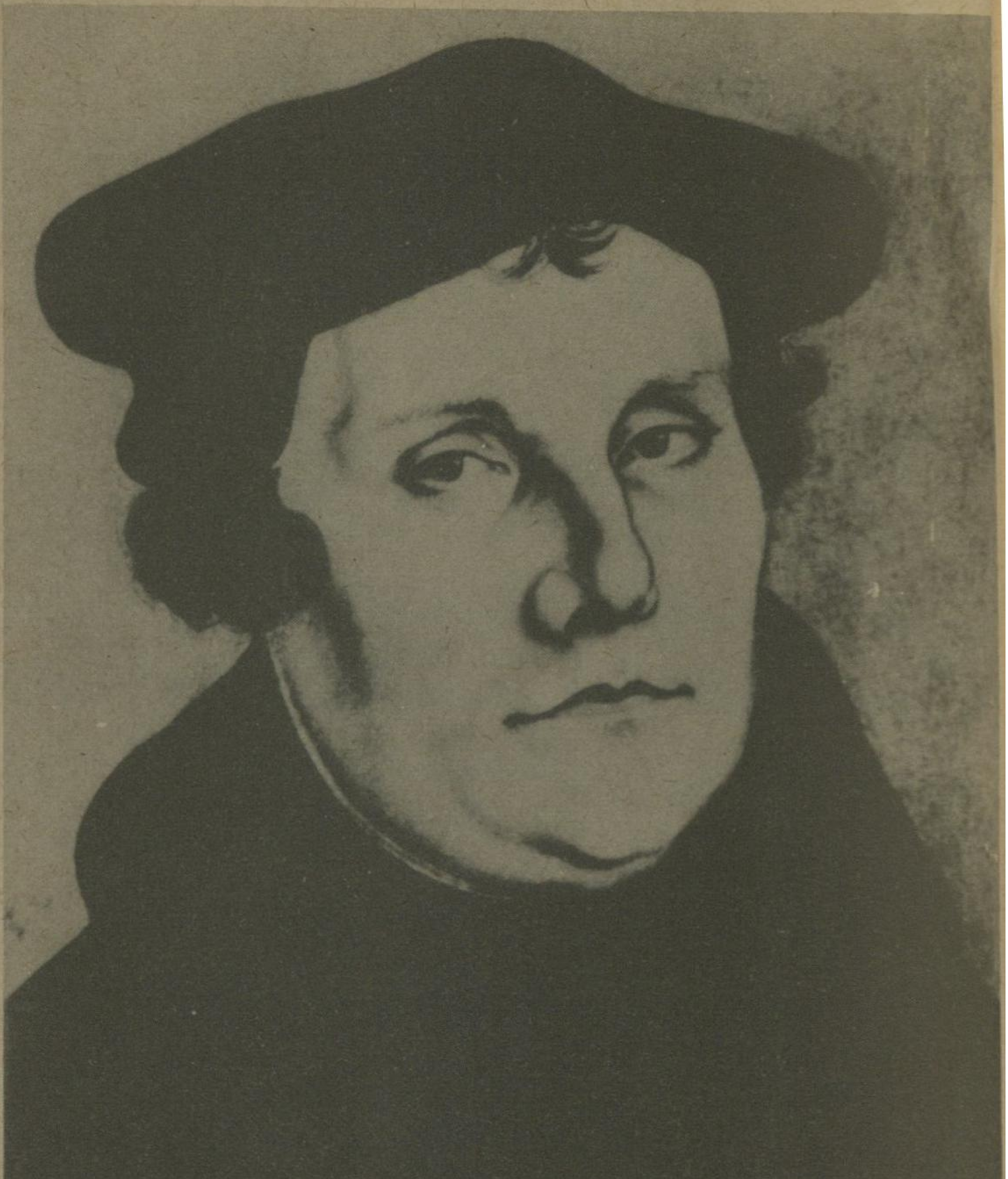
(جریمی لین)

مارٹن لوتھر

اِصلاحِ کلیسا کا علمبردار (۱۴۸۳ء-۱۵۴۶ء)

۳۱ اکتوبر ۱۵۱۷ء بلاشبہہ عیسائیت کی دُنیا کا بڑا اہم دِن تھا۔ اِسی دن نے عیسائی کلیسا کی سالمیت کو ختم کر دیا۔ جب ایک جرمن راہب مارٹن لوتھر نے ایک روایت کے مطابق اپنے پچانوے مقالات کیسل چرچ پر چسپاں کر دیے۔ یہ چرچ وٹن برگ کے چھوٹے سے مرکزی جرمن شہر میں واقع تھا۔ ان مقالات میں کیتھولک چرچ کے اس رواج پر نکتہ چینی کی گئی تھی جس کی رو سے گناہوں کے معافی نامے فروخت کیے جاتے تھے۔ مقالات کے ساتھ ساتھ ایک مذاکرے کی دعوت بھی دی گئی تھی جس میں مذکورہ چرچ کے اصول اور رواج پر بحث کی جا سکتی۔ لوتھر کا خیال تھا کہ چرچ نے اپنے کو اصلی رُوح سے منقطع کر کے ایک حاکمانہ ڈھانچے میں ڈھال لیا ہے جس کا مقصد صرف دُنیوی طاقت حاصل کرنا ہے نہ کہ خدا کے پیغام کی نشر و اشاعت۔

لیکن لوتھر پہلا شخص نہیں تھا جس نے کیتھولک چرچ کے اصُولوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ چرچ کی مادّہ پرستی، حرص و دولت، تحقیق کی مخالفت



مارٹن لوتھر

اصلاحِ کلیسا کا علمبردار

اور اسی طرح کی دُوسری بُرائیاں عالمی پیمانے پر عرصے سے مابہ النزاع تھیں اور ۱۵۱۷ء تک اِصلاح کا ایک اچھّا خاصا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ چھاپے خانوں کی مدد سے علم پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانی اور عبرانی زبانوں کی تعلیم نے لوگوں کو پرانی بائبل کی کتابوں کی طرف متوجّہ کر دیا تھا۔ بائبل میں دِیے ہُوئے مسلمہ امور کے متعلّق لوگوں کی تنقید میں اضافہ ہو رہا تھا اور جذبۂ تحقیق کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی انفرادیت کو شِدّت کے ساتھ محسُوس کرنے لگے تھے۔ خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حوصلہ اُبھر چُکا تھا۔ نئے اقوام کی بُنیادیں رکھی جا رہی تھیں اور چرچ اور سیاست کی رقابت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ درحقیقت معافی ناموں کے خلاف جرمنی میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا کہ لوتھر منظرِ عام پر نمایاں ہُوا۔ فضا ایسی تھی جو اِنقلاب کے لیے سازگار تھی۔ لہٰذا لوتھر کی کوشش اِصلاح ایک انقلابی اقدام کے مترادف بن گئی اور اس اِنقلاب نے یورپ کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا۔

لوتھر ۱۰ نومبر ۱۴۸۳ء کو قصبہ ایسلبین میں پیدا ہُوا جو کوہ ہرز کے مشرق میں ایک چھوٹا سا مقام تھا۔ اس نے ارفرٹ کے کیتھڈرل اسکول اور یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ۱۵۰۵ء میں ایم۔ اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد اپنے والد کی خواہش کے مطابق قانون کا مطالعہ شرُوع کر دیا۔ چند مہینے بعد ہی اس کے ذہن میں

ایک مذہبی کشمکش پیدا ہوگئی اور اس نے راہب بننے کا ارادہ کر لیا۔
۱۷ جولائی ۱۵۰۵ء میں وہ آگسٹین کے حلقے میں شامل ہو گیا اور مذہب کی تعلیم حاصل کر کے ۱۵۰۷ء میں پادری بن گیا۔ اگلے سال اسے مزید تعلیم و نیز لیکچر دینے کے لیے وٹن برگ بھیج دیا گیا جس کے بعد وہ پھر ارفرٹ آگیا۔ ۱۵۰۱ء میں لوتھر اپنی تنظیم کی ایک جماعت لے کر روم پہنچا۔ وہاں پادریوں کی مادّی زندگی دیکھ کر اس پر ایک خوف سا طاری ہو گیا۔ واپسی پر اس نے مذہب کے تعلیمی طریقے پر ڈاکٹری کا کورس مکمّل کیا اور وٹن برگ میں پروفیسر ہو گیا۔ یہ زمانہ لوتھر کے لیے بہت صبر آزما تھا۔ وہ اپنی نجات کے بارے میں شکوک کا شکار ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا بیشتر وقت مذہبی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس مطالعے نے اس پر انکشاف کیا کہ خدا محبّت کرنے والا ہے، اس نے گنہگار انسانوں کو نجات کا تحفہ مُفت عطا کیا ہے، جس کو حاصل کرنے کے لیے صرف خُدا پر عقیدہ ہونا چاہیے اور کچُھ نہیں۔

سینٹ پال کے معتقدین نے اس کو اپنے تصوّرات کی تشکیل میں کافی مدد دی اور اس نے محسُوس کیا کہ وہ چرچ کی ایسی رسوم کی مخالفت کر سکتا ہے جو اس کے نزدیک انجیل کے خلاف ہیں۔
سب سے پہلے اس نے معافی ناموں کی فروخت کے رواج کو چیلنج کیا اور چونکہ اس کی نگاہ میں چرچ بہت سی باتوں میں راہ سے

بے راہ ہو رہا تھا اس لیے کھلم کھلا بغاوت پر اُتر آیا اور اس نے پچانوے مقالات وٹن برگ کے کیسل چرچ کے دروازے پر چسپاں کر کے دُنیائے کلیسا کو للکار دیا۔ ان مقالات کو کافی لوگوں نے پڑھا اور جنھوں نے نہیں پڑھا وہ سُن کر متاثر ہوئے۔ اس مرحلے پر لوتھر یہ چاہتا تھا کہ اس کی اصلاحی کوششیں چرچ کی نئی اصلاحات تک محدود رہیں لیکن پوپ نے ایک دُوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس نے احکام جاری کر دیے کہ لوتھر کو نظر میں رکھا جائے۔ ایک شخص جوہان ٹیٹزل چاہتا تھا کہ معافی نامے فروخت ہوتے رہیں تا کہ روم میں سینٹ پال کا گرجا تعمیر ہو جائے۔ اس نے لوتھر کے خیالات کا مذاق اُڑاتے ہُوئے اس کے مقالات کا جواب دیا۔ لوتھر نے اسی انداز میں جواب الجواب دیا۔ اور ان کا باہمی تنازعہ منظرِ عام پر آ گیا۔ اس مقام پر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ٹیٹزل نے لوتھر کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

۱۵۱۸ء میں آگزبرگ کے مقام پر، جہاں ریشتاگ کا اجلاس ہو رہا تھا، یہ کوششیں کی گئیں کہ لوتھر توبہ کر لے مگر اس نے ایسی بات ماننے سے اِنکار کر دیا۔ پھر اسے بھاگ جانا پڑا۔ کیونکہ وہ لوگ اس کے مخالف ہو گئے تھے اور اسے مشرک سمجھتے تھے۔ اگلے سال اس نے لیپزگ کے مباحثے میں شرکت کی جہاں کیتھولک چرچ کے ایک بڑے رہنما جوہان اِک سے اس کی بحث ہو گئی۔ اس موقع پر

اسے مجبوراً یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اس کے بعض نظریات چرچ کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ جوہان اک اس کے بعد روم روانہ ہوگیا تاکہ وہ پوپ سے کوئی ایسا فتویٰ لا سکے جس کی رو سے لوتھر کو دھمکی دی جائے کہ وہ اگر اب بھی تائب نہ ہوا تو اسے چرچ سے خارج کر دیا جائے گا۔ یہ فتویٰ ۱۵۲۰ء میں ۱۵ ؍جون کو جاری کیا گیا اور لوتھر کو غور و خوض کے لیے ساٹھ دن کی مہلت دی گئی مگر قبل اس کے کہ لوتھر کو پوپ کا پیغام موصول ہو اس نے اپنی تنقید کی بنیاد کو وسیع تر کر لیا اور اپنے اقوال کے معانی و مطالب پر کافی غور کر لیا۔ اب اس نے "جرمن قوم کے امراء سے خطاب میں" جرمنوں کے قومی جذبے کو ہوا دیتے ہوئے کہا کہ انھیں پوپ کی مادّی طاقت کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں جرمنی میں بعض اِصلاحات نافذ کرنے کا مطالبہ کیا۔ کچھ دنوں کے وقفے سے ایک دوسری کتاب چھاپی، جس کا نام "کلیسا کی بابلی قید" تھا۔ اس میں لوتھر نے پوری طرح پوپ اور چرچ کی تعلیمات کی مخالفت کی اور اس بات سے اِنکار کیا کہ پادریوں کو خدا اور بندے کے درمیان دخل اندازی کا کوئی اختیار ہے۔ اس نے کہا کہ رسوم، مذہب کی اعانت سے زیادہ کوئی درجہ نہیں رکھتیں۔ ۱۰ ؍اکتوبر ۱۵۲۰ء کو اسے پوپ کا متذکرہ فتویٰ موصول ہوا۔ اگلے مہینے اس نے پوپ اور اس کے فتوے پر تنقید لکھی اور ایک رسالہ "ایک عیسائی کی آزادی" پر شائع کیا جس میں اس نے مذہب

کے ذریعے نجات کے عقیدے کے بجائے اچھے کاموں کے نظریے
کا اعادہ کیا اور تجویز پیش کی کہ مستقبل کے عیسائی کو مذہب کے معاملے
میں آزادئ ضمیر حاصل ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اسی سال ۱۰ دسمبر کو
لوتھر نے پوپ کے تمام نظریات کی تردید کے لیے ایک ڈرامائی طریقہ
اختیار کیا اور پوپ کے فتوے اور چرچ کے قانون کو نذرِ آتش کر دیا۔
اگلے سال یہ فیصلہ کیا گیا کہ لوتھر کو ایک آخری موقع دیا جائے پھر
اسے ورمس کے مقام پر مقدس رومن شہنشاہ چارلس پنجم کی موجودگی میں
ریشٹاگ کے اجلاس میں آنے کی دعوت دی گئی مگر جب وہ حفاظت
کے پورے وعدے پر ۱۷ اپریل ۱۵۲۱ء کو ورمس پہنچا تو اس کی کتابیں
ممنوع قرار دی جا چکی تھیں۔ اس سے دریافت کیا گیا کہ آیا وہ اپنی
تعلیمات سے دستبردار ہونے کو تیار ہے؛ لوتھر نے اس معاملے میں
قدرے غور و خوض کے بعد انکار میں جواب دے دیا۔ ایک روایت
یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی صفائی کی تقریر کو ان الفاظ پر ختم کیا تھا:
"میں اس مقام پر کھڑا ہوں جہاں میں کسی امر پر قادر نہیں۔ خدا میری
مدد کرے۔" کافی بحث مباحثے کے بعد شہنشاہ نے محسوس کیا کہ اس
کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ آخر لوتھر ورمس سے روانہ ہو گیا اور بحفاظت
وارٹ برگ پہنچ گیا تو اس کو قانون کی حفاظت سے محروم کر دیا گیا۔
وارٹ برگ تھرنجیا کا ایک قلعہ ہے جو الیکٹر آف سیکنی کے زیر فرمان تھا
اس مقام پر لوتھر اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تخلیقی دور میں داخل

ہُوا۔اس نے بائبل کے نئے ٹسٹامنٹ کا جرمن زبان میں ترجمہ شروع کر دیا۔ لوتھر چاہتا تھا کہ وہ اس پیغام کی رُوح کو عوام تک پہنچا دے. تاکہ گنہگار انسان خدا کے ساتھ براہِ راست تعلّق پیدا کر سکیں، انھیں اپنی لازمی نجات کا یقین ہو سکے اور وہ تعلیماتِ انجیل کی صحیح پیروی کر سکیں۔

یہ ترجمہ ۱۵۲۲ء میں پیش کیا گیا جس کا فوری طور پر اثر ہُوا۔ لوتھر کی زبان میں اِختصار تھا اور مطلب واضح اور سیدھا سادہ تھا، تاہم خیالات کی عظمت پر پُوری پُوری روشنی ڈالی گئی تھی۔ جرمن زبان کی تحریر کو جیسا ہونا چاہیے۔ یہ ترجمہ اس کا ایک نمونہ تھا جس کا جرمن کی ہیئت پر کافی گہرا اثر پڑا۔ ۱۵۳۴ء میں پوری انجیل منظرِ عام پر آگئی۔ مارچ ۱۵۲۲ء میں لوتھر وٹن برگ واپس آگیا حالانکہ یہاں اس کے لیے خطرہ تھا لیکن عملاً کچھ نہ ہُوا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مقدّس رومن شہنشاہ اور پوپ کا اثر بہت محدُود ہو گیا تھا۔ اب جرمنی کے بعض شہزادوں اور دوسرے حُکمرانوں نے محسُوس کیا کہ ان کے لیے طاقت بڑھانے کا اچھّا موقع ہے اور کسانوں کو بھی یہ یقین ہو گیا کہ انھیں اپنے مطالبات منوانے کے لیے اس سے بہتر حالات نہ مل سکیں گے۔

۱۵۲۲ء میں جرمنی کے جنوب میں کسانوں کی ایک بغاوت ہو گئی جو اقتصادی مسائل کے تابع تھی اور مذہبی کشمکش کے نتیجے میں رونما

ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں جرمن کے مغرب اور جنوب میں بھی لڑائی شروع ہوگئی۔ غیر مطمئن امراء اس جھگڑے میں شامل ہو گئے۔ اور کسانوں کے بارہ نکات جاری کر دیے گئے۔ جن میں اپنے روحانی پیشواؤں کے اِنتخاب کا حق، چھوٹی موٹی ادائیگیوں اور محصولات سے معافی، غلامی کے خاتمے اور عدالتوں میں اِنصاف کے مُطالبے شامل تھے۔

مارٹن لوتھر نے کسانوں کو بغاوت کے خلاف نہایت سخت الفاظ میں ایک مختصر سا رسالہ لکھا جس کا نام تھا "غارتگر اور قاتل کسانوں کے جتھے کے خلاف۔" اس کی نظر میں صرف بعض معمولی تبدیلیوں اور اِصلاحوں کی ضرورت تھی اور وہ بھی اپنی حدود کے اندر اندر۔ نتیجے میں اس کے عدمِ تعاون کے باعث کسانوں کی جدّوجہد آگے نہ بڑھ سکی اور اسے دبا دیا گیا۔

اسی سال ۱۵۲۵ء میں اس نے ایک سابق راہبہ کیتھرینا فان بورا سے شادی کر لی جس کے بطن سے چھ بچّے پیدا ہوئے۔ پروٹسٹنٹ تحریک میں لوتھر دُوسرے لوگوں کے خیالات کا اِتنا ہی مخالف تھا جتنا پوپ خود اس کے نظریات کا۔ رفتہ رفتہ اس کی تحریک میں اِنتشار پیدا ہونے لگا اور وہ وقت بھی آگیا جب لوتھر کسی حد تک بالکل تنہا رہ گیا۔ آگزبرگ کا عظیم اقرار نامہ، وہ دستاویز جس میں لوتھر کے عقیدے کے اصُول پیش کیے گئے تھے، اس کی عدم موجودگی

میں مگر اس کی مرضی سے جاری ہوا۔

لوتھر چرچ کا انتظام اب تک زیادہ تر شہزادوں کے ہاتھ میں تھا جو مذہبی معاملات کو اپنی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ۱۵۳۲ء میں کیتھولک فرقے نے بعض مصلحتوں کی بنا پر نورمبرگ کے مقام پر اس کے ساتھ مصالحت کر لی، جس سے لوتھر کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔ لوتھر اب بھی وٹن برگ کی یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا اور اس کا لکھنے کا کام بھی جاری تھا۔ لیکن اب حالات کا دھارا دُوسرے لوگوں نے موڑ دیا۔ لوتھر کا بائیبل کا ترجمہ اور دعائیہ نغمے مثلاً "ایک مضبوط قلعہ ہے ہمارا خدا" اب بھی لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور پوپ سے مصالحت کے مسئلے پر اس کی مخالفت میں اب بھی کوئی کمی پیدا نہ ہوئی تھی۔ آخر اس نے باسٹھ سال کی عمر میں اپنی موت سے کچھ کم ایک سال پہلے ایک مختصر رسالہ لکھا جو روم کی پاپائیت کے خلاف، شیطان کے ہاتھ کی بنیاد" کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۸ر فروری ۱۵۴۶ء کو ایسلبین میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(ڈاکٹر وُلفرام جارج رِگرٹ)



یانیس کیپلر
نظام شمسی اور علم الافلاک کا ماہر

یاہنس کیپلر

(۱۵۷۱ء-۱۶۳۰ء) نظامِ شمسی اور علم الافلاک کا ماہر

یاہنس کیپلر جب دُنیا میں پیدا ہُوا تو چہار جانب ایک عام بے چینی پھیلی ہُوئی تھی۔ نئے خیالات کی اشاعت اور پُرانے توہمات سے کنارہ کشی کیے جانے کے ساتھ ساتھ آئے دن نئی نئی تحقیقاتیں ہو رہی تھیں اور کیپلر کی قسمت میں خود بھی علمِ ہیئت کے میدان میں کوئی ٹھوس قدم اُٹھانا لکھا تھا۔

کیپلر ۱۵۷۱ء میں جنوبی جرمنی کے قصبہ ویل میں پیدا ہُوا اور شروع ہی سے لوگوں کو اپنی ذہانت سے متاثر کرنے لگا۔ بیس برس کی عمر میں اس نے ٹوبنجن یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹ سے سند حاصل کی اور دینی مطالعہ شروع کر دیا مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ریاضی اور علمِ ہیئت میں بھی دلچسپی لیتا رہا۔ اس کی پہلی کاوش موسومہ "رموزِ کائنات" پچیس سال کی عمر میں منظرِ عام پر آئی۔ وہ کوپرنیکس کے اِس نظریے سے متفق تھا کہ سُورج کائنات کا مرکز ہے کیونکہ وہ روشنی دیتا ہے جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے لیکن رموزِ کائنات کا یہ موضوع اِس کے لیے کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا۔ وہ تو اسی سوال کے

حل کرنے میں کوشاں تھا کہ فضائے بسیط میں صرف چھ سیّارے ہی کیوں ہیں؟ اس سلسلے میں اس نے ایک بالکل غیر سائنسی طریقہ کار اختیار کیا جس سے خیال ہوتا تھا کہ اس کی کاوش غلطیوں اور ناالہیوں کا مجموعہ ہوگی۔ بہرحال اس سلسلے میں اس نے اپنی کتاب میں ایک سوال کیا جس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا تھا، وہ یہ کہ کیا سُورج سے سیّاروں تک کے فاصلے اور سیّاروں کے سُورج کے گرد گردش کرنے کے وقت میں کوئی حسابی تعلّق ہے؟ سیّارے جو وقت اپنی گردش میں لیتے ہیں، وہ صحیح طور پر معلُوم تھا۔ عطارد جو سُورج سے نزدیک تر ہے۔ اس کا چکر اندازاً تین ماہ میں پورا ہوتا ہے، زحل جو زیادہ فاصلے پر ہے تیس سال لیتا ہے۔ سیّارہ جتنی دُور ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ وقت لیتا ہے۔ اس کی صحیح تشریح کیپلر نے یہ کی کہ سُورج اپنی طاقت سے سیّاروں کو گردش میں لاتا ہے اور یہ طاقت دوری کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ اِس لیے دُور ہونے پر وہ بہت آہستگی کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔ یہ جواب غلط ہے لیکن اسی قسم کے سوال کے پس پردہ جو ذہنی رجحان ہے وہ یقیناً انقلاب آفریں ہے۔ کیپلر نے سیّاروں کی حرکات کو ایک نظامِ فطرت کے تابع قرار دینے کی کوشش کی ہے جس کو حرکت دینے والی سُورج کی طاقت ہے۔

اس کی کتاب "رموزِ کائنات" نے ڈینش نجُومی ٹائکو براہے کو

اس حد تک متاثر کیا کہ وہ کیپلر کو اپنا مددگار بنانے پر مجبور ہو گیا۔ براہے بذاتِ خود آسمانوں کا مشاہدہ کرنے والا تھا جبکہ کیپلر ایک ذہین ریاضی داں۔ لہٰذا دونوں کے لیے اپنی اپنی ذہانتوں سے ایک دُوسرے کو مستفیض کرنے کا موقع تھا۔

۱۶۰۰ء میں پراگ میں پہلی بار ان کی ملاقات ہُوئی۔ براہے کی عُمر اس وقت ترپن سال تھی اور کیپلر تیئس سال کا۔ دونوں میں ایک دُوسرے کے لیے بہت کم دلچسپی تھی۔ پھر بھی اُنھوں نے باہمی اِشتراک قائم رکھا اس لیے کہ انھیں ایک دوسرے کی ضرُورت تھی۔ آخر کیپلر کو مریخ کے مدار کا نقشہ بنانے کا کام سپرد ہُوا۔ نظامِ شمسی میں مریخ کی گردش انتہائی بے ترتیب ہے اس لیے اس کام کی تکمیل میں اس کو آٹھ سال لگ گئے۔ اس دوران میں اس نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جس پر اس کی معرکہ آرا تصنیف جدید علمِ ہیئت کی بُنیادیں رکھی ہُوئی ہیں۔ یہ کتاب ۱۶۰۹ء میں شائع ہُوئی۔ اس میں کیپلر نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ نتائج کی اساس، ٹائکو براہے کے مشاہدات پر رکھی گئی ہے۔

جدید علمِ ہیئت میں ستاروں کی گردش کے تین اصُولوں میں سے دو اصُول کیپلر کے نام سے منسُوب ہیں۔ اوّلاً اس کا کہنا تھا کہ سیّارے گول دائروں میں نہیں بلکہ بیضوی شکل میں گردش کرتے ہیں اور اُن کی رفتار یکساں نہیں ہوتی، دُوسرے یہ کہ اگر کوئی خط سیّارے کے

مرکز سے سورج کے مرکز تک کھنچا جائے تو وہ مساوی رقبہ اور مساوی وقت لے گا۔ یہ بہت بڑی کامیابیاں تھیں جن کے حاصل کرنے کے لیے صحیح اور غلط راستوں پر غیر معمولی اقدامات کیے گئے۔ کیپلر نے اس کا اظہار جدید علمِ ہیئت میں کیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کیپلر نے جو کچھ بھی سوچا اسی کے مطابق مریخ کے مدار کا نقشہ تیار کیا اور اسی کی بنیاد پر نتائج اخذ کیے۔ تجربے کے لیے بعد میں دوسرے خیالات کا بھی جائزہ لیا لیکن ان میں سے کوئی بھی موزوں ثابت نہیں ہوا۔ خامیاں اگرچہ معمولی تھیں۔ لیکن بہرصورت موجود تھیں جنھیں کیپلر نے نظر انداز نہیں کیا اور اپنے حسابی تخمینوں کو ترک کر کے از سر نو کام شروع کر دیا۔

اس نے اپنی کتاب میں اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ وہ صرف اپنے عزم سے اور اپنے طور پر آگے بڑھنا چاہتا ہے اور نقائص کو صرف اس بنا پر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ ایسا کرنے سے ایک ناخوشگواری پیدا ہوگی اور نظریات الٹ جائیں گے۔

یہ انداز خیالات میں ایک تازہ انقلاب پیدا کر دیتا ہے اور حقائق آسان پسندی پر قربان نہیں کیے جا سکتے پھر بھی کیپلر مکمل طور پر انقلابی نہیں تھا بلکہ دراصل وہ اپنے دور کا ایک طفلِ مکتب تھا۔ اس کو یقین تھا کہ کائنات میں بے ترتیبی نہیں ہے بلکہ ایک ہم آہنگی اور حسنِ ترتیب ہے جس کو وہ تلاش کرے گا۔ اس کا پہلا کام یہ ہے کہ

اس نے قدیم حُسنِ ترتیب کی بُنیادی اساس کو، جو متناسب رفتار اور دائرہ میں تھی، برباد کر دیا۔ دُوسرا سب سے زیادہ کام کائناتی حُسنِ ترتیب میں انھیں چیزوں کی اصلاح کی کوشش ہے۔ اس کے متعلّق اس کی کتاب ۱۶۱۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کیپلر نے کائنات میں نغموں کی ہم آہنگی کو ایک طرح سے تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں سیّارے اپنے مدار پر گردش کرتے ہوئے نغمے بکھیرتے ہیں۔ یہ نغمہ سرائی خالقِ کائنات کی حمد و ثناء میں ہوتی ہے۔ الفاظ کی اس بھرمار میں کیپلر کا تیسرا قانون گردشِ سیّارگاں چھُپا ہُوا ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ سُورج کے گِرد گردش کرنے میں مرّیخ کو جو وقت مِلتا ہے اس کا مربع سُورج کے گِرد گردش مثلّث کے مساوی ہے۔ رُموزِ کائنات میں پہلی بار اس مسئلہ کو حل کرنے کے بعد وہ سیّاروں کے گِرد گردش کرنے کے وقت اور ان کا سُورج کے فاصلوں سے تعلّق معلُوم کرنے کی جستجو کرتا ہے کہ سورج تمام چیزوں پر حکمران ہے مگر اس کو وہ باضابطہ طور پر ثابت نہ کر سکا۔ اس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ دیگر قوانین سیارگان صرف امکانات پر مبنی ہیں۔ جن کو قطعی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ پھر بھی کیپلر ہی پہلا شخص تھا جس نے اس کے صحیح جواب پر غور کیا۔ کیونکہ اسی نے پہلے پہل کائنات کی مادّی اساس کو تسلیم کیا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کو کششِ ثقل کا کوئی علم نہ تھا۔ اس کی دریافت

کا سہرا تو برطانوی سائنس دان نیوٹن کے سر بندھتا ہے۔

"کائناتی حسنِ ترتیب" اس کی آخری بڑی تصنیف تھی جس کی اشاعت کے وقت کیپلر کی عمر اڑتالیس سال تھی۔ "خلاصۂ علمِ ہئیت از کوپرنیکس" میں اس نے اپنے خیالات کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اس نظامِ شمسی کو بھی ترتیب دیا ہے جو لازمی طور پر آج بھی نصابی کتب میں موجود ہے۔ ۱۶۳۰ء میں اس کا انتقال ہُوا۔

(جریمی لین)

یان سبیشین باخ

کلیسائی موسیقی کا ماہر (۱۶۸۵ء-۱۷۵۰ء)

موسیقی کی تاریخ میں باخ کا خاندان مقبول ترین خاندانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ سولھویں صدی کے آغاز میں لوتھر کے زمانے سے انیسویں صدی کے نصف بسمارک کے زمانے تک یعنی تین سو برس تک اس خاندان کے افراد گانے نظم کر کے گاتے رہے جن میں عظیم ترین فرد یان سبیشین تھا جو ۱۶۸۵ء میں تھرنجیا کے مقام ایزنخ میں پیدا ہوا۔ تھرنجیا صوبہ جرمنی میں واقع تھا اور اسی مقام سے یہ خاندان متعلّق تھا۔

وہ بڑی چھوٹی عمر میں یتیم ہو گیا تھا پھر بھی اس کی صلاحیت اسکول ہی کے زمانے سے ظاہر ہونے لگی اور وہ جلد ہی غیر معمولی خوش الحانی کے سلسلے میں مشہور ہو گیا۔

۱۷۰۰ء میں اُسے ہیمبرگ کے جنوب میں پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر لینبرگ کے گرجا گھر کو جانے والی جماعت میں شامل کر لیا گیا۔ ہیمبرگ میں اس وقت ایک بہت مشہور سازندہ تھا جس کا نام یان رائنکن تھا۔ باخ کو بڑی تمنّا تھی کہ وہ اس کو گاتے ہوئے سُننے

لیکن اس کے پاس گاڑی پر جانے کے لیے پیسہ نہ تھا لہٰذا وہ پیدل ہی روانہ ہو گیا اور کئی بار اسی طرح سفر کر کے اس نے یان رائنکن کا گانا سنا۔

اب باخ ساز بجانے میں ماہر ہوتا جا رہا تھا چنانچہ تھرنجیا میں جب آرنسٹڈٹ کے گرجا گھر میں ایک نیا ساز بنایا گیا تو اسے وہاں پہنچنے اور ساز بجانے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ ڈیمر کے درباری آرکسٹرا کے ساتھ وائلن بجانے پر مامور تھا لیکن جب اسے آرنسٹڈٹ میں ایک نئی آسامی کی پیشکش کی گئی تو اس نے اسے قبول کر لیا۔ یہاں کام بھی زیادہ نہ تھا تنخواہ بھی غنیمت تھی اور وہ گانوں کی ترتیب کے لیے بھی وقت نکال سکتا تھا۔

باخ نے ایک بہت مشہور سفر جو پیدل کیا اس کا مقصد لوبیک جانا اور مشہور سازندے بخنہیود کو سننا تھا۔ اس کے لیے اس نے ایک ماہ کی رخصت لی۔ گمان غالب ہے کہ اس نے بخنہیود سے درس حاصل کیا ہو گا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بخنہیود کا جانشین بن جائے مگر بدقسمتی سے بخنہیود کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی تھی۔ باپ کے نزدیک جانشینی کے مسئلے کو اس کی ازدواجی زندگی کی خوشیوں سے گہرا تعلق تھا لیکن باخ اس پیش کش کو قبول کرنے کے لیے مجبور نہ تھا کیونکہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑی تھی۔ یہ ۱۷۰۵ء کے آخر کا واقعہ ہے جب کہ باخ کی عمر صرف بیس سال تھی۔

باخ کو اس ملاقات سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہ لوبیک کی اعلیٰ موسیقارانہ زندگی اور اس کی صدابندی سے بہت متاثر ہوا اور

آرنسٹٹ آکر اس نے اسی قسم کی موسیقی کو رواج دینے کی کوشش شروع کردی جس سے اس کے افسران کچھ خوش نہیں ہوئے۔ ان کی ناراضگی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ اتنے دنوں غائب رہا تھا۔ بہرحال انھوں نے اس پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ گرجا گھر کے دعائیہ گانوں میں عجیب عجیب بدعتیں کر رہا ہے اور اس نے گرجے میں آنے والوں کے ذہن میں ایک اُلجھن پیدا کر دی ہے جو اس کے عادی نہیں ہیں مگر اس کا نتیجہ اتنا ہی نکلا کہ اسے تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔

پھر بھی باخ اپنی زندگی میں ایک تبدیلی کی ضرورت محسوس کیے بغیر نہ رہا۔ اسی زمانے میں کو تھرنجیا کے قریب ملہاسن میں ایک عہدے کی پیشکش ہوئی جو بادی النظر میں ایسی جگہ تھی جس کا وہ خواہاں تھا۔ لیکن تنخواہ یہاں بھی وہی رہی جو آرنسٹٹ میں تھی۔ تقرری کے تین ماہ بعد باخ نے اپنی رشتے کی بہن میریا باربرا باخ سے ۱۷ اکتوبر ۱۷۰۷ء کو شادی کر لی جس سے سات بچے ہوئے۔

ملہاسن کے حالات بھی کچھ اچھے نہیں تھے۔ قصبے میں ایک مستقل مذہبی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ بعض لوگ گرجا گھر میں گانے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ باخ ایک سازندے کی حیثیت سے کچھ خوش نہیں ہوا کیونکہ موسیقی اور عبادت خود اس کی نظر میں ایک ہی چیز کے دو حصے تھے۔ ان دنوں وہ سخت مالی پریشانیوں سے بھی دوچار

تھا۔ آخر جون ۱۷۰۸ء میں اس نے منتظمین کو مطلع کر دیا کہ اسے دوسری جگہ مل گئی ہے جہاں وہ بہتر زندگی بسر کر سکے گا۔ اس نے بتایا کہ میرا گھر بڑی سادگی سے چل رہا ہے پھر بھی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے۔

بہر حال وہ درباری سازندے اور نجی موسیقار کی حیثیت سے ویمر چلا گیا اور ۱۷۱۷ء تک وہاں قیام کیا۔ اِس عرصے میں اس نے ساز کی تیکنیک کو مکمل کر کے اپنے کمالات کی داد حاصل کی۔ اس کے ایک مداح کا کہنا تھا کہ اس کے پاؤں کے پیڈل کے تختے پر اس طرح پڑتے تھے جیسے ان میں پر لگے ہوئے ہوں۔ ویمر کی ملازمت کے آخری دور میں ایک واقعے سے اس کی شہرت میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۷۱۷ء میں فرانسیسی بادشاہ لوئی پانزدہم کا سازندہ "ین لوئی مرچنڈ" ڈریسڈ" آیا۔ باخ اس کا بہت مداح تھا۔ وہ اس کو سُننے کے لیے پہنچ گیا۔ اتفاق سے کسی نے تجویز پیش کر دی کہ ساز بجانے میں دونوں کا مقابلہ ہو جائے۔ باخ راضی ہو گیا اور اس نے یہ شرط بھی مان لی کہ مرچنڈ جو جو ساز پیش کرے گا اس کو وہ بغیر کسی تیاری کے صرف دیکھ کر بجائے گا اور مرچنڈ کو بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ اس کا اعلان کر دیا گیا اور باخ مقررہ وقت پر پہنچ گیا لیکن مرچنڈ نہ آیا۔ اس کامیابی نے باخ کی شہرت کو چار چاند لگا دیے۔

پچھلے سال سے اس کو اپنے عہدے کی ترقی نہیں ملی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ لہٰذا اس نے کوئی نئی جگہ حاصل کرنے کی اجازت مانگی جو اس

کو نہ مل سکی بلکہ مُطلق العنان حاکم ڈیوک ولہیم آگسٹ نے اس کو گرفتار بھی کر لیا۔ آخر کار بڑی مشکل سے اسے انلہٹ کوتھن کے شہزادے لیوپولڈ کے خاندان کے پاس کوتھن جانے کی اجازت مل گئی۔ شہزادے سے اس کے تعلّقات بہُت اچھّے رہے کیونکہ وہ انتہائی مہذّب انسان تھا اور اس کو موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا۔

کوتھن میں باخ درباری آرکسٹرا کی رہنمائی پر متعیّن تھا۔ یہاں وہ کمرۂ خواب کے لیے موسیقی ترتیب دیتا اور شہزادہ خود ساز بجاتا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب غیر مذہبی موسیقی کی ابتدا ہو رہی تھی اور باخ نئی نئی طرزیں ایجاد کر رہا تھا۔ حالات اچھّے خاصے تھے کہ ۱۷۲۰ء میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا اور جب سفر سے واپس آیا تو میریا دفن کی جا چکی تھی۔

اس کے بعد شہزادہ لیوپولڈ نے ایک جوان عورت سے شادی کی جو عیش و طرب کی بہُت دِلدادہ تھی لیکن موسیقی سے جو مسرّت حاصل ہوتی ہے اس کے دِل میں بہُت کم گنجائش تھی۔ شہزادہ بھی اب قدرے عدیم الفرصت ہو گیا تھا لہٰذا باخ نے محسُوس کیا کہ اسے چلا جانا چاہیے لیکن کہاں؟ ملازمتیں اِتنی آسانی سے تو نہ مل سکتی تھیں، ان کے لیے بھی تو ایک جگہ سے دُوسری جگہ جانے کی ضرورت تھی — باخ نے حال ہی میں انا میگڈالینا والکن کے ساتھ دُوسری شادی کی تھی جس کی عُمر بیس سال تھی۔ وہ ارادے کی پکّی اور سمجھدار تھی۔ باخ کے لیے اب سب سے بڑا مسئلہ ایک بڑے خاندان کی نگہداشت تھی۔

جس میں سب سے بڑا بچہ بارہ سال کا تھا۔

۱۷۲۲ء میں لیپزگ کے ٹامس اسکول میں نغمۂ موسیقی کے منتظم کی جگہ خالی ہوئی۔ باخ کو اس شرط پر ملازم رکھا گیا کہ اس کی موسیقی نظریاتی نہ ہو، وہ ایک محتاط زندگی بسر کرے، اسکول کے طلباء کو شوق سے تعلیم دے، انھیں ایسی موسیقی فراہم کرے جو نہ بہت زیادہ عمومی ہو، نہ بہت اعلیٰ اور سب سے اہم شرط یہ تھی کہ وہ کونسل کی خاطر خواہ تعظیم کرے۔ کونسل کے ایک فرد کی رائے میں، جس کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے، باخ بہت معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔

ٹامس اسکول کا انتظام میونسپلٹی کے سپرد تھا جو شروع میں ایک آگسٹنی ادارہ تھا اور شہر کے گرجا گھروں کے لیے کورس کا انتظام کرتا تھا۔ یہاں بھی باخ کو ایک ناخوشگوار جھگڑے سے دوچار ہونا پڑا جو اس کی اہلیت کے بارے میں تھا۔ اس جھگڑے سے اس کی نغمہ سازی کے کام میں رخنہ پڑا۔ تاہم اس کی شہرت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔

حالات کچھ بھی کیوں نہ ہوں مگر باخ کی عزت و منزلت مسلّم تھی۔ جو اس ایک واقعے سے ظاہر ہے —— پرشا کے فریڈرک اعظم کی ایک مدت سے خواہش تھی کہ وہ باخ سے ملاقات کرے۔ باخ کو بھی اس کا علم تھا۔ چنانچہ ۱۷۴۷ء میں اس نے پوٹسڈم کا سفر کیا۔ شام کے وقت جب وہ شہر میں وارد ہوا تو فریڈرک ایک نجی محفل موسیقی میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ ملازم نے جب باخ کے پہنچنے کی اطلاع دی تو

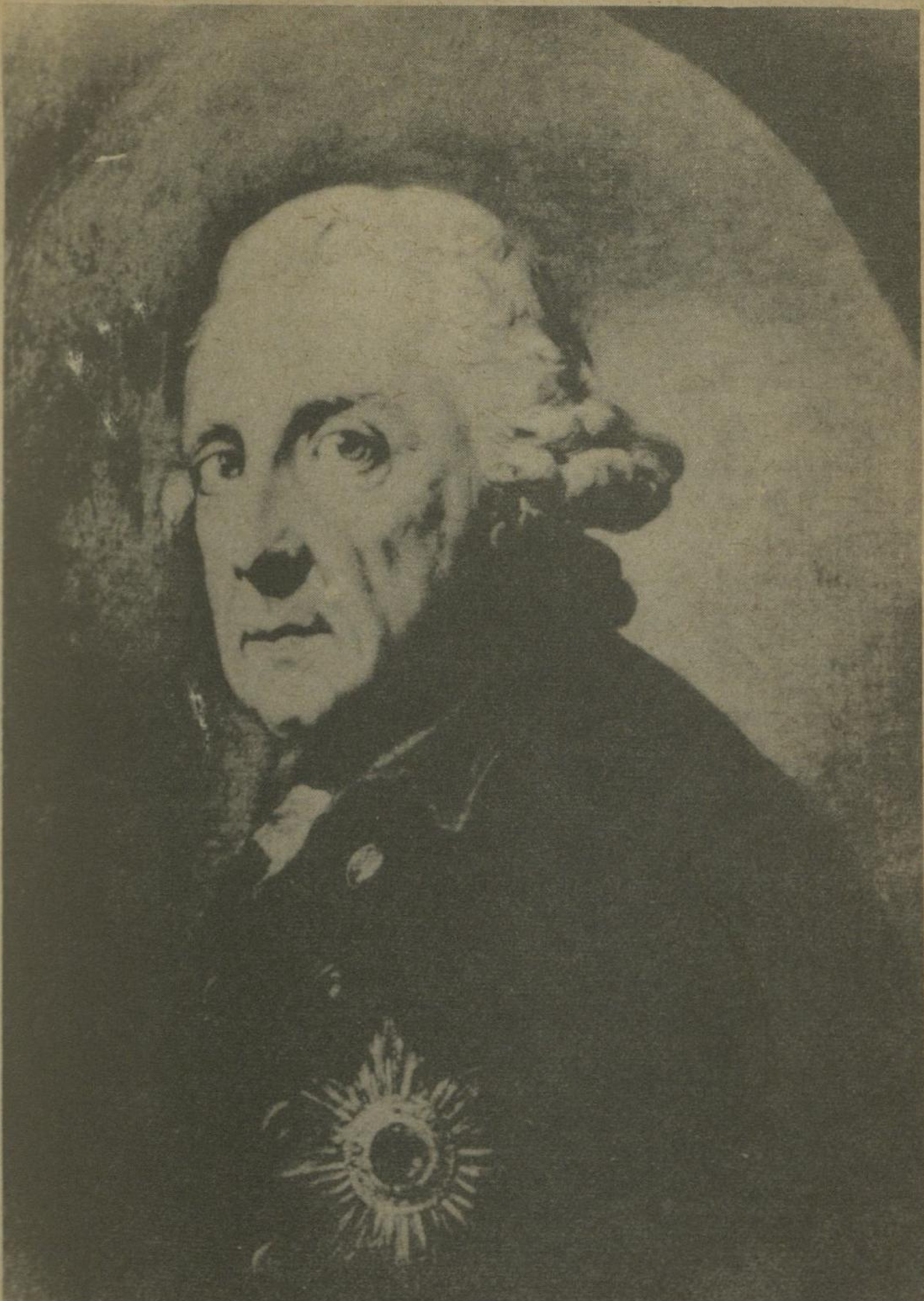
فریڈرک نے فوراً ہی اسے طلب کر لیا اور محفل ملتوی کر دی۔
پھر بادشاہ اور اس کے مہمان نے نئے آلاتِ موسیقی کا معائنہ کیا باخ نے ان کو بجا کر اپنے میزبان کو خوش کیا اور خود بادشاہ کے لیے کوئی نیا نغمہ اختراع کرنے کی اجازت لی۔ بادشاہ نے کہا کہ اس نغمے کو چھ حصّوں میں ترتیب دیا جائے۔ باخ نے اس کی تعمیل کر کے بادشاہ کو خوش کر دیا۔ یہ اس جیسے باکمال شخص کے لیے بھی کوئی معمولی کام نہ تھا جو اس زمانے کے بورڈ والے آلات موسیقی کا مانا ہُوا اُستاد تھا۔ لیپزگ واپس آنے پر اس نے اسی نغمے پر پھر ریاض کیا اور اس کے ساتھ ایک ٹکڑا لگا دیا جو بانسری کے ہم آہنگ بھی ہو سکتا تھا۔ باخ نے اس حقیقت کو فراموش نہ کیا کہ فریڈرک کو بانسری بجانے کا بہُت شوق ہے۔ پھر اس نے یہ نغمہ بادشاہ کی خدمت میں اس انتساب کے ہمراہ روانہ کیا" اس بادشاہ کے نام جو موسیقی میں بھی اسی قدر قابلِ ستائش ہے جس طرح فنون جنگ اور حکمتِ امن میں"۔
لیکن بڑے تعجّب کی بات یہ ہے کہ باخ کی موسیقی اس کی اپنی زندگی میں اور اس کے بعد بھی کچھ زیادہ معرُوف نہ ہو سکی۔ اس کا تھوڑا ہی حصّہ شائع ہُوا۔ اس کی شہرُت کا اِنحصار اس پر تھا کہ وہ ایک اچھّا سازندہ تھا۔ ۱۷۵۰ء میں اس کے اِنتقال کے بعد اِس کے بارے میں تھوڑا بہُت کہا سُنا گیا۔ حتّیٰ کہ انیسویں صدی کے نغمہ سازوں نے اس کے متعلق تحقیق کی جس میں جرمنی کا فلکس میڈلزان بارتھلڈی

شامل ہے۔ اس وقت اس کی مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے۔

باخ نہایت مذہبی آدمی تھا۔ اس کا زیادہ تر کام گرجا گھر کی موسیقی سے متعلّق ہے۔ سینٹ جان اور سینٹ میتھو کے جذبات کو جن میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اس نے موسیقی میں بیان کیا۔ آلات کی موسیقی جیسے کہ وائلن پر آرکسٹرا کے ساتھ نغمہ سازی، بریڈنبرگ نغمات، اس کے اڑتالیس تعارنی اور مختصر عنوانات پر نغمے، چھوٹے چھوٹے نغموں کی ترتیب کا فن اور دیگر کمالات اب بھی سامعین کو مسحور کرتے ہیں۔ محسوسات کی صحّت اور ترتیب کی نزاکت اس کی موسیقی میں ایک قسم کا تقدّس پیدا کر دیتی ہے جو خدا پر بھروسہ کرنے اور دائمی نجات کے عقیدے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ البتہ ایک یاس سی پائی جاتی ہے جس میں اللہ کی جھلک بھی موجود ہے۔

اس عظیم روایت کو اس کے بیٹوں نے جاری رکھا۔ سی۔ پی۔ ای باخ ہین، بیتھوون اور جے۔ سی باخ کو کافی متاثّر کیا جو انگلستان کے جارج سوئم کے خاندان کا استاد موسیقی تھا۔ فرائڈمن باخ اس کا دوسرا بیٹا ایک قابل موسیقار تھا مگر اپنی صلاحیت کو پورے طور پر بروئے کار نہ لا سکا۔ کیونکہ اس کے باپ کی شہرت نے اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔

(جرمی لین)



فریڈرک اعظم

جرمن تاریخ ساز

پرشا کا فریڈرک اعظم

جرمن تاریخ ساز بادشاہ (۱۷۱۲ء — ۱۷۸۶ء)

اگر کوئی بہترین آدمی کسی ریاست کا سربراہ ہو اور اس کی رہنمائی سب سے بڑے دانشور، اہلِ علم، مضبوط ترین اور ہوشیار آدمی کر رہے ہوں جو دوسروں کے مقابلے میں ماضی و مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہوں تو یہ ایک فطری بات ہو گی۔ لیکن ماضی کی تاریخ میں ایسے حالات کی صرف بارہ نظیریں ہی ملتی ہیں۔ فریڈرک اعظم کی مثال ان کمیاب مثالوں میں سے ایک ہے جو تین ہزار سال کے عرصے میں وقوع پذیر ہوئیں۔

آزاد ثقافتی مورّخ ایگن فرائڈل کے چند الفاظ طول طویل تاریخی جائزوں پر بھاری ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جرمنی کی ریاستوں میں سے ایک ریاست کا حکمران بننے کے وقت اس کی اہمیت کچھ زیادہ نہ ہو لیکن سیاسی منظر پر چھیالیس ۴۶ سال بعد پرشا کی سلطنت کا شمار یورپ کی بڑی طاقتوں میں ہونے لگا تھا۔

پرشا کی جدید ریاست کی داغ بیل ۱۷۰۱ء میں پڑی۔ ابتدائی دور کے بادشاہوں کے زمانے میں تاریخِ یورپ میں اس کا کردار

بہت معمولی تھا مگر اس عرصے میں بعد کی خود مختار ریاست کی بنیادیں اُستوار ہو گئیں۔ فریڈرک اوّل (۱۷۰۱ء تا ۱۷۱۳ء) نے ثقافتی میدان میں بہت کچھ کام کیا۔ اس نے یونیورسٹیاں قائم کیں اور برلن کو فنون و سائنس کا مرکز بنا دیا۔ اس کے جانشین فریڈرک ولیم اوّل (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۴۰ء) نے ایک جدید اور مضبوط فوج کی بنیاد ڈالی۔ ملک کے نظام کو از سرِ نو ترتیب دیا اور آبادکاری کے لیے نئے علاقے تجویز کیے۔ فریڈرک دوم نے جو اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے پرشا کو ایک بڑی جرمن ریاست بنا دیا۔ اور اس کی اقتصادی جڑوں کو مستحکم کر دیا۔

ولی عہد شہزادہ فریڈرک ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا۔ کوئی شخص اور خود بادشاہ بھی یہ سوچ نہ سکتا تھا کہ وہ اتنا بڑا مدبّر ہو جائے گا۔ وہ ہر چیز میں بڑی گہری دلچسپی لیتا تھا اور اپنے رجحانات پر عمل کرتا تھا۔ جس کے نتیجے میں باپ سے مخالفت ہو گئی۔ اس کے باپ کا خیال تھا کہ فوجی نظم و ضبط قائم رکھنا ہی اعلیٰ ترین اصول ہے۔ آخر فریڈرک نے اس سخت اور بے رُوح فضا سے بچنے کے لیے اپنے دوست فان کٹے کے ساتھ انگلستان بھاگ جانے کی کوشش کی۔ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ بادشاہ نے فان کٹے کو پوری مہم کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔ اس کو دوست کی آنکھوں کے سامنے پھانسی دے دی گئی اور خود شہزادے کو کسترن کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ اس نے بڑی سمجھداری

سے باپ کی کارروائیوں کا احترام کرتے ہوئے سرِ اطاعت خم کر دیا۔ اس طرح اس کو کئی سال تک سائنس اور فنون میں مصروف رہنے کا موقع مل گیا۔ وہ برلن کے قریب شلاس رائنزگ میں برنزوک ولفن بٹل کی شہزادی الزبیتھ کے ساتھ شادی کے بعد رہتا تھا۔ وہاں اس کے چاروں طرف ادیب اور اہلِ علم جمع رہتے۔ اس وقفے میں اس نے بڑے بڑے فلسفیوں کے خیالات کا مطالعہ کیا اور ریاست کی تنظیم سے متعلّق بھی بہت سی کتابیں لکھیں جن کی بنیاد روشن خیالات پر تھی۔ اور جن کی رو سے انسانی عمل کا بنیادی اصول فکر و فہم پر مبنی ہونا چاہیے۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ اہم فریڈرک کی "اینٹی میکیاولی" تھی۔ جو ۱۷۳۹ء میں ہالینڈ میں گمنام طور پہ شائع ہوئی۔ اس میں اس نے حکومت کے عنوان پر اٹلی کے میکیاولی کی مخالفت کی تھی۔ میکیاولی کا کہنا تھا کہ ریاست کی بہبودی ہر جرم و بغاوت کا جواز ہے۔ فریڈرک نے بہر حال ایسے حکمران کی حمایت کی جو روشن خیالی کے اصولوں پہ چلے، اپنی رعایا کی زندگیوں کی ذمّہ داری محسوس کرے اور فہم و قانون کی حکمرانی کے اصول بیرونی سیاست کے سلسلے میں بھی استعمال کرے۔

"اینٹی میکیاولی" کے مصنّف کو جلد ہی موقع مل گیا کہ وہ عملاً اس کا مفہوم ظاہر کر سکے کیونکہ اگلے ہی سال اس کے باپ کا انتقال ہو گیا اور وہ خود مالکِ تخت و تاج ہو گیا۔ شروع میں اس کی پالیسی اس کے

اپنے اصولوں کے خلاف معلوم ہوتی تھی۔ حکومت کے پہلے ہی سال وہ آسٹریا کے خلاف جنگ میں مصروف ہو گیا جو قطعی خلافِ امید تھی۔ کیونکہ وہ زیادہ تر خیالی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ وہ لڑائی سے طبعاً نفرت کرتا تھا۔ تاہم جب اسے پرشا کی حالت کو جانچنے کا موقع ملا تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ آسٹریا کے عزائم کو روکنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ آسٹریا اس وقت یورپ کے جرمن بولنے والے علاقوں میں ایک بہت بڑی طاقت کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فریڈرک نے محسوس کیا کہ اگر اسے یورپ کے معاملات میں کوئی اہمیت حاصل کرنا ہے تو اپنی شہرت کو بڑھانا اور علاقے میں اضافہ کرنا چاہیے۔ اس کے نزدیک یہ خواہش مناسب تھی۔ کیونکہ اس سے طاقت کا توازن بحال ہوتا تھا۔ پس اس نے اعلان کر دیا کہ پرشا سلیشیا پر اپنے حقوق سے دست بردار نہیں ہوگا۔ سلیشیا اس وقت آسٹریا کے قبضے میں تھا۔ پرشا کے بادشاہ کو علم تھا کہ آسٹریا اس کے مطالبے کو منظور نہیں کرے گا۔ بہرحال اس نے اپنے مخالف سے جنگ کی جو اس کے لیے تیار نہ تھا۔ فریڈرک نے جنگ جیت لی مگر قبل اس کے کہ وہ سلیشیا کو پرشا کے زیرِ تسلّط لانے میں کامیاب ہو، ایک دوسری جنگ ناگزیر ہو گئی۔

پرشا کی شہرت بڑھ گئی اور اس کے علاقوں میں کافی اضافہ ہو گیا۔ اب فریڈرک نے اس بات پر زور دیا کہ یورپ کی سیاست برلن کی

خواہشات کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس کو یقین تھا کہ اسی طرح پرشا کی اندرونی حالت کو مستحکم کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے بعد اس نے امن کے اگلے دس سال کا بہترین استعمال کیا۔ سرکاری اور انتظامی طریقِ کار کو بالکل بدل دیا اور مُلک کے مختلف حصّوں کی مروّجہ وزارتوں کے بجائے ہر محکمے کے لیے علیحدہ علیحدہ وزارتیں قائم کیں۔ یہی ایک طریقہ تھا جس کے ذریعے جدید مفہوم کے مطابق باقاعدہ منصوبہ بندی اور اندرونی پالیسی پر عمل ممکن ہو سکتا تھا۔

فریڈرک کو اندازہ تھا کہ ایک پھلتی پھولتی معیشت میں زیادہ ٹیکس لگانا بھی ممکن ہو گا جس کی اسے اپنی فوجوں کو تنخواہ دینے، تعلیم و نیز ریاست کے دیگر اخراجات پُورے کرنے کے لیے ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں اس نے اراضی زیرِ کاشت لانے کا کام ہاتھ میں لے لیا۔ تجارت کو فروغ دینے کے لیے نہریں بنوائیں۔ زراعت کے لیے امداد دی اور بڑے بڑے کارخانے بنانے میں مدد دی، خاص طور پر سُوتی کپڑے کی صنعت کو فروغ دیا تاکہ مُلک درآمدی سامان کا محتاج نہ رہے۔

اسکولوں کا سلسلہ وسیع کرنے کے لیے بھی بہت کچھ کیا اور اس طرح ایسے حالات پیدا کر دیے جن کی مُلک کو اقتصادی اور رُوحانی ترقی کے لیے ضرورت تھی۔ وہ خود خدا پر عقیدہ نہ رکھتا تھا لیکن محسوس کرتا تھا کہ عیسائی گرجے معلوماتِ عامہ کا نہایت موثر ذریعہ ہیں۔ لہٰذا اس نے گرجاؤں کو آزاد کر کے پرائمری اسکولوں کو ان کی ماتحتی میں دے دیا۔

مذہبی رواداری اس کا ایک بڑا مقصد تھا۔ اس نے لکھا تمام مذاہب کو برداشت کرنا چاہیے اور قانون میں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ کوئی ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دے۔ ہر شخص کو اپنے اپنے طریقے پر نجات حاصل کرنا چاہیے۔ ایک روشن خیال بادشاہ کی حیثیت سے وہ اخباروں کی آزادی کا بھی قائل تھا۔ کابینہ کو اپنے ایک حکم میں اس نے لکھا۔ "اخباروں کو دلچسپ بنانا ہے تو ان پر کوئی پابندی نہ ہونا چاہیے۔"

فریڈرک اعظم بلاشبہ جمہوریت کا حامی تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ زمانہ ابھی اس کے لیے ہموار نہ ہوا تھا۔ تاہم وہ اپنے کو ریاست کا ملازم اول سمجھتا۔ یہ طرزِ فکر فرانسیسی بادشاہ لوئی چہاردہم سے بالکل مختلف تھی جو کہا کرتا تھا کہ "میں ریاست ہوں۔" فریڈرک نے پرشا کو ایسا ملک بنا دیا تھا جہاں قانون کی حکمرانی تھی اور بادشاہ اور حکومت کسی عدالتی معاملے میں دخل نہ دے سکتے تھے۔ کیونکہ عدالتوں کا کام قانون کی وضاحت کرنا تھا اور حاکم کا کام امن قائم رکھنا۔

دس سال کے زمانۂ امن میں فریڈرک نے پوٹسڈم کے قریب ایک محل تعمیر کرایا جس کا نام اس نے سنسروسی رکھا۔ یہ محل جرمنی میں قدیم آرائش سے مزین تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ رہائنبرگ کی طرح اس نے یہاں بھی علم و فن کے ماہرین جمع کر لیے۔ فرانسیسی فلسفی والٹیر سے تو اس کی گاڑھی چھنتی تھی۔ پرشا کا بادشاہ فرانسیسی ثقافت کا دلدادہ

تھا اور تحریر میں ہمیشہ فرانسیسی زبان اِستعمال کرتا تھا۔ وہ موسیقی کا بھی بہت شوقین تھا۔ بانسری نہایت عمدہ بجاتا اور گانے بھی ترتیب دے لیتا تھا۔ اس کے گانے آج بھی گائے جاتے ہیں۔

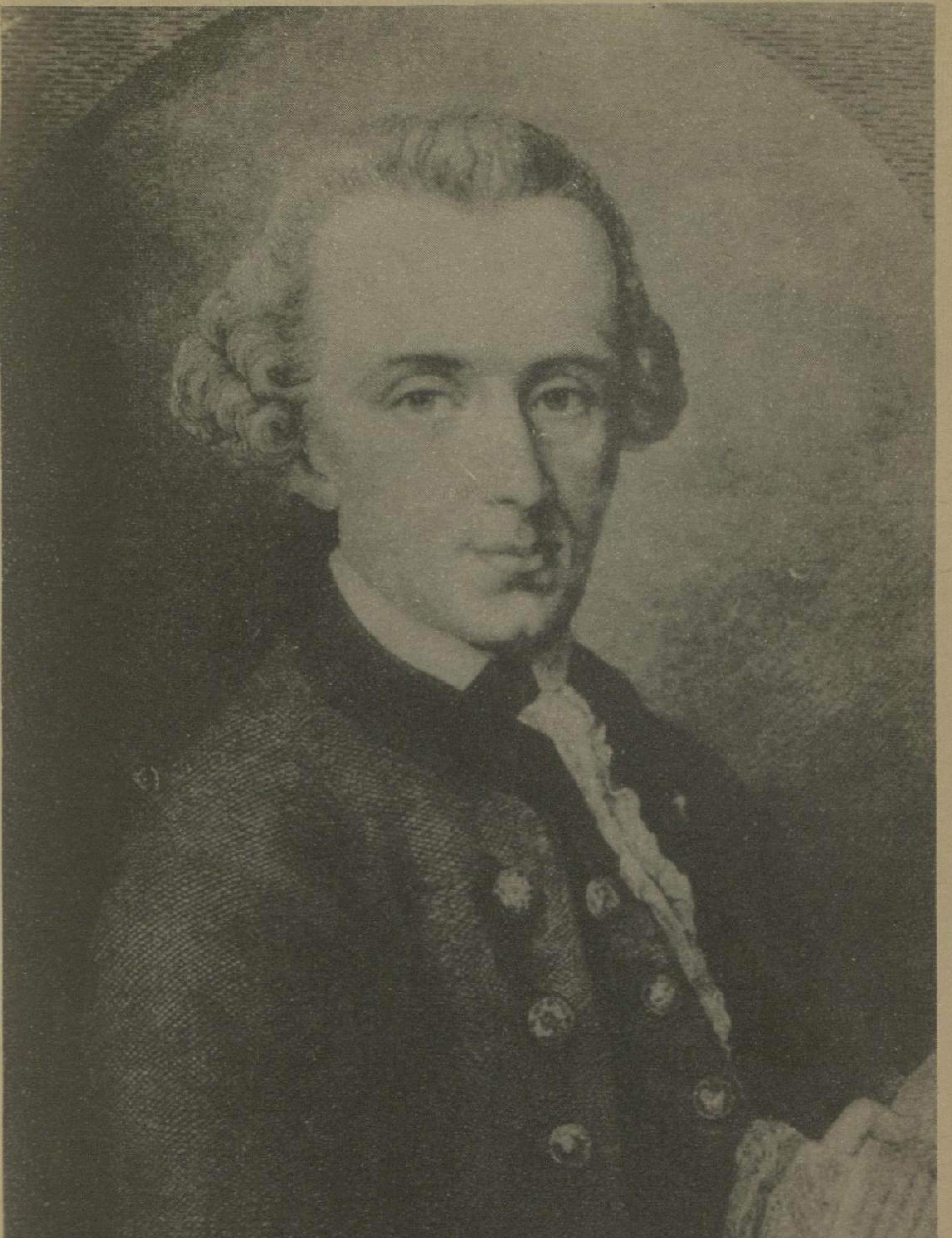
مجموعی طور پر اس نے ریاست کے مُعاملے میں کبھی غفلت نہیں برتی۔ ۱۷۵۶ء میں فرانس، روس اور آسٹریا اور دوسری جرمن ریاستیں پرشا پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے متحد ہوگئیں تو فریڈرک نے ایک دفاعی جنگ شروع کر دی اور اِنگلستان کی مدد سے سات سال تک مُشکلات سے نبرد آزما رہا۔ زار کے اِنتقال کے بعد اس نے بڑی حکمتِ عملی سے رُوس کو اس اِتحاد سے علیحدہ کرا دیا اور ایک باعزّت سمجھوتہ کر لیا جس سے سیلیشیا مستقل طور پر اس کے قبضے میں آگیا۔

امن بحال ہو جانے کے بعد اس نے اپنی ساری توجہ پرشا کو مضبُوط بنانے پر مرکُوز کر دی۔ بیرونی سیاست میں وہ کبھی کبھار ہی دلچسپی لیتا تھا، وہ بھی اس وقت جب شدید ضرُورت پیش آتی جیسے کہ اس کو پولینڈ کی تقسیم کے وقت دخل اندازی کرنا پڑی اور اس نے پولینڈ کو رُوس میں شامل ہونے سے بچا لیا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو طاقت کا توازن بُری طرح متاثّر ہوتا اور ریاست کے ملازم اوّل کی حیثیت سے اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ ننگی طاقت کے اصُولوں پر اعتقاد رکھنے والی دُنیا میں اس کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا۔

آخر چھیالیس سال تک حکُومت کرنے کے بعد ۱۷۸۶ء میں

جب اس نے وفات پائی تو پرشا کو ایک ایسا مُلک بنا کر چھوڑ گیا جس کی حیثیت یورپ میں مسلّم تھی۔

(کرٹ ڈائڈرخ)



ایمنوئل کانٹ

جرمن فلسفی

امینول کانٹ

(۱۷۲۴ء - ۱۸۰۴ء) جرمن فلسفی

جرمن فلسفی امینول کانٹ تقریباً دو سو سال پہلے مشرقی پرشا کی کونسبرگ یونیورسٹی میں درس دیا کرتا تھا۔ آرتھر شوپن ہار نے اس کے بارے میں لکھا ہے "پچھلے دو ہزار سال میں کانٹ کی تعلیم سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا فلسفہ درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے اور ایسے جدّت پسند دماغ کی کاوش ہے جس کو قدرت کبھی کبھی پیدا کرتی ہے۔

یہ تعریف غالباً کچھ مبالغہ آمیز ہے۔ تاہم کانٹ کی تعلیم نے فلسفیانہ خیالات اور طرزِ احساس میں ایک بڑا انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اپنی اہم تصنیف "کریٹک آف پیور ریزن" (دلائل خالص پر تنقید) میں وہ ایک ایسا اقدام کرتا ہے جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔ اس نے کہا کہ چیزوں کی ظاہری صورت کو ان کی حقیقت میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ ہم کسی چیز کو اس طرح نہیں جان سکتے جیسی کہ وہ درحقیقت ہے۔ کیونکہ وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔

کانٹ کا قول تھا کہ انسان سوچنے سمجھنے کی قوّت وقت اور فاصلے کی نوعیت اور اصول استدلال سے متعیّن ہوتی ہے اور اسی کی مدد

سے تجربے کا امکان بھی پیدا ہوتا ہے اور اس کے نتائج دور رس ہوتے ہیں۔ ہم سائنسی طریقہ پر ایسی چیزوں مثلاً خدا، روح، دوام آزادی خواہش اور دوسری باتوں کو نہ شناخت کر سکتے ہیں اور نہ ان کی تعریف ہی کر سکتے ہیں۔ خدا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ فہم اور سائنس ہمیں یہ معلوم کرنے میں مدد نہیں دے سکتی کہ آیا کوئی خدا ہے بھی یا نہیں ؟

اس طرح قدرتی طور سے مذہب پر ایک ضرب پڑتی ہے لیکن کانٹ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں تھا جیسا کہ اس کے بہت سے ہم عصر سمجھتے تھے کہ وہ مُلحِد تھا۔ اس کے مشہور جملے اس کے بالکل برعکس بات ظاہر کرتے ہیں —— تاروں بھرا آسمان اس کے اُوپر ہے اور قانون اخلاق کے اندر خلقت کے خدائی نظام کی ناقابل تردید علامات اس پر دلالت کرتی ہیں۔

کانٹ دراصل انگلستان کے فلسفیوں جان لاک اور ڈیوڈ ہیوم، اور فرانسیسی فلسفیوں روسیو اور والٹیر کے نظریات کی مکمل نمائندگی کرتا ہے جو آزاد روشن خیالی کے مظہر ہیں۔ اِن نظریات نے ایسے سائنسی تصوّر کو جنم دیا ہے جس سے بلا روک ٹوک کوئی بھی تحقیق مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔ ان ہی کی بدولت وہ خیالات پیدا ہوئے جو معاشی اور سماجی وجوہ کے ساتھ ساتھ فرانسیسی انقلاب کی پُشت پر تھے۔ ان ہی سے اس یورپ کی سماجی تنقید کی بُنیاد پڑی جس کی اساس قومی ریاست

پر رکھی ہوئی تھی۔ کانٹ کی حیثیت ان انقلابات میں ایک مرکزی نقطے کی سی تھی۔ اس نے اپنے تمام ہمعصروں کو پیچھے چھوڑ دیا اور آنے والی صدی کا فلسفہ اسی کے طرزِ فکر سے شروع ہوا۔

کانٹ نے نہ صرف اس زمانے کے مسلّمہ تصوّرات کو تباہ کیا بلکہ ان کی جگہ نئی قدروں کی تخلیق کی۔ مثال کے طور پر اس نے سب سے پہلے زور فرض کے پورا کرنے پر دیا۔ یہ ضروری امر فی زمانہ بیشتر کے مقابلے میں اعلیٰ ترین قانونِ اخلاق سمجھا جاتا تھا۔ جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ہمیں اس طرح عمل کرنا چاہیے کہ ہمارے طرزِ عمل کو ایک عام قانون کی بُنیاد بنایا جا سکے۔ یعنی ہمیں اپنے رجحان کے بجائے اس احساس کی بنا پر عمل کرنا چاہیے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ صحیح ہے —— یہ اصُولی معلّم امینول کانٹ ۱۷۲۴ء میں جرمنی کے مشرق کونگز برگ میں پیدا ہوُا۔ اس کا باپ ایک زین ساز تھا اور کچھ زیادہ خوش حال نہ تھا۔ کانٹ نے وظیفوں کی مدد سے تعلیم حاصل کی۔ وہ اگرچہ اسّی برس تک زندہ رہا لیکن اس نے اپنے وطن کونگز برگ کو کبھی نہیں چھوڑا —— اور اس کے باوجود اس نے دُنیا کے علوم کا ایک بڑا خزانہ حاصل کر لیا۔

کانٹ نے اپنی طویل عمر میں بڑے بڑے انقلابات دیکھے۔ یورپ میں کئی بڑی ریاستیں وجود میں آئیں۔ موجودہ سماجی ڈھانچے کی تعمیر کا آغاز ہوُا۔ لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوُئے تصوّرات میں شہریت کے تصوّر کا اضافہ ہوُا۔ پھر اس میں قانونِ فطرت کے فلسفے سے ایک

روشن خیالی پیدا ہوئی جس نے آگے چل کر فرانسیسی انقلاب کا اثر قبول کر لیا اور جرمنی کی فضا میں پروان چڑھا۔ فرانسیسی انقلاب کے صرف چند سال بعد ۱۷۹۵ء میں کانٹ نے ایک مختصر کتاب "ہمیشہ رہنے والے امن" پر لکھی۔ اس میں ایک فلسفیانہ خاکہ پیش کیا جس کا مقصد جنگ کے قطعی خاتمے کی طرف رہنمائی تھی اور لوگوں کے درمیان دوامی امن قائم کرنا تھا۔ اِس خاکے کا شمار کانٹ کی عظیم ترین تصانیف میں کیا جاتا ہے۔

کانٹ چالیس سال تک کونگز برگ یونیورسٹی میں پروفیسر رہا جہاں صرف فلسفہ ہی اس کا مضمون نہیں تھا، وہ تاریخ اور جغرافیہ کی تعلیم بھی دیتا تھا اور فطری سائنسوں میں بھی دلچسپی لیتا تھا۔ اپنے انقلابی خیالات کے باعث شاہ پرشا اور سنسر کے حکام سے اکثر اس کا ٹکراؤ۔ فریڈرک اعظم ایک آزاد خیال شخص تھا اور فرانسیسی انقلاب کے پس پردہ کام کرنے والے نظریات کو اچھی نظر سے دیکھتا تھا مگر اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا جانشین ایک تنگ نظر انسان تھا جسے ہر وقت یہ خوف رہتا کہ کہیں مذہب کی بنیادیں کانٹ کی تعلیم سے متاثر نہ ہو جائیں۔ اور اس کی بادشاہت کو کوئی خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔ لہٰذا اس نے کئی مرتبہ واضح الفاظ میں کانٹ کو تنبیہ کی کہ وہ مذہب کے مسلّمات پر تنقید نہ کرے۔ کانٹ کو بالآخر وہی کرنا پڑا جیسا اس کو حکم دیا جاتا تھا۔ کیونکہ بصورتِ دیگر اسے اپنے عہدے سے محروم ہونے

کا خطرہ تھا۔ ایسا کرنے پر اس کو اکثر تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ بہت مختصر تھا۔ اس کی کاٹھی کمزور تھی اور اپنی صحت کے بارے میں محتاط رہنا پڑتا تھا۔ معمولاتِ زندگی کے باعث بھی گاہے گاہے اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ وہ جس راستے پر چہل قدمی کے لیے جاتا تھا، اُس طرف بسنے والے اسے دیکھ کر اپنی گھڑیاں ملایا کرتے تھے۔ ۱۸۰۴ء کی سخت سردی میں اسّی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا — کونگز برگ کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اس کو شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ دفن کیا۔

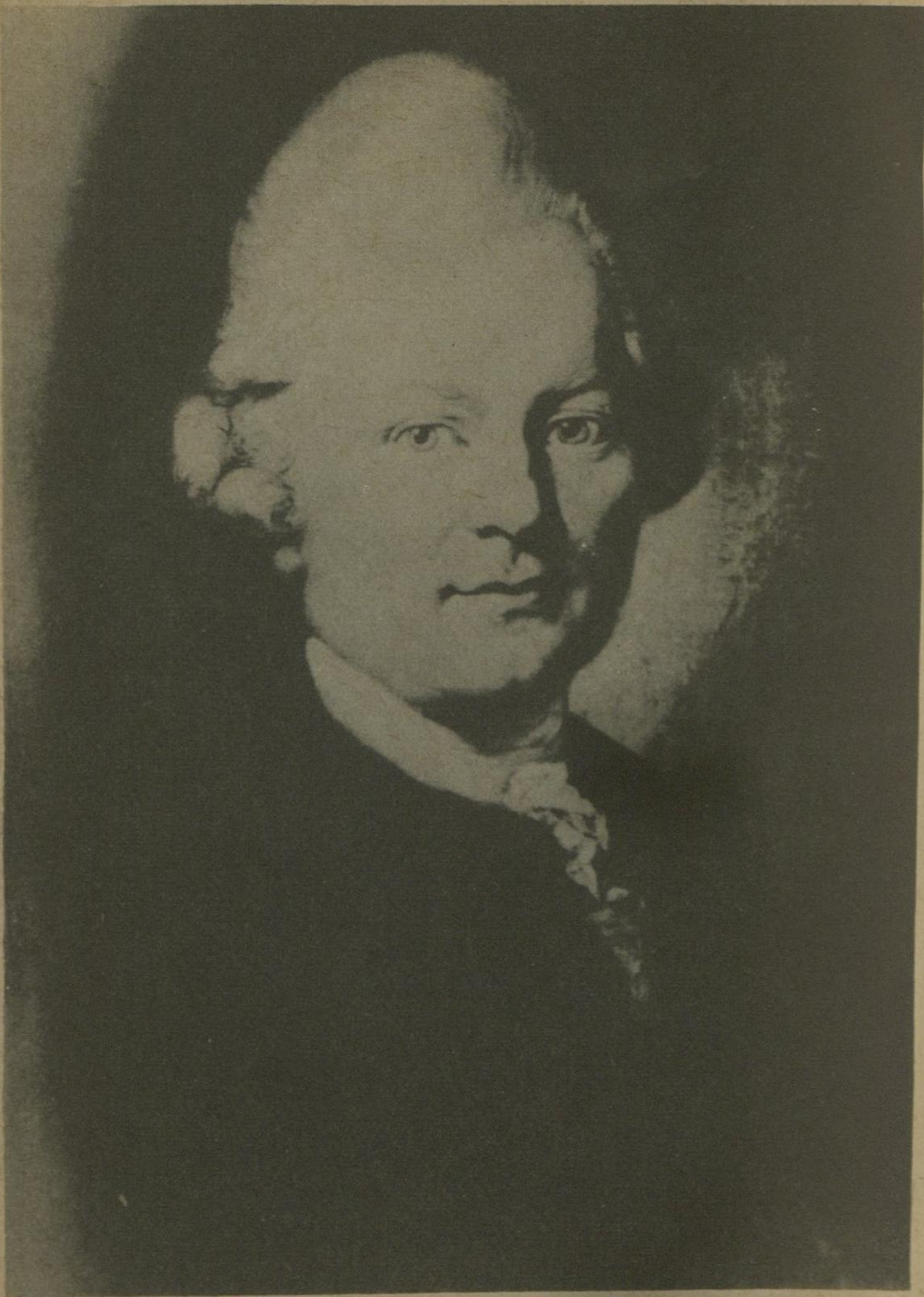
کانٹ نے فہم و ادراک کے استعمال کو مقصدیت کی معراج تک پہنچا دیا۔ خود اپنے متعلّق کہا کرتا تھا کہ وہ انسانی فہم کا مورّخ ہے اور اس نے انسانیت کے لیے اپنے تاثّرات میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اس کی طرزِ فکر نے بڑے بڑے انقلابات کو جنم دیا۔ مذہبی و سیاسی اعتقادات کی طاقت کو ختم کیا اور اس کی جگہ خود اعتمادی کی ضرورت پر زور دیا۔ جو آزاد استدلال اور "ذمّہ داری" کے اعلیٰ اخلاقی قانون سے وجود میں آتی ہے۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)

گوٹھولڈ اِفریم لیسنگ

ڈرامہ نگار (۱۷۲۹ء - ۱۷۸۱ء)

لیسنگ کی بیشتر تصانیف کا مقصد اپنے زمانے کے مسلّمہ خیالات کی مخالفت تھا۔ لہٰذا اس کی تحریروں کو اسی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہزادے، جو اٹھارہویں صدی میں جرمنی کی تقسیم سے پیدا ہو جانے والی متعدد ریاستوں پر مشتمل تھے۔ وہ انسانیت کی بنیادوں پر ان سب کے خلاف تھا اور تھیٹر کے ان تصوّرات کا بھی مخالف جن میں فرانسیسی کتابوں کے ترجمے یا ان کی نقل میں لکھے ہوئے ڈرامے کثرت سے استعمال ہوتے۔ وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ جرمنوں کا ادب میں کوئی مخصوص مقام نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کا یہ قول، پہلے قول سے متضاد سہی، پھر بھی اپنی جگہ پر تھا کہ ادب کے اس مقام کو حاصل کرنے کے لیے انگریزی اور ان کے بڑے ڈرامہ نگار شیکسپیئر کا مُطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ اِس خیال کی بھی تائید کرتا تھا کہ کسی اِنسان کو پرکھنے کے لیے ذات پات کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اِس سلسلے میں وہ پہلا جرمن مصنّف تھا جس نے ایک تعلیم یافتہ یہودی کو اسٹیج پر پیش کرنے کی ہمت کی۔ ایک کھیل میں جس کا نام



گوٹھولڈ افریم لیزنگ
ڈرامہ نگار

"دی جیوز" تھا۔ اور ۱۷۴۹ء میں لکھا گیا تھا، یہ یہودی منظر پر آیا۔ اس کا مزاحیہ کھیل میں مذہبی اور نسلی رواداری کی تلقین کی گئی۔ دُوسری بار اس نے اپنے آخری کھیل "ناتھن دی وائز" (عقلمند ناتھن) میں اِس عنوان کا اعادہ کیا۔

لیسنگ کا پہلا بڑا کھیل "مِس سارا سیمپسن" تھا جو ایک المیہ تھا اور ۱۷۵۵ء میں شائع ہُوا۔ اس کھیل کا عنوان انگریزی میں تھا اور یہ کھیل نثر میں لکھا گیا تھا نہ کہ نظم میں، جیسا کہ اس وقت رواج ہے۔ اس کے کردار بھی شاہی خاندان کے افراد نہ تھے جو اس زمانے میں عموماً ٹریجڈی کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ مِس سارا کا باپ سر ولیم تھا لیکن وہ زیادہ تر پس پردہ ہی رہا۔ لیسنگ کو یقین تھا کہ شہزادوں اور بہادروں کے ناموں سے کھیل میں شان و شوکت تو پیدا کی جا سکتی ہے لیکن ان سے ہمدردی کا جذبہ اُبھارنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔

تھیٹر پر اس کی تنقید کے بہتر مضامین وہ ہیں جو اس نے وزیٹے زیٹنگ کے لیے لکھے۔ جدید ترین ادب کے متعلق خطوط اور "ہیمبر گشے ڈراماٹرجی" کے مضامین کا سلسلہ اس نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ہیمبرگ میں قومی تھیٹر بننے کے بعد ہاؤس ڈرامہ نگار ہو گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم اسٹیج کے کرداروں سے ہمدردی یا خوف محسوس کرتے ہیں تو اس لیے کہ وہ عوام ہوتے ہیں بادشاہ اور امرا نہیں ہوتے۔

اور ان کے حالات بالکل ہمارے جیسے ہوتے ہیں، ان کی بدنصیبی قدرتی طور پر ہماری رُوح کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہے۔ اس کا قول تھا کہ اسے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی شخص کھیل میں کیا کرتا ہے بلکہ وہ تو یہ جاننا چاہتا ہے کہ ایک خاص کردار کا انسان چند خصوصی حالات میں کیا کرتا ہے؟ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایسی کہانی چاہتا تھا جو بے جوڑ نہ ہو اور جس میں سب کرداروں کا تعلق ایک ہی سلسلے سے ہو۔ اختتام بھی اس کے نزدیک قدرتی ہونا چاہیے نہ کہ معجزاتی۔

اس کا دُوسرا بڑا اسٹیج کا ڈرامہ "منا خان بارن سلیم" تھا جو ۱۷۶۷ء میں شائع ہؤا۔ ایک کامیڈی (مزاحیہ) ڈرامہ، جس کی کہانی کچھ یُوں تھی کہ میجر ٹیلہم کی منگنی "منا خان بارن ہیلم" کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اس کا ایک بازو ہفت سالہ جنگ میں زخمی ہوگیا۔ اس کے بعد وہ دولت سے محرُوم ہوگیا اور اسے کمیشن سے مستعفی ہونا پڑا۔ لہٰذا وہ اپنی منگیتر کے پاس سے چلا گیا۔ کیونکہ اب وہ اپنے آپ کو اس کے ساتھ شادی کرنے کا اہل نہ پاتا تھا۔ مگر جب منا نے بہانہ سازی کرکے اس سے کہا کہ اس کے چچا نے اس کو اپنی جائداد سے محرُوم کر دیا ہے تو وہ محسُوس کرنے لگا کہ اسے منا کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اِس طرح کھیل ہنستے کھیلتے ختم ہوگیا۔ جب ٹیلہم کے تمام مسائل حل ہو چکے تو بادشاہ نے ایک خط کے ذریعے اس کو فوج میں ملازمت پر واپس بُلا لیا۔

اس کھیل میں جدّت یہ تھی کہ اس کا تعلق ہفت سالہ جنگ سے

پیدا شدہ حالات سے تھا۔ جنگ ۱۷۶۳ء میں ختم ہُوئی۔ کھیل ۱۷۶۷ء
میں منظرِ عام پر آیا جو حالات کے بالکل مطابق تھا۔ لہٰذا بادشاہ کی
نافذ کی ہُوئی اِصلاحات کی سیاسی اہمیت بھی واضح ہوگئی اور یہ بھی
ظاہر ہوگیا کہ ریاستی کاروبار اور انسانیت میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے
اور ہونا بھی چاہیے۔ بہر صُورت ہر شخص نے محسُوس کیا کہ محبّت کرنے
والوں کو یکجا ہونا چاہیے تھا۔ لیسنگ جب یہ ڈرامہ لکھ رہا تھا تو
ریاستی کاروبار اور سماجی حالات میں تضاد پایا جاتا تھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ لیسنگ نے اس مزاحیہ ڈرامے کی شکل
میں طاقت کے جائز و ناجائز اِستعمال کو اسٹیج پر واضح کیا تھا جو اس
کا پہلا حملہ تھا۔ دُوسرا حملہ ایک ٹریجڈی (المیہ) کے ذریعے کیا گیا جس
کا نام "امیلیا گلوٹی" تھا۔ یہ حملہ بہت سخت اور براہِ راست تھا۔
شہزادہ امیلیا پر قابض ہونا چاہتا ہے جس کی شادی عنقریب ہونے
والی ہے۔ شہزادے کے محل کا داروغہ، جو امیلیا کے منگیتر سے
نفرت کرتا ہے، اس کے اغوار کی تدبیر عمل میں لاتا ہے چنانچہ اس
کا منگیتر مار دیا جاتا ہے۔ خاندان والوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شہزادہ
اس معاملے کی پُشت پر ہے۔ لیکن امیلیا کا باپ ایک کشمکش میں
پڑ جاتا ہے اور سوچتا ہے کہ اگر وہ شہزادے کو مار ڈالے تو اس
کے دلی جذبات کی خلاف ورزی ہو گی اور اس عقیدے کی بھی
جس کی اسے تربیت دی گئی ہے۔ لہٰذا اپنی بیٹی کو بد قسمتی سے

محفوظ کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے ختم کر دیا جائے۔ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہ رہنا اس معاشرے پر ایک خوفناک طنز ہے جس نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیزنگ طنز کرنے ہی پر قناعت کرتا ہے۔ وہ اس کا مطالبہ نہیں کرتا کہ ریاست کو بالکل ختم کر دینا چاہیے اور اس کے بجائے آئینی حکومت کو کچھ اور ہونا چاہیے جو مہذب معاشرہ پیدا کر سکے۔ لیکن ہم اگر یہ سوچیں کہ امریکہ کی جنگِ آزادی ۱۷۷۵ء میں شروع ہوئی اور فرانسیسی انقلاب ۱۷۸۹ء میں آیا تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ لیزنگ کچھ ایسی باتوں کے متعلق نہیں لکھ رہا تھا جو سرے سے اس زمانے کے محسوسات سے غیر متعلق تھیں۔

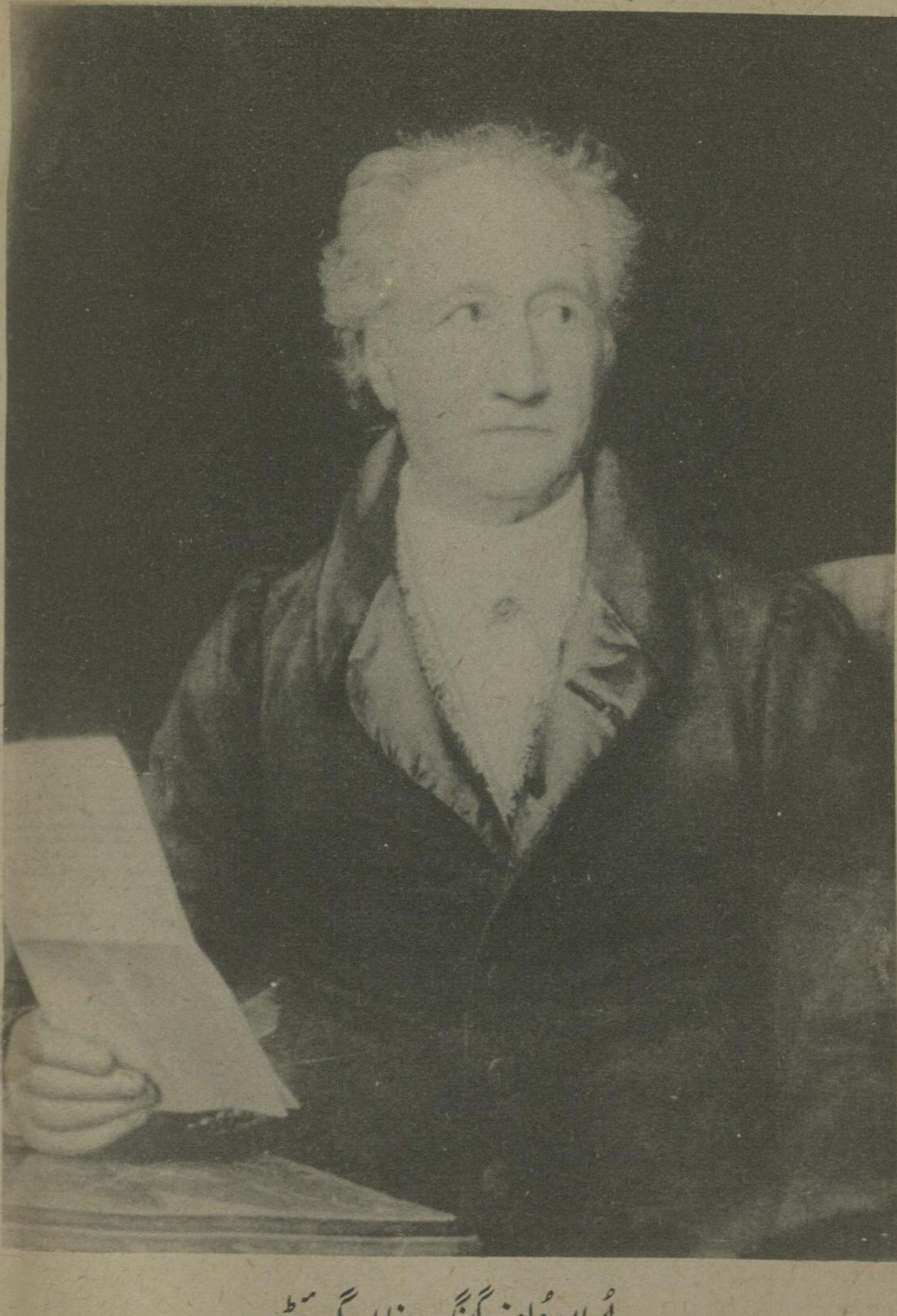
لیزنگ کی تحریروں کا انسانی پہلو اس کے آخری اسٹیج ڈرامے سے واضح ہوتا ہے جو ۱۷۷۹ء میں لکھا گیا ہے اور جس کا نام "ناتھن دی وائز" (عقل مند ناتھن) تھا۔ سلطان کو روپیہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ وہ ناتھن یہودی کو طلب کرتا ہے۔ اس کا شریفانہ اخلاق لیزنگ نے اپنے ایک دوست "موزیز میڈلزان" یہودی فلسفی کے اخلاق کے مطابق دکھایا ہے جس نے جرمنی کے یہودیوں کی تحریکِ آزادی شروع کی تھی۔ سلسلۂ گفتگو میں سلطان ان اسباب کو دریافت کرتا ہے جن کی بنا پر "ناتھن" "عقلمند" کے نام سے مشہور ہے، پھر کہتا ہے کہ اسلام، عیسائیت اور صیہونیت، تینوں مذاہب میں سے صرف ایک ہی سچّا ہو سکتا ہے۔ اس پر ناتھن اسے تین انگوٹھیوں کا قصّہ سُناتا ہے۔

کسی زمانے میں ایک آدمی کے پاس ایک انگوٹھی تھی جس کی قیمت دُنیا کی تمام چیزوں سے زائد تھی۔ اس میں جو پتھر لگا تھا وہ دُودھ کی طرح سفید تھا اور اس میں ایک سو خوش نما رنگ دکھائی دیتے تھے۔ اس انگوٹھی میں یہ تاثیر تھی کہ جو اس کو پہنتا وہ خدا اور انسان دونوں کی نظر میں بھلا معلوم ہوتا۔ مرتے وقت وہ اس انگوٹھی کو اپنے چہیتے بیٹے کے لیے چھوڑ گیا اور وصیّت کر گیا کہ وہ بھی اسی طرح انگوٹھی کو اپنے بیٹے کے حوالے کر جائے۔ چنانچہ انگوٹھی نسلاً بعد نسلٍ چلتی رہی جو اس کو پہنتا وہ خاندان کا سربراہ ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک باپ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ تین بیٹوں میں سے اسے کون سب سے زیادہ پیارا ہے؟ اس نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ کسی کاریگر کو بُلا کر اس انگوٹھی کی دو نقلیں تیار کرائی جائیں، ہر بیٹے کو ایک ایک انگوٹھی دے دی جائے اور نیک انجام کی توقع رکھی جائے۔ آخر اس کے انتقال کے بعد ہر ایک بیٹے نے اپنی اپنی انگوٹھی دکھائی اور دعویٰ کیا کہ خاندان کا سربراہ بننے کا مستحق ہے۔ اس پر سخت جھگڑا شروع ہو گیا مگر ان انگوٹھیوں کا فرق معلوم نہ ہو سکا۔ اس کے بعد ناتھن کہتا ہے کہ سچّے مذہب کو دریافت کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے۔ سُلطان اعتراض کرتا ہے۔ "جن مذاہب کا تم نے نام لیے ہیں ان کو لباس اور دُوسری قسم کی زیب و زینت سے پہچانا جا سکتا ہے۔" ناتھن جواب دیتا ہے۔ "بلاشبہ یہ ممکن ہے لیکن ان بُنیادوں کی بنا پر نہیں جو تاریخ

میں دفن ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ کون سا مذہب صحیح ہے۔" وہ اسی تسلسل میں کہتا چلا جاتا ہے۔ "تمھیں اِس بات سے اتّفاق کرنا چاہیے کہ تاریخ کی سچائی پر ہمارا اعتماد مذہب کی بنیادوں پر ہے اور اِس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ۔ خود عیسائیت کو لے لیجیے۔ اس میں کس کا خون ہے؟ اس کا، جس نے اوائل عمری سے عیسائیوں کو اپنی محبّت کی نشانیاں فراہم کیں؟ وہ جس سے انھیں کبھی مایوسی نہیں ہوئی، میں کس طرح اپنے اجداد سے اس سے کم محبّت کر سکتا ہوں جتنی تم اپنے آبار سے کرتے ہو۔ سچ بتاؤ کیا تم اپنے اجداد کو جھوٹا کہہ سکتے ہو؟ سلطان کو ماننا پڑا کہ کہ یہ صحیح ہے۔ اور مزید وضاحت طلب کرنے پر اسے جواب ملتا ہے کہ جب وہ تینوں بھائی اس مسئلے کو جج کے سامنے لے گئے تو اس نے ان سے کہا کہ بلاشبہہ ان کے باپ کی یہ خواہش تھی کہ دوسری دو انگوٹھیاں ایک انگوٹھی کے ظلم سے محفوظ رہ سکیں۔

مذہبی رواداری کی اس سے بڑی تائید سوچنا مشکل ہے جس کو لیزنگ نے ان پُر مغز الفاظ کو یہودی ناتھن کی زبانی ادا کرا کے اور زیادہ پُر زور بنا دیا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اِس کی کہانی کا کوئی تعلّق آج کی دُنیا سے نہیں ہے؟

(جرمی لین)



یُوہان وُلف گینگ فان گوئٹے
عظیم شاعر، ادیب اور مُفکّر

یوہان ولف گینگ فان گوئٹے

عظیم شاعر

(۱۷۴۹ء - ۱۸۳۲ء)

ادیب اور مُفکّر

یوہان ولف گینگ فان گوئٹے، جرمنی کا سب سے بڑا مصنّف گزرا ہے، اس کی خود نوشت سوانح عمری ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔"میں ۲۸ راگست ۱۷۴۹ء کو دوپہر کے بارہ بجے فرینکفرٹ اون میں پیدا ہوا جو دریائے مین کے کنارے واقع ہے۔" جو لوگ اس کی ماں کے پاس موجود تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ مُردہ ہے۔ آخر سخت جدّوجہد کے بعد ہی اس کی آنکھیں کھُل سکیں۔ وہ اپنی بے نظیر خوبیوں کا احساس کرتے ہوئے اپنی سوانح عمری" پوئٹری اینڈ ٹرُتھ" (شاعری اور صداقت) میں، جو اپنی نوعیت کی نہایت اہم تصنیف ہے، لکھتا ہے کہ اس کی پیدائش کے وقت ستارے موافق تھے۔ اور اس کی پیدائش یورپ کی عظیم رُوحوں میں سے ایک رُوح کی پیدائش تھی۔ جس کا مقابلہ شیکسپیئر، ڈانٹے یا لیونارڈو ڈاونشی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ ۱۷۴۹ء میں فرینکفرٹ فرانس کی روشن خیالی کے نظریات سے متأثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہاں کی زندگی نے پُرانے رشتوں سے علیحدگی بھی اختیار نہ کی۔ فرینکفرٹ میں ایک

عوامی بیداری تھی لیکن معاشرہ اب بھی جاگیردارانہ طرز کا تھا۔ تجارتی میلوں کے سبب اطراف و جوانب سے روابط پیدا ہو گئے تھے تاہم یہودیوں میں روایات کا سختی سے احترام کیا جاتا۔ بازار کھلے ہوئے ہوتے اور خانقاہیں بند۔ کم عمر گوئٹے کے نمو پذیر دماغ پر ان تمام باتوں نے اثر کیا۔ گوئٹے ایک ایسے باپ کا بیٹا تھا جو ایک کاریگر خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر آخر میں ترقی کر کے امپیریل کونسل کا ممبر ہو گیا تھا۔ اس کی ماں وکیلوں کے ایک خاندان سے متعلق تھی۔

گوئٹے ان تین شخصیتوں میں سب سے پہلے پیدا ہوا جنھوں نے آگے چل کر جرمنی کا نقشہ بدل دیا۔ باقی دو شخصیتوں میں شیلر ۱۷۵۹ء میں اور نپولین دس سال بعد پیدا ہوا۔ اپنی بیاسی سالہ زندگی میں گوئٹے نے جرمن "ریخ" (پارلیمنٹ) کو ختم ہوتے دیکھا جو قرونِ وسطیٰ سے چلی آ رہی تھی۔ امریکہ کی جنگِ آزادی کا مشاہدہ کیا۔ فرانس کا انقلاب، نپولین کا عروج و زوال اور آخر میں ۱۸۳۰ء میں پیرس کا انقلاب دیکھا، جس میں عوام نے پہلی مرتبہ ایک طبقے کی حیثیت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا۔ شیکسپیئر جیسے اہلِ قلم کی زندگی کی تفصیلات میں ایسے حالات کو زیادہ اہمیت نہیں ہے مگر گوئٹے کے متعلق ان کا تذکرہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اس کی زندگی کی تحریروں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں ایک ہی جیسے دلچسپ ہیں اور بالکل سچ کہا گیا ہے کہ اس کی زندگی فن کا عظیم ترین نمونہ ہے۔

گوئٹے کی پرورش اس گھرانے میں ہوئی تھی جہاں فریڈرک اعظم کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، البتہ شہر کی رائے عامہ کچھ اور تھی۔ اس کی تعلیم پہلے لیپزگ میں ہوئی پھر اس کو اسٹرسبرگ میں بھیج دیا گیا جہاں اس میں مشاہدے اور تحقیق کا شوق پیدا ہوا جس کا اظہار اس نے بعد میں کیا لیکن ان دونوں میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی کیونکہ اس کا مضمون قانون تھا۔ لیپزگ میں بھی اس کو صرف ادب کے مسائل سے دلچسپی تھی لیکن جب وہ اسٹرسبرگ پہنچا تو اس نے علمِ کیمیا، اور علم الابدان کے لکچروں میں بھی شرکت کی۔ ڈراموں کا شوق شیکسپیئر کے پڑھنے کے بعد ہوا۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے ایک ڈرامہ لکھا جس سے وہ تمام جرمنی میں مشہور ہوگیا۔ اس ڈرامے کا نام "گوزفان برلی شنگین" تھا جو جرمنی کے دہقانوں کی جنگ کے ایک بہادر کی کہانی تھی ـــــ یہ وہ دور تھا جب اصلاحات کا دھارا تیزی سے بہہ رہا تھا اس دھارے کو دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ لوتھر نے روانی بخشی تھی۔ کسان بڑی شدّت سے سماجی تبدیلی کا مطالبہ کر رہے تھے۔

لیپزگ میں وہ پہلی دفعہ محبّت سے روشناس ہوا۔ اس نوعیت کا دوسرا شدید تر واقعہ اسٹرسبرگ میں رونما ہوا۔ فرینکفرٹ واپس ہونے پر اس کی منگنی ہوگئی۔ اس طرح روابط کا وہ سلسلہ شروع ہوگیا جو زندگی بھر چلتا رہا۔ ان ہی روابط نے مؤرخین، مفسّرین اور مصنفین کے لیے تنقید و تفتیح کا کافی مواد فراہم کر دیا۔ درحقیقت جو عورتیں گوئٹے کی

زندگی میں داخل ہوئیں، وہ بذاتِ خود ایک داستان ہیں۔ اُنھوں نے وہ جذباتی کشمکش پیدا کر دی جس کا اظہار بعد میں الفاظ کے ذریعے ممکن ہو سکا۔

قانون کی تعلیم ختم کر کے گوئٹے نے ویزلر کی سپریم کورٹ میں مُلازمت اِختیار کر لی اور وہاں ایک دوست کی منگیتر سے دوستی کا رِشتہ استوار کر لیا۔ حالانکہ اس عورت نے آخر میں اسی شخص سے شادی کی جس سے اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اس واقعے سے متاثر ہو کر گوئٹے نے ایک ناول "دی سارو ز آف ینگ ورد ھر" (جوان وردھر کے آلام) کو خطوط کے ذریعے ترتیب دیا۔ نپولین اس کے بڑے مدّاحوں میں سے تھا اور کئی مرتبہ اسے پڑھ چکا تھا جیسا کہ اس نے گوئٹے سے اپنی مخصوص ملاقات میں کہا جو ارفرٹ میں ہوئی تھی۔ یہ ناول چھپنے کے بعد بہت کامیاب ہوا اور صرف پچیس سال کی عمر میں گوئٹے کا شمار اپنے زمانے کے ممتاز لکھنے والوں میں ہونے لگا۔

اس کے بعد ہی وہ اپنی زِندگی کے ایک فیصلہ کُن مرحلے سے دوچار ہوا۔ شہزادگان جرمنی کے ایک چھوٹے شہزادے سیکسینی ویمرایزنخ کے ڈیوک کارل آگسٹ نے اسے ویمر آنے کی دعوت دی۔ کارل آگسٹ اپنے مہمان سے کوئی آٹھ سال چھوٹا ہو گا مگر اسے اس مشہور اہلِ قلم سے بات چیت کرنے کی بڑی تمنّا تھی۔

ویمر میں گوئٹے کا قیام پہلے تو ایک مختصر عرصے کے لیے تھا پھر یہ زندگی بھر کا ہو گیا۔

گوئٹے ۱۷۷۶ء میں ویمر پہنچا جس کی آبادی کوئی چھ ہزار تھی۔ وہاں وہ ۱۸۳۲ء میں اپنے انتقال تک مقیم رہا۔ اس عرصے میں اس نے مختلف مقامات کے چند دورے کیے، ایک مدّت تک اٹلی میں رہا، باقی وقت ویمر ہی میں گزارا۔ وہاں اس کا تقرر حکومت کے ایک ذمّہ دار عہدے پر ہو گیا تھا اور وہ پریوی کونسلر اور وزیر بن گیا تھا۔ محکمۂ جنگ کی سربراہی اور کانوں کی ذمّہ داری بھی اسی پر تھی۔ وہ بڑی تن دہی سے کام کرتا اور ڈیوک کو خارجی مسائل پر بھی مشورے دیتا تھا حالانکہ اس سلسلے میں اس نے کسی کامیاب سُوجھ بُوجھ کا مُظاہرہ نہیں کیا۔ نپولین کے یورپ پر تسلّط کے دور میں وہ ڈیوک کو اس کی مخالفت کی رائے دیتا رہا۔ اور اس کے برعکس جب یورپ کی بڑی طاقتیں اس کے استیصال کی تیّاریاں کر رہی تھیں تو وہ اس کی مدد کرنے کا حامی تھا۔ وہ ویمر کے تھیٹر کا ڈائرکٹر بھی تھا اور پروڈکشن کے نئے نئے طریقے نکالتا تھا۔

ویمر اس کے مُستقل قیام سے کافی متاثر ہُوا۔ بعض ممتاز لوگوں نے صرف اِس کی وجہ سے قصبے کے قرب و جوار میں رہائش اختیار کر لی۔ اس طرح یہ چھوٹی سی جگہ جرمنی کا روحانی مرکز بن گئی،

جہاں اس نے فریڈرک شیلر کے ساتھ ادب میں جرمن کلاسیکی طرز
طرز کی بنیاد ڈالی جو آج بھی پہلے ہی کی طرح معروف ہے۔ گوئٹے کو
اپنے بہت سے ہمعصروں کی طرح اٹلی جانے کی بڑی خواہش تھی۔
ڈیوک نے بڑی فراخ دلی سے اسے دو سال کی اجازت دے دی
اس وقفے میں اس نے پوری طرح اس اٹلی کو سمجھا جو صرف
مصوروں کا ہی شہر نہ تھا بلکہ جہاں اور بھی بہت کچھ پایا جاتا تھا۔
اس نے وہاں جو یونانی عجائبات دیکھے، ان سے بہت متاثر ہوا
اور آگے چل کر یوروپی ثقافت کے ماخذوں اور دیگر یعنی جرمنی کے
مابین ایک رابطے کا سبب بنا۔ اس طرح گوئٹے نے جرمن تصورات
کی تاریخ پر بڑے اہم اثرات مرتب کیے۔ قدیم دنیا کے ورثے
میں ایک تازہ روح پھونک دی اور اپنی تصانیف کو مکمل کر کے
جرمنی کو وہ امتیاز بخشا جو اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوا۔
گوئٹے بچپن ہی سے شعر کہتا تھا۔ ہر نئے تجربے سے ایک
نئی نظم ابھر آتی۔ جرمن زبان میں گوئٹے کے اشعار سے برتر
خوب صورت، کیف انگیز اور پُر مغز شعر کم ہی پائے جاتے تھے۔
اس نے نظم کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر قسم کے جذبات کی ترجمانی
کر سکے۔ اس کے ہمعصر جلد ہی اسے اولمپس کے دیوتا کی طرح
ماننے لگے اور انتقال کے وقت تک اس کی تصانیف چالیس تک
پہنچ گئیں۔ نظموں اور ڈراموں میں چند کے نام ہیں۔ اگمانٹ ٹسو

اور انی جنائی۔ ناولوں میں تعلیم پر ایک ناول ولہم میسٹر ہے۔ مضامین اور تنقیدی کتابیں ان پر مستزاد ہیں۔ بڑی غیر معمولی بات یہ ہے کہ کم ہی کسی شخص میں اتنی قوّت ہو سکتی ہے کہ وہ ایسی قیمتی تخلیقات کر سکے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے انتظامی فرائض کو بھی پورا کرتا رہے۔

گوئٹے کو صرف ایک وزیر، مصنّف اور ایک زندگی کا مصوّر سمجھنا زیادتی ہوگی۔ وہ ایک ممتاز فطری سائنس داں بھی تھا۔ جس نے رنگ کے ایک ایسے نظریے کو بھی دریافت کیا۔ جو نیوٹن سے بالکل مختلف تھا اور اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس کا نظریہ نفسیاتی تھا جب کہ نیوٹن ان کو بالکل مادّی حیثیت سے دیکھتا تھا۔ اس نے جبڑے کو جوڑنے والی ہڈّی کو بھی دریافت کیا۔ معدنیات کا مطالعہ بھی کیا، موسمیات میں بھی دلچسپی لی اور حیوانیات کے میدان کو بھی وسیع کیا۔ بہت سے ثقافتی مؤرخین اس کی کتاب "میٹا مارفوسس آف پلانٹس (پودوں کی تبدیلی) کو، جو ۱۷۹۵ء میں شائع ہوئی، جرمنی میں ایک نئے سائنسی دور کا آغاز گردانتے ہیں۔ کتنا ہمہ گیر تھا اس کا ذہن! تحریر کے میدان میں گوئٹے کا یہ عظیم ترین کارنامہ "فاسٹ" اور ویسٹ ایسٹ دیوان کا تذکرہ ہے۔ "فاسٹ" کے نفسِ مضمون سے وہ تمام عمر دلچسپی لیتا رہا۔ فرینکفرٹ میں وہ ایک جوان لڑکی کی پھانسی کے وقت ایک

ایڈووکیٹ کی حیثیت سے موجود تھا۔ اس واقعے کو اس نے قرونِ وسطیٰ کے جرمنی کے ایک پروفیسر کے قصّے سے متعلق کر دیا۔ جس کی خواہش تھی کہ وہ خدا کو دریافت کرے۔ یہ پروفیسر جس کا نام "فاسٹ" تھا، شیطان کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ ہمیشہ نئی نئی دریافتوں میں لگا رہے گا اور مرتے دم تک دُنیا کی نئی قدروں تک پہنچنے کی سعی ترک نہیں کرے گا۔ اس مواد سے گوئٹے نے جرمن زبان کا عظیم ترین کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کا مقابلہ ڈانٹے کی "ڈوائن کامیڈی" (خدائی کامیڈی) سے کیا جا سکتا ہے اور جب "فاسٹ" مرتا ہے تو آسمانی طاقتیں اس کو خوش آمدید کہتی ہیں۔ یہ اشارہ ہے آج کل کے انسان کی بے چینی کی طرف۔

ضعیف العمری میں گوئٹے نے مشرق کی طرف توجہ دی۔ اس زمانے میں وہ زندگی کے افکار سے آزاد تھا۔ گوئٹے اوائل عمری ہی سے اسرائیل میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے قرآن بھی پڑھا تھا اور فارسی شاعر حافظ کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ نپولین کے محاصرۂ مصر نے مشرق کے ساتھ ایک عام لگاؤ پیدا کر دیا تھا اور ۱۸۰۸ء میں جب فریڈرک شلیگل کی کتاب ہندوستان کی فراست اور زبان پر شائع ہوئی تو اس کی توجّہ ہندوستان کی جانب مبذول ہو گئی۔ ۱۸۱۴ء میں اس نے نظم کا ایک بڑا مجموعہ ترتیب دیا، جو

ذہانت اور بے پناہ علم سے بھرا ہُوا تھا۔ اس طرح خود اس کے قول کے مُطابق دُنیا کے ادب کا پہلا باب تخلیق ہو گیا۔ جو مشرق و مغرب دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

" مشرق خدا کا ہے، مغرب خدا کا ہے، شمال اور جنوب کے علاقے امن وسلامتی کے ساتھ خدا کے ہاتھوں میں ہیں۔"

۲۲ر مارچ ۱۸۳۲ء کو ایک طویل زندگی گزار کر ویمر میں اس کا اِنتقال ہو گیا۔ اس کے آخری الفاظ ایک افسانے کی طرح مشہور ہیں۔" زیادہ روشنی ——— !"

(ڈاکٹر جارج گسمن)

بیرن فام اُنڈرزم اسٹائن

(۱۷۵۷ء — ۱۸۳۱ء) جرمنی کا دردمند مدبّر

اٹھارویں صدی کے اواخر میں پرشا کی فوج کو یورپ میں بڑی وقعت کی نظر دیکھا تھا حالانکہ انیسویں صدی کے اوائل کی ایک جنگ نے اس کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ ۱۴ اکتوبر ۱۸۰۶ء کو نپولین نے جینا کے مقام پر اس کے پرخچے اُڑا دیے اور اسی سال ۲۷ اکتوبر کو پرشا کے دارالحکومت برلن میں داخل ہوگیا۔ پرشا کا بادشاہ فریڈرک ولیم سوم مُلک کے مشرقی حِصّوں کی طرف پیچھے ہٹ گیا تاکہ روسیوں کے ساتھ مل کر جنگ جاری رکھ سکے لیکن اگلے سال فرائڈ لینڈ میں نپولین نے رُوسیوں پر بھی ایک ضرب کاری لگائی۔ اِس کے بعد صُلح نامہ ٹِلسٹ میں جو شرائط عائد کی گئیں وہ پرشا کے لیے بہُت سخت تھیں۔ اس کو دریائے ایلبے کے تمام مغربی علاقوں سے محرُوم کر دیا گیا۔ پولینڈ کے بعض حِصّے بھی اس سے چھن گئے اور سیکسنی کو دے دیے گئے۔ سیکسنی ان جرمن ریاستوں میں سے تھی جو نپولین کا ساتھ دے رہی تھی۔ پرشا کو بھاری ہرجانہ دینا پڑا اور اس کی فوج بیالیس ہزار تک محدُود کر دی گئی۔ یہ شکست

قدرتی طور پر ممتاز لوگوں کے لیے باعث تعجب تھی اور وہ سوچنے لگے کہ غلطی کہاں پر ہوئی ہے ؟

اس سلسلے میں ایک خاص شخصیت کارل بیرن فام اُنڈزم اسٹائن کی تھی جو ۱۸۵۷ء میں جرمنی کے مغربی علاقے میں دریائے رہن کے کنارے نزاؤ میں پیدا ہُوا تھا۔ اس نے پرشا کے ایک وزیر کی حیثیت سے ۱۸۰۴ء میں کسٹم اور ٹیکس کے طریقوں کو بہتر بنایا اور کئی دُوسری اصلاحات کی تجویزیں بھی پیش کیں جن سے ریاست زیادہ وسیع بُنیاد پر استوار ہو سکے۔ اس زمانے میں پرشا کا طرزِ حکومت یہ تھا کہ بادشاہ کی ایک مشاورتی کونسل ہوتی تھی جو حکومت کو مشورہ دیتی تھی لیکن خود کسی کے سامنے جواب دہ نہ تھی۔ بیرن فام انڈزم اسٹائن نے وقتی طور پر ایسی کونسل کو ختم کر دینے کی تجویز پیش کی تو بادشاہ نے اس کا اُلٹا اثر لیا اور یہ رائے قائم کی کہ فام اسٹائن اس کے اختیارات محدود کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے انتہائی ذلّت کے ساتھ برخاست کر دیا اور جنوری ۱۸۰۷ء میں اس کے نام ایک حکم جاری کیا جس میں لکھا " مجھے انتہائی افسوس ہے کہ میں تمھیں ایک باغی، نافرمان، ضدّی اور عدول حکمی کا مرتکب ریاستی ملازم قرار دینے پر مجبور ہوں جس نے اپنی ذہانت اور قابلیت کے زعم میں مفادِ ریاست کو بھلا دیا ہے اور جس کا عمل صرف واہمہ جذبات، ذاتی عناد و نفرت کا تابع ہے۔

فام اسٹائن چلا گیا لیکن آٹھ ماہ بعد پھر واپس بُلا لیا گیا کیونکہ ٹِلسٹ میں نپولین نے بادشاہ سے وزیر اعلیٰ ہارڈنبرگ کی علیحدگی پر اصرار کیا تھا اور اس کے بجائے فام اسٹائن کا نام لیا تھا۔ بات یہ تھی کہ بادشاہ سے اس کے اختلافات کی بنا پر نپولین کو اُمید تھی کہ ان کی نہ نبھے گی اور جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

فام اسٹائن ریاست کو بالکل تباہ ہونے سے بچانے کے لیے بعض اصلاحات کو ناگزیر سمجھتا تھا۔ وہ مُسلسل ایک گہری فِکر میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور اسی لیے اس نے اس مطلق العنانی کے اصُول پر ایک ضرب کاری لگائی تھی جس کی رو سے بادشاہ کِسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوتا تھا۔ وہ یہ محسُوس بھی کرتا کہ پریشان لوگوں کو اپنی وقعت کا احساس دلانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیے۔

فام اسٹائن کی بُنیادی خواہش یہ تھی کہ وہ خود مختار اور ذمّہ دار لوگوں کی ایک ایسی قوم تعمیر کر دے جو اپنے مسائل میں مستعدی کے ساتھ حِصّہ لیں۔ اِن خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے مختلف اقدامات کیے۔ ۹ اکتوبر ۱۸۰۷ء کو ایک فرمان کی رو سے مختلف طبقاتی مراعات ختم کرا دیں۔ امرا کو اجازت دے دی کہ وہ متوسّط طبقے کے صنعت و حرفت کے پیشوں میں حِصّہ لے سکتے ہیں۔ ہر ایک کو زمین کی خریداری کا حقدار کر دیا اور

۱۱ر نومبر ۱۸۱۰ء کے بعد تمام کسانوں کو آزادی دے دی۔ کیونکہ اب تک وہ غلاموں جیسی زندگی بسر کر رہے تھے اور عملاً زمینداروں کی ملکیت تھے۔

نومبر ۱۸۰۸ء میں قصبوں کے انتظام کے متعلق ایک اقدام کیا گیا، میونسپلٹیوں کو انتظامی اختیارات دے دیے گئے۔ وہ بجبٹ بنانے، ٹیکس لگانے، غریبوں کی امداد اور تعلیمی امور میں خود مختار کر دی گئیں۔ شہریوں کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق دیا گیا۔ ریاست کو اگرچہ دخل اندازی کا حق تھا پھر بھی حقیقتاً یہ طرز نمایندگی آزادانہ تھا اور فرانسیسی انقلاب کے نظریات کے لگ بھگ پہنچ چکا تھا۔ مرکزی ریاست کی اصلاح کی تحریک ایسے وزیروں کے ذریعے ہوئی جن کی ذمہ داریاں وزیرِ اعظم کے سپرد کر دی گئیں تاکہ اگر بادشاہ ناکام ہو جائے تو اس کے نتائج زیادہ مضر نہ ہوں۔ فرانسیسی ان تبدیلیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے اور پرشا کے امراء ایک تشویش میں پڑ گئے تھے ـــــ بیرن فام اسٹائن نے ایک غلطی یہ کی کہ زیادہ احتیاط سے کام نہ لیا اور ایک خط میں لکھ دیا کہ اس کا قطعی منشا ریاست کو اتنا مضبوط کر دینے کا ہے کہ وہ فرانسیسیوں کے مقابلے میں اُٹھ کھڑی ہو۔ یہ خط فرانسیسی خفیہ پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور نپولین نے فام اسٹائن کی برخاستگی کا مطالبہ کر دیا۔ آخر نومبر ۱۸۰۸ء میں بادشاہ اس پر راضی ہو گیا۔ فام اسٹائن کو ملک

چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ نپولین نے اسے قانون کی حفاظت سے محروم کر دیا تھا۔

اس کی جگہ کارل آگسٹ پرنس فان ہارڈنبرگ کا تقرّر عمل میں آیا مگر وہ بھی انھیں خطوط پر کام کرتا رہا۔ اس کے زمانے میں کاروبار کو آزادی دی۔ انصاف پر مبنی ٹیکس کا طریقہ رائج کیا گیا اور یہودیوں کو مکمل طور پر دوسرے شہریوں کے برابر درجہ عطا کیا گیا۔ دہقانوں پر جو پابندیاں باقی رہ گئی تھیں ان کو بھی ختم کر دیا گیا۔

بات یہ تھی کہ فان اسٹائن کا ایک ذاتی دوست وہاں موجود تھا جو اس کے خیالات کو عملی جامہ پہناتا تھا۔ اس کے ذمّہ فوج کی تنظیم کا کام تھا اور وہ ایک فوجی کمیشن کا سربراہ بھی تھا جس میں ایک دوسرا مشہور جرنیل نائی لات فان نائزنا بھی شامل تھا۔ شارن ہورسٹ کا خیال تھا کہ وہ فوج میں فان اسٹائن کے اصول ذمّہ داری کی تکمیل کرے۔ لہٰذا اس نے طے کیا کہ پرشا کے ہر شخص کے لیے فوج کی ملازمت ضروری قرار دے دی جائے اور کرائے کی فوج، جو بُری طرح ناکام ہو گئی تھی، ختم کر دی جائے۔ لیکن عام لام بندی ممکن نہ تھی۔ کیونکہ فوج کی تعداد بیالیس ہزار سے تجاوز نہ کر سکتی تھی۔ اس لیے شارن ہورسٹ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ لوگوں کو طلب کیا جائے، انھیں تربیت دی جائے اور گھر بھیج جائے۔ پھر ان کی جگہ نئے رنگروٹ بُلا لیے جائیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ ایک تربیت یافتہ

محفوظ فوج بن گئی۔

فوج میں جسمانی سزا کو بھی ختم کر دیا گیا اور غیر اُمرا کو بھی افسر بننے کی اجازت دے دی گئی۔ اس طریقے پر پرشا کے عوام من حیث القوم فوجی بن گئے اور ۱۸۱۳ء میں نپولین کے خلاف بغاوت ممکن ہوگئی۔ فام اسٹائن بذاتِ خود پہلے آسٹریا گیا پھر زارِ رُوس کی دعوت پر سینٹ پیٹرزبرگ چلا گیا۔ رُوس میں ہی نپولین کی فوجی طاقت کا قطعی طور پر خاتمہ ہونا تھا۔

نام نہاد برِّ اعظمی نظام، برطانوی سامانِ تجارت پر مکمل پابندی، جو نپولین نے لگائی تھی، ان سب کا مقصد شہتیر اور غلّہ کی رُوسی برآمدات کو روکنا تھا جس سے سخت اقتصادی مشکلات پیدا ہو گئیں اور روس نے ان پابندیوں پر عمل کرنے سے اِنکار کر دیا۔ نتیجہ یہ نِکلا کہ نپولین کو روس پر حملے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

پرشا کے بادشاہ سے کہا گیا کہ وہ اِس حملے کے لیے سپاہی فراہم کرے۔ اس خبر سے پرشا کے اکثر فوجی افسروں نے رُخصت لے لی اور رُوس چلے گئے۔ آخر فرانس کی فوجیں آگے بڑھیں۔ ان کی پیشقدمی سے رُوسی فوجیں پیچھے ہٹتی چلی گئیں اور نپولین کو ملک کے اندرونی حِصّوں میں گھسنا پڑا۔ ماسکو فتح کر کے وہ شہر میں داخل ہو گیا اور اس طرح پانچ ہفتے گزر گئے۔ نپولین کسی مصالحانہ بات چیت کا اِنتظار کر رہا تھا لیکن، ادھر سے کوئی پیش کش نہ ہوئی بلکہ زار نے، فام اسٹائن

کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ہار ماننے سے اِنکار کر دیا۔ اس عرصے میں فوج کا بڑا حصہ سردی سے متاثر ہو کر ضائع ہو گیا تھا۔ لہٰذا پانچ ہفتے بعد ہی فرانسیسیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب روسی سپاہیوں نے آگے بڑھنا شروع کیا اور مشرقی پرشا میں داخل ہو گئے۔ فام اسٹائن ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ پرشا کی فوج جنرل یارک فان وارٹنبرگ کی کمان میں تھی جو روسیوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے کچھ کر سکتی تھی مگر جنرل نے لوڑوگن کے مقام پر ان کے ساتھ جنگ سے علیحدہ رہنے کے معاہدے پر دستخط کر دیے —— وہ سمجھتا تھا کہ یہ فائدہ اُٹھانے کا وقت ہے، ایسے موقعے بار بار نہیں آتے، اسے اس وقت روس کے بجائے فرانس سے لڑنا چاہیے جو اس کا اصل دُشمن ہے۔ چنانچہ مشرقی پرشا بآسانی قبضے میں آگیا اور فام اسٹائن زار کے احکام لے کر اس کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے جا پہنچا۔ اب اس نے ہر شخص کو ظالم کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کی دعوت دی اور ۵ فروری ۱۸۱۳ء کو ایک فیصلہ کر لیا گیا۔ یہ نپولین کے خلاف جرمنی میں عوامی بغاوت کی ابتدا تھی۔

پرشا کا بادشاہ، ان حرکتوں سے جو اس کی مخالفت میں کی گئی تھیں، سخت غصّے میں تھا۔ وہ کسی عنوان فرانس کے ساتھ بگاڑ نہ چاہتا تھا لیکن عوام کی مرضی کچھ اور تھی۔ جنگ کی تیّاری کے احکام جاری ہو چکے تھے لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ فوجوں کو کس مُلک کے

خلاف استعمال کیا جائے گا۔ بہر حال فام اسٹائن رُوس کے ساتھ ایک صلحنامہ کا متن لے کر حاضر ہو گیا تھا۔ عوامی جذبہ یہ تھا کہ اگر بادشاہ اس پر دستخط نہ کرے تو اسے تخت سے اُتار دیا جائے مگر اس نے دستخط بھی کر دیے اور عوام سے خطاب بھی کیا۔

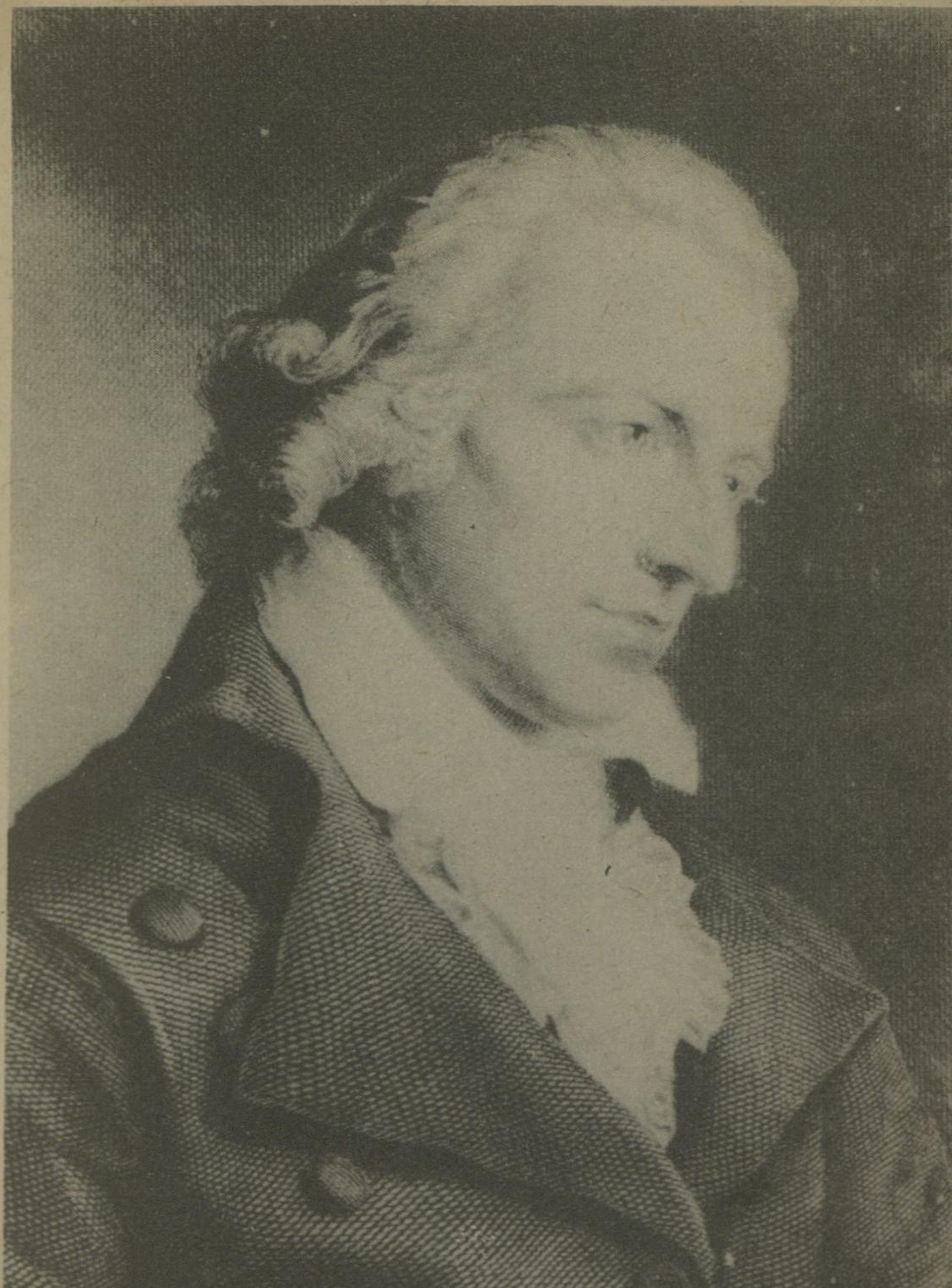
نپولین اب تک پسپا نہ ہُوا تھا۔ وہ اب بھی جنگیں جیت رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد ہی لیپزگ کی ۱۶ راکتوبر سے ۱۹ راکتوبر ۱۸۱۳ء تک کی سہ روزہ جنگ میں اس کی فوجوں کو رُوس، پرشا اور آسٹریا کے سپاہیوں کے ہاتھوں شکست ہو گئی۔

۲۱ راکتوبر ۱۸۱۳ء کی کامیابی کے بعد فام اسٹائن نے اپنی بیوی کو لکھا: "خوف ناک عمارت جو انتہائی دہشت ناک ظلم، کروڑوں انسانوں کے آنسوؤں اور خُون سے تعمیر کی گئی تھی، زمین بوس ہو گئی۔ لوگ جرمنی کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک جرأت کے ساتھ اعلان کر رہے ہیں کہ نپولین بدمعاش ہے اور نسلِ انسانی کا دشمن ہے۔ اس نے جن شرمناک بیڑیوں سے ہمارے ملک کو جکڑ رکھا تھا وہ ٹوٹ چکی ہیں۔

نپولین کو ۱۲ راپریل ۱۸۱۴ء کو اپنے اختیارات سے دست کش ہونا پڑا جس کے بعد فام اسٹائن نے لکھا۔ "جب تک دُوسروں کا خُون بہانا مقصُود تھا، ظالم اس وقت تک بہت فراخ دل تھا۔ مگر اب وہ بُزدل بن چکا ہے، خود اپنے کو مار ڈالنے کی ہمت نہیں کر سکتا اور بہادری کی موت نہیں مر سکتا۔"

حالات بظاہر ٹھیک ہو چکے تھے۔ نپولین کو ایلبا میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ویانا کی کانگریس یورپ کو دوبارہ منظم کرنے والی تھی اور اس کا اجلاس منعقد ہونے والا تھا کہ نپولین ہاتھ سے نکل گیا اور ۲۰ مارچ ۱۸۱۵ء کو پیرس میں داخل ہو گیا جہاں اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ کیونکہ لوگ بادشاہت سے بیزار ہو چکے تھے جسے بحال کر دیا گیا تھا۔ آخر کار برطانوی فوجوں نے ڈیوک آف ولنگٹن کی سرکردگی میں نپولین کو شکست دی اور پرشا کے سپاہیوں نے مارشل بلوخر کے زیرِ کمان اس پر فیصلہ کن ضرب لگائی۔ فام اسٹائن ویانا کی کانگریس میں جرمن نمائندوں میں شامل تھا۔ اس نے جرمن اتحاد اور جرمن زبان بولنے والوں کے متحد ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ تاہم جرمن ریاستوں میں سے ایک اہم ریاست آسٹریا اس سے متفق نہ ہوئی۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے جرمنی کے شہزادے بھی اس کے خواہاں نہ تھے۔ ان کو اپنے حقوق چھن جانے کا خوف تھا۔ لہٰذا سب سے بہتر یہ معلوم ہوا کہ جرمن کنفیڈریشن بنا دیا جائے جس کی رہنمائی دو خاص جرمن ریاستیں پرشا اور آسٹریا کریں۔ اس کے بعد فام اسٹائن منظرِ عام پر نہیں آیا اور ۱۸۳۱ء میں اپنے انتقال تک خاموشی سے زندگی بسر کرتا رہا۔ پرشا میں اس کی اصلاح کا نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ چالیس سال بعد اس نے چانسلر بسمارک کے تحت جرمنی کے اتحاد میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

(ڈاکٹر اے، ڈبلیو، پوسٹ)



فریڈرک شیلر
غیر فانی ڈرامہ نگار اور شاعر

فریڈرک فان شیلر

(۱۷۵۹ء-۱۸۰۵ء) غیر فانی ڈرامہ نگار اور شاعر

"اگر شاہی خدمات کی بجا آوری میں مجھے اپنے باپ کو بھی ختم کر دینے کی ضرورت پیش آتی تو شاید میں اس میں دریغ نہ کرتا مگر ہم سپاہی ہیں، اپنے سپہ سالار کو قتل کرنا ہمارے نزدیک ایسا ناپسندیدہ اور مکروہ گناہ ہے جو کسی طرح بھی قابلِ عفو نہیں۔" ڈی وی روکس کہتا ہے اور پادری ٹیلر اسے آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

"مگر میں تمہارا مذہبی پیشوا ہوں اور تمہیں اس گناہ سے بری الذمہ کرتا ہوں۔" پادری ٹیلر اسے آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔"

ڈی وی روکس اس کی بات کو قبول نہیں کرتا اور انجامِ کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ زیرِ بحث سپہ سالار ویلین اسٹین مار ڈالا جاتا ہے۔ وہ شیلر کے اس کردار کا خاص کردار تھا جس کا نام "ویلین اسٹین کی موت" تھا اور جو سترھویں صدی عیسوی میں اس وقت مکمل ہوا جب جرمنی مذہبی لڑائیاں ہو رہی تھیں۔

اس کھیل میں پیش کیے جانے فوجی افسران اگرچہ مسلّمہ مقاصد کے

مطابق عمل نہیں کرتے مگر کیا کمانداروں کی اطاعت اور وفاداری کا مسئلہ آج بھی افواج میں ایک اہم موضوع کی حیثیت نہیں رکھتا؟

اب ایک اور مثال شیلر کے تیسرے کھیل کی لے لیجیے جس کا نام ہے "سازش اور محبّت"۔ اس میں شیلر اس بات کی حمایت کرتا ہے کہ اس طبقاتی فرق کے باوجود، جو اب بھی موجود ہے، ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کر لے۔

فرڈی نینڈ اٹھارویں صدی عیسوی کے ایک جرمن شہزادے کے صدرِ دربار کا لڑکا ہے۔ صدر اپنی ترقی کا خواہاں ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر اس کا لڑکا شہزادی مل فورڈ سے شادی کر لے تو اس کے لیے بہت مفید ہو مگر فرڈی نینڈ انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایک اور لڑکی سے محبّت کرتا ہے جس کا نام لوئی ملر ہے اور جو ادنیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس پر باپ غضب ناک ہو جاتا ہے۔ بہر حال اس کا سیکرٹری جس کو طنزیہ ورم یعنی جرثومہ کہا گیا ہے وعدہ کرتا ہے کہ وہ فرڈی نینڈ پر اس کی بے وفائی ظاہر ہو جائے۔ ورم اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ دستخط نہ کرے گی تو اس کے والدین گرفتار کر لیے جائیں گے۔ شیلر کے زمانے میں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست میں گرفتار ہونے کا مطلب کیا تھا؟ وہ اس کو اچھّی طرح جانتی تھی۔ نتیجے میں فرڈی نینڈ کو خط مل جاتا ہے جسے پا کر اس کے دماغ پر بڑا برا اثر پڑتا ہے اور اسی جلن

میں وہ لوئی کے مشروب میں زہر ملا دیتا ہے۔ لوئی جب مرنے لگتی ہے تو بتاتی ہے کہ وہ خط جعلی ہے۔ فرڈی نینڈ اپنے باپ کو معاف کر دیتا ہے اور اس جرم کے بدلے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کی نرم دلی سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ریاست کے انصاف کے حوالے کر دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ اُس کو بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے کرتُوتوں کے انجام سے بھاگ نہیں سکتا۔ اختتام اگرچہ مثالی نہیں ہے بلکہ کسی حد تک غیر متناسب ہے۔ پھر بھی اس کھیل میں بعض باتیں بڑی ہی دلچسپ ہیں۔ جرمنی کے درباروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ان کی بدطینتی اور خود غرضانہ سازشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ محبّت جیسے لطیف جذبات کو خود اپنا راستہ تلاش کرنے کی اجازت ہونا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کو بھی واضح کیا گیا ہے کہ محبّت کس آسانی سے نفرت و رقابت میں بدل سکتی ہے۔

فرڈی نینڈ ایک انقلاب پسند ہے۔ وہ اپنے طبقے سے بغاوت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اپنے ماحول میں مقید ہے اور لوئی ملر کو اس طرح نہیں چاہتا جس طرح ملر خود اس کو چاہتی ہے۔ شیلر یہ بات اچھّی طرح جانتا ہے کہ مناسب طاقت کے بغیر سماج سے مُقابلے کے کیا معنی ہوتے ہیں۔

شیلر ۱۰ نومبر ۱۷۵۱ء کو مار بیک میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ جرمنی کے

جنوب میں دریائے "نیکار" کے کنارے واقع ہے۔ اس کا باپ ایک فوجی افسر تھا۔ شیلر کی خواہش تھی کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کرے مگر ۱۷۸۳ء کو جب یہ کھیل پہلے پہل اسٹیج پر دکھایا گیا تو تھیٹر واہ وا کے شور و غل سے گونج اُٹھا۔ کیونکہ کھیل شروع سے آخر تک عملی تھا اور اس میں ناانصافی پر بھرپور حملہ کیا گیا تھا لیکن شیلر نے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ ڈیوک نے اسے آیندہ کے لیے اس قسم کے مزاحیہ کھیل لکھنے کی ممانعت کر دی۔ آخر شیلر نے ریاست سے راہِ فرار اختیار کی اور پھر کئی بار یہ کوشش بھی کی کہ اسے معاف کر دیا جائے مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ فرار اختیار کرنے کے بعد ذرائع معاش کے لیے اس کو پھر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑا جس میں اس کو زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ حالانکہ اس نے اپنے بعض دوستوں کے ساتھ سفر کر کے من ہیم تھیٹر میں ڈراما نویس کی جگہ حاصل کر لی تھی۔ یہ وہی تھیٹر تھا جہاں اس کا ڈرامہ "غارت گر" سب سے پہلے دکھایا گیا تھا اس نے دوسرا کھیل جنیوا میں "فیسکو کی سازش" پھر تیسرا کھیل "سازش اور محبت" پیش کیا۔ یہ دونوں کھیل اس تھیٹر میں بے حد مقبول ہوئے خاص طور پر "سازش اور محبت" نے تو بڑی کامیابی حاصل کی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شخص بہترین ڈرامہ نویس ہونے کی صلاحیتیں رکھتا ہے مگر ان کھیلوں کی کامیابی کے باوجود وہ مفلس ہی رہا اور اپنی گزر اوقات کے لیے اسے اکثر دوستوں کی امداد کا سہارا لینا پڑا۔

۱۷۸۵ء میں وہ "ویمر" گیا تاکہ وہاں کے بڑے بڑے ادیبوں سے تعارف حاصل کر لے۔ ان ادیبوں میں گوئٹے بھی تھا جس سے ملاقات کرنے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ آگے چل کر یہ ملاقاتیں حقیقی دوستی میں تبدیل ہو گئیں اور یہ دوستی شیلر کے مرنے تک قائم رہی۔

ان تعلقات کا اثر دونوں ادیبوں کی طرزِ تحریر پر بھی پڑا۔ ان کے خطوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ایک دُوسرے کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ شیلر نے ایک کتاب ہسپانیہ کی نیدر لینڈ والوں کے ساتھ بغاوت لکھ کر کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ اس لیے گوئٹے نے کوشش کر کے اسے اپنے قریب کی جینا یونیورسٹی میں تواریخ کے پروفیسر کی جگہ دلوا دی۔ اب اسے اپنے مستقبل کی طرف سے کچھ اطمینان ہو گیا۔ اور اس نے "چارلوٹ وان لنج فلڈ" سے شادی کر لی جس کے بعد اس کی صحت گرنے لگی اور بیماری نے اتنا طُول کھینچا کہ اسے نہ صرف نوکری سے دست بردار ہونا پڑا بلکہ اس کی موت کی خبر بھی مشہور ہو گئی مگر جب یہ معلوم ہُوا کہ خبر صحیح نہیں ہے تو اس کے ایک صاحبِ ثروت مربّی اور قدر دان نے اس کی تھوڑی سی پنشن مقرّر کر دی۔ جس سے شیلر کو کچھ آسانیاں میسر آ گئیں اور اس نے کانٹ کی تصانیف پر کام کرنا شروع کر دیا جس کے خیالات سے وہ بہت متاثر تھا۔ یہی وہ دَور ہے جب سے اس کی ڈرامہ نویسی میں ایک انقلاب پیدا ہُوا۔

کانٹ کا خیال تھا کہ کسی شخص کی قوّتِ ارادی کو اس کی خواہشات اور رجحانات کے تابع نہیں ہونا چاہیے۔ شیلر اس کے مقابلے میں انسانی فطرت سے زیادہ واقف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ مناسب ہوگا اگر خواہشات اور قوّتِ ارادی میں ایک ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ شیلر کا کہنا ہے کہ جذباتِ شوق کے قوّتِ ارادی کے ماتحت ہونے کا مطلب رُوح کی صحیح آزادی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ جو شخص کسی خوف ناک چیز پر فتح حاصل کرتا ہے وہ عظیم ہے مگر جو کسی خوف ناک چیز سے مغلوب ہوتے ہوئے بھی اس سے نہیں ڈرتا وہ عظیم تر ہے۔

اسی تصوّر کو وہ اپنے المیہ کھیلوں کے لیے بھی روا رکھتا تھا، جو اس کے ایک تاریخی کھیل میں پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کھیل کا نام ہے "میری اسٹوارٹ" جو زبردست دباؤ کے باوجود اس چیز کی خواہش کر کے اپنی آزادی کو برقرار رکھتی ہے جس کو وہ ترک نہیں کر سکتی اور یہ یقین رکھتے ہوئے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دیتی ہے کہ خدا نے اس کی جوانی کی لغزشوں کا بدلہ لے کر اس کی قدر افزائی کی ہے۔ تاریخ کے مطابق یہ لغزشیں بکثرت اور بڑی رنگین تھیں۔ شیلر نے اپنے گیارہ کھیلوں میں سے اس آٹھویں کھیل کو ۱۷۹۹ء کے وسط سے ۱۸۰۰ء کے وسط کے درمیان تحریر کیا جس میں ملکۂ اسکاٹ میری کا قصّہ ہے جو ہنری ہشتم اور اس دور کی ملکۂ الزبتھ اوّل کی

اولاد کے انگلستان کے تخت کی وارث ہوئی۔

کھیل میں الزبتھ اور میری کی ملاقات ہوتی ہے جو تاریخی واقعہ نہیں ہے۔ میری کہتی ہے کہ وہ انگریزی سلطنت کے دعوے سے دستبردار ہوتی ہے۔ پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتی ہے۔

"میں اب صرف اپنی زندگی کا سایہ بن کر رہ گئی ہوں۔ جیل کی طویل مدت نے میرا خون چوس لیا ہے۔ میری روح زخمی ہو گئی ہے۔ تمہاری خواہش کے مطابق میری جوانی برباد کر دی گئی۔ بہن، اب تو یہ سلسلہ ختم کر دو۔ کہہ دو ناکہ تم یہی کہنے کے لیے یہاں آئی ہو، میں یہ خیال بھی نہیں کر سکتی کہ تم اپنے قیدی کا مذاق اُڑانے آئی ہو گی۔ ہاں بولو، کہہ دو کہ میں آزاد ہوں۔

کہہ دو کہ میری نے میری طاقت کا اندازہ کر لیا۔ اب میری فطرت کی نرمی بھی دیکھ لو، کہہ دو ناکہ میں اپنی آزادی اور زندگی کو دوبارہ حاصل کر لوں۔ میں یہ سمجھوں گی کہ میری آزادی اور زندگی تم نے اپنے فیاض ہاتھوں سے مجھے از سرِ نو بخشی ہے، تمہارے ایک لفظ سے مجھ میں جان پڑ جائے گی۔"

الزبتھ۔ کیا تم اقرار کرتی ہو کہ اب تمہیں شکست ہو گئی اور آئندہ ایسی سازشوں کا جال بُنا جائے گا، کوئی قاتل میرے قتل کے درپے نہیں ہو گا، تمہارا کوئی مہم جو اپنے سر کی بازی نہیں لگائے گا؟ ہاں لیڈی میری اب انجام کا وقت قریب آ گیا ہے، تمہاری

فائدانہ طاقت ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ دُنیا کو اور بہت سے کام ہیں۔ کوئی آدمی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا کیونکہ جو لوگ تمھاری حمایت کریں گے یا تم سے شادی کرنا چاہیں گے ان کی سزا موت ہے۔"

میری: "بہن۔ بہن ـــــ اے خدا۔ اے خدا! میری زبان کو لگام دے ـــ"

الزبیتھ: "تم اپنے صحیح رُوپ میں سامنے آجانا چاہیے۔ تمھارے مُنھ پر اب تک جو نقاب پڑی ہوئی ہے اسے اب اُتار ڈالو۔"

میری: "جوانی اور زندگی سے محبّت میری کوتاہیوں کی بُنیاد تھی۔ طاقت نے مجھے راہ سے بے راہ کر دیا تھا۔ مگر میں نے اپنی لغزشوں کو کبھی چھپایا نہیں۔ شاہانہ وقار کے باوجود میں نے اس کو ناپسند نہیں کیا میں کہہ سکتی ہوں کہ دُنیا مجھے جتنا بُرا سمجھتی ہے میں اتنی بُری نہیں ہوں۔

افسوس ہے تم پر کہ اگر دُنیا کہیں تمھاری عزّت کا وہ پردہ چاک کر دے جس میں حرص و ہوس کی چمک دمک چھپی ہوئی ہے تو تم قابلِ لعنت قرار پاؤ۔

ایک حرام زادی انگلستان کی سلطنت میں تخت نشین ہے جس نے اسے گندہ کر رکھا ہے۔ ایک مکّارہ برطانیہ کی معزّزہ کو خود انھیں

کے ملک میں دھوکا دے رہی ہے۔

انصاف ہوتا تو تم میرے سامنے خاک پر لوٹ رہی ہوتیں کیونکہ تم جس تخت پر متمکن ہو اس کی جائز وارث میں ہوں۔"

اس کے بعد یہ ظاہر ہے کہ اس کا اختتام قتل ہی پر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ الزبتھ اس کی موت کے پروانے پر دستخط کر دیتی ہے۔

شیلر داخلی آزادی پر اعتقاد رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ خارجی آزادی میں بھی جبر کا مخالف ہے۔ اس کا ڈرامہ "ولیم ٹیل" جو اُس نے اپنی موت سے ایک سال قبل ۱۸۰۴ء میں لکھا تھا۔ اس کا بین ثبوت ہے۔ ٹیل وہ شخص ہے جس نے سوئٹرزلینڈ کو آسٹریلیا کے ظلم سے نجات دلائی۔ کھیل میں دلچسپی کے سارے عناصر اور کردار موجود ہیں۔ گیسلر ایک آسٹروی ظالم و جابر ہے جو صحیح معنوں میں ولین کا کردار ادا کرتا ہے۔ ولیم ٹیل کو جو در حقیقت ہیرو ہے اور اچھا نشانہ باز ہے۔ اسّی قدم کے فاصلے سے اپنے بیٹے کے سر پر رکھے ہوئے سیب کو تیر سے اڑانا پڑتا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس کھیل میں ساری دُنیا کی آزادی کے لیے کوئی چیخ پکار نہیں کی گئی بلکہ اس کے بجائے کم تعلیم یافتہ کسانوں کی اس خواہش پر زور دیا گیا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے شیلر اس رجحان کا حامی ہے اور اس کے ڈراموں میں عام انسانی محبت کی کمی نظر آتی ہے مگر وہ اس وقت اس مسئلے کو اس کی بلندیوں تک

پہنچا دیتا ہے جب لکھتا ہے:

"ظلم کی کوئی طاقت پُورے طور پر لامحدُود نہیں، جب مظلُوم کی دادرسی نہیں ہوتی اور اس پر ظلم کی انتہا ہو جاتی ہے تو وہ ہمّت کر کے آسمان کی طرف متوجّہ ہوتا ہے وہاں سے اپنے دائمی حقُوق حاصل کر لیتا ہے جو وہاں آویزاں رہتے ہیں، ستاروں کی طرح ادھر اُدھر بکھرے نہیں ہوتے۔"

گوئٹے نے ایک بار شیلر کے بارے میں کہا تھا "جرمن ادیبوں میں وہ آخری رئیس ہے۔" اور بلاشبہُ اس کے خیالات اس سے بھی کہیں زیادہ رئیسانہ ہیں جتنے کہ وہ خود تسلیم کرتا ہے۔ وہ کسی بھی عام یا ادنیٰ شے کو اس وقت تک ہرگز نہیں چھوتا جب تک کہ اسے ممتاز اور اعلیٰ نہ بنا لے۔ گوئٹے کے اس اظہارِ خیال سے یہ بات صاف و واضح ہو جاتی ہے کہ رئیسانہ دماغ رکھنے کے باوجود شیلر عوام کا ایک خاص دوست اور ہمدرد تھا۔ اس کے سیاسی نظریے کی گرجدار قوّت اب تک محسُوس کی جا سکتی ہے۔ انیسویں صدی کی عوامی تحریکوں ہی نے اس کی حرّیت پسندانہ نظریات کو دعائیں نہیں دیں بلکہ خود ہمارے دور میں بھی "شول برادران" نے اس کے ایک جماعتی طرزِ حکُومت کے مطالعہ (GESETZGEBUNG DES LYKURGUS UND SOLON) کو نازیوں کے خلاف ایک اشتہار کی حیثیت سے استعمال کیا۔ آج کے منقسم جرمنی کی دونوں ریاستیں اپنے سیاسی اور سماجی

نظام کی تائید میں شیلر ہی کو پیش کرتی ہیں - ایک ریاست اسے آزاد دُنیا کا جدِّ اعلیٰ مانتی ہے، دُوسری قومی جمہوریت کا مجاہد قرار دیتی ہے -

جرمنی میں ایک عظیم سیاسی ادیب کی حیثیت سے شیلر کا کوئی ثانی نہیں ہے - اس کی یہ انفرادیت والنسٹائن سے لے کر ڈمٹریس تک کے کسی اور تمثیلی نگار کے ڈراموں میں نہیں ملتی - اس نے بڑھتی ہوئی مہارت کے ساتھ مختلف یورپی لوگوں کی خصوصیات کو اُجاگر کیا ہے بلکہ تاریخ اور فلسفہ میں بھی اس کا یہ اندازِ تحریر نمایاں ہے اور غنائی شاعری تک اس سے خالی نہیں - اپنے دور کے سماجی نظام سے وہ اس قدر غیر مطمئن تھا کہ اس کی ابتدائی تحریریں مسلمہ طور پر ایک باغی کی تحریریں معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے وہ کبھی کمیونسٹ انقلابی نظریات کا پیشرو نہیں رہا جیسا کہ اس کے بارے میں دعویٰ کیا گیا ہے - ایامِ جوانی میں بھی اس نے آزادی کو خالص مادّی شے کے معنی میں نہیں سمجھا - اس کے نزدیک آزادی اس سے بھی زیادہ گہرے معنی رکھتی ہے جس کا تعلق انسان کے جملہ فطری تقاضوں سے ہے - اس سلسلے میں اس کے تین ابتدائی کھیل "ڈون کارلوس" کے ہراول کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں اور جن کے بعد تاریخی ڈراموں میں طاقت، انصاف، سچائی اور اخلاقی تصوّرات کے مطالبات اور اسی طرح کے دیگر موضوعات زیادہ دُور تک جا پہنچتے ہیں جن پر تاریخ اپنے فیصلے صادر

کرتی ہے۔ یہ خیالات شیلر کے تاریخی مطالعے میں ایک کامیاب جگہ رکھتے ہیں۔ ہم یہ دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں کہ وہ کتنی بے جگری کے ساتھ انسانی اعمال کے پردے میں چھپے ہوئے محرکات کا انکشاف کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے مرکب میں سے خالص اور غیر خالص عناصر کو الگ الگ کر دیتا ہے اور کس مثبت انداز میں تاریخی واقعات کا تجزیہ کرتا ہے۔ شیلر کے نزدیک تاریخ ایک ایسی کہانی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی نوع انسان نے کس طرح خود کو زندگی کے وحشیانہ کھیل میں شریک کیا اور کیونکر اخلاق آزادی کے خطرناک سفر کو اختیار کیا؟

شیلر نے ۹ مئی ۱۸۰۵ء کو ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہ بات ہمیشہ ایک معمہ رہے گا کہ اتنی مختصر اور پُر مصائب زندگی میں وہ اس قدر دیرپا عظمتیں کس طرح پیش کر سکا۔ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں وہ انتہائی وسیع پیمانہ پر وطنیت اور آدمیت کے ایک ارفع امتزاج کا مظہر تھا۔ اس کی ذات جملہ جرمن خصوصیات کی حامل تھی مگر اس کا کام آدمیت پر مبنی تھا۔ فی الواقعہ شیلر کے نزدیک دونوں حیثیتوں میں کوئی تضاد نہ تھا بلکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ آدمی اسی وقت پُختہ ہو سکتا ہے اور ریاست اور سماج سے متعلق سوالات پر توجہ دینے کے قابل ہو سکتا ہے، جب وہ فنون کے ذریعہ اپنی اخلاقی اور شعوری متصادم فطرتوں پر قابو پا کر خود اپنے اندر ایک یگانگت پیدا کر لے۔ انسانی پختگی کے اس

کے نزدیک کیا معنی تھے، اس کے بارے میں وہ ہمیں اپنے ایک مضمون (UBAR DAS ERHABENE) میں بتاتا ہے:

"اِنسان کی اِس سے زیادہ کوئی بے وقعتی نہیں ہو سکتی کہ وہ دباؤ کو برداشت کرے - اس لیے کہ دباؤ اسے تباہ کر دیتا ہے۔ جو شخص بھی ہمارے اُوپر دباؤ ڈالتا ہے وہ ہمارے انسان ہونے میں شبہہ کرتا ہے اور جو دباؤ کے آگے جُھک کر بُزدلی کا مُظاہرہ کرتا ہے وہ اپنی اِنسانیت کو ٹھکرا دیتا ہے۔"

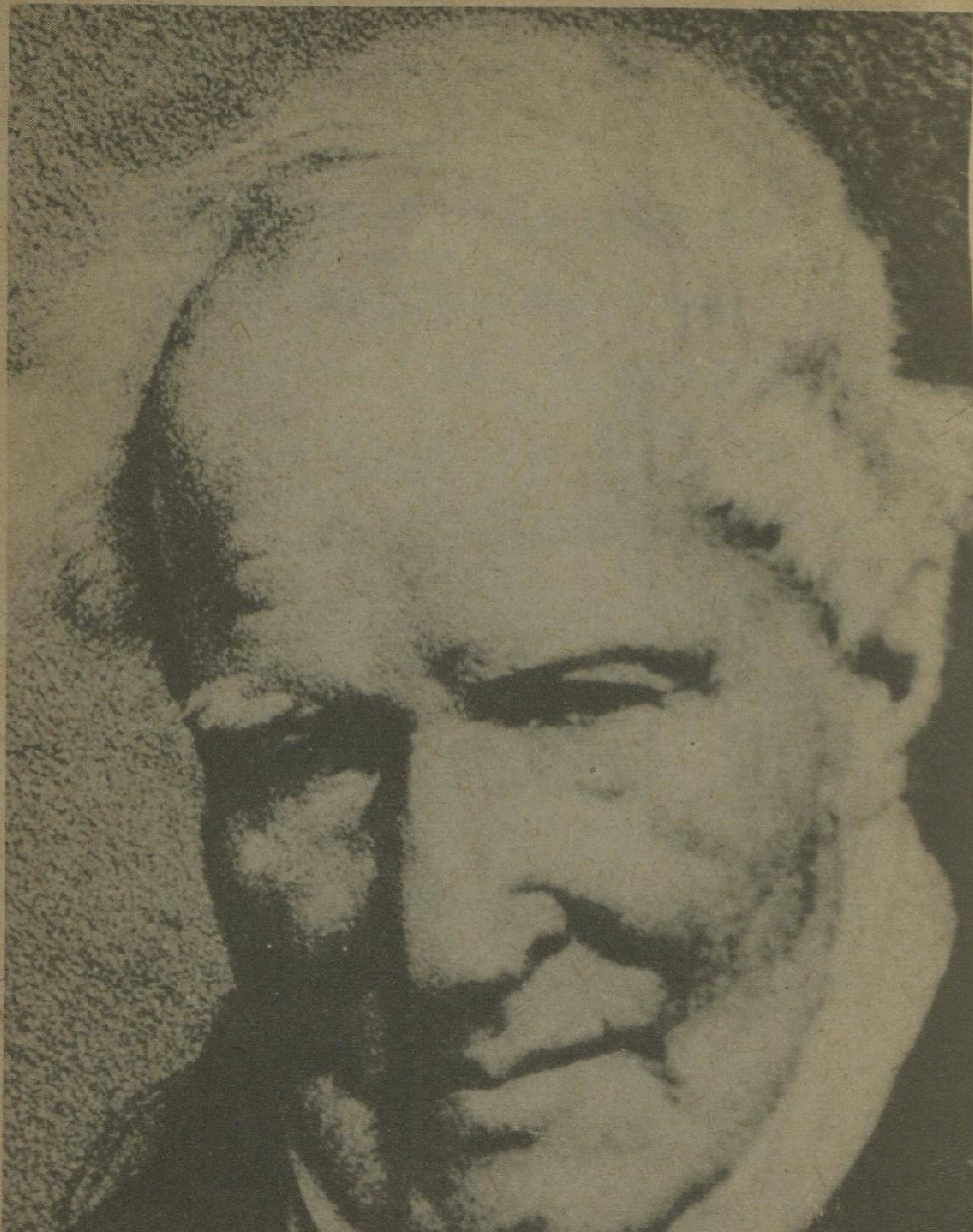
(جرمی لین)

ولہم فان ہمبولٹ

(۱۷۶۷ء - ۱۸۳۵ء) مشہور مستشرق

ولہم فان ہمبولٹ جرمنی کی تاریخ میں ایک بڑی عالم اور پہلو دار شخصیّت تھی۔ وہ ایک ماہر قانون اور سیاست دان تھا۔ جب وُہ پروشیا میں وزیر تعلیم تھا تو اُس کی تحریک پر برلن یونیورسٹی قائم ہُوئی تھی ــــ تحقیقات السنہ کی ابتداء کا سہرا بھی اُسی کے بندھتا ہے۔ وُہ جرمنی کا پہلا شخص تھا جس نے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ یُونانی فلسفے اور تحریر میں بھی اس کی نظر بہت وسیع تھی۔ اُس نے نظریۂ ریاست پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔

وُہ ۱۷۶۷ء میں برلن کے قریب پوٹسڈم میں پیدا ہُوا۔ اُسے اور اُس کے بھائی الگزانڈر (۱۷۶۹ء - ۱۸۵۹ء) کو جو ایک مشہور سائنس دان اور سیاح تھا، بہت اعلیٰ قسم کی تعلیم دی گئی تھی جس میں سائنس پر کافی زور دیا جاتا تھا ــــ لیکن ولہم کا یونیورسٹی کا مضمون قانون تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کو کسی سرکاری عہدے پر فائز کیا جائے مگر چوں کہ خاندان خوش حال تھا اِس لیے جلد بازی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ــــ اس نے ابتداءً فرینکفرٹ اور گوٹنجن یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ پھر کچھ عرصہ



فان ہمبولٹ

مشہور مستشرق

ارفرٹ اور ویمر میں رہا جہاں منیز کے شاہزادہ "کارل تھیوڈور وان ڈالبرگ" سے اس کے گہرے مراسم رہے۔

۱۷۸۹ء میں وُہ پیرس چلا گیا۔ یہ وُہ وقت تھا جس سے کچھ عرصے پہلے بیسل کے جیل خانے میں شورش ہو چکی تھی جو انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ اُس نے وہاں جو کچھ دیکھا اس سے اس کے دِل پر بہت اثر ہُوا۔ حالانکہ بعد میں اسے اپنی رائے میں کچھ تبدیلی کرنا پڑی۔

دُوسرے سال وہ سول سروس میں داخل ہو گیا مگر سال بھر بعد اُس نے نوکری چھوڑ دی کیونکہ وُہ اپنے فرائض سے مطمئن نہیں تھا۔ حکومت سے اس کی نفرت اس کی ایک تصنیف سے ظاہر ہوتی ہے جو اُس کی زندگی میں شائع نہیں ہُوئی۔ اس کتاب کا نام ہے "اقتدارِ حکومت کی صراحتی کوششوں پر بعض تاثرات" اِس میں اس نے اِنسان کی مکمّل آزادی کے مقصد پر روشنی ڈالی ہے اور حکومت کی افراد کی جسمانی اور روحانی ترقی کی ذمّہ داری عائد کرنے کے خیال پر تنقید کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ انسانیّت کو شہریت پر قربان نہ کرنا چاہیئے۔ حکومت کو صِرف تحفظ کا ضامن ہونا چاہیئے۔ اگر یہ ایک ایسے شخص کے خیالات نہ ہوتے جس کو ایسے فیصلے صادر کرنے پر قُدرت حاصل تھی تو اب تک اس کی تصانیف گوشۂ گمنامی میں پڑ گئی ہوتیں۔ تھیوڈر ہیوس نے، جو فیڈرل ری پبلک کا پہلا صدر تھا، ایک انگریز مورخ کے حوالے سے کہا ہے کہ ایسی حکومت صرف ہمبولٹ قبیلے ہی میں مُمکن ہے۔

اب ہمبولٹ نے مطالعہ کا ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ۹۴ء۱۷ میں فریڈرک وان شیلر سے راہ و رسم بڑھائی۔ شیلر شاعر، ڈرامہ نویس اور مورخ تھا۔ یہ دوستی شیلر کی موت تک قائم رہی۔ شیلر کے متعلّق اُس نے لکھا ہے۔

"شیلر کی جُدائی میرے لیے ہمیشہ تکلیف کا باعث ہوگی۔ صرف وہی ایک ایسا شخص ہے جس کے ساتھ رہنا سہنا اور گُفتگو کرنا میں پسند کرتا ہُوں"۔ ہمبولٹ کو شیلر کے عادات و اطوار میں جو چیز پسند آئی تھی، وُہ اُس کے دلائل اور خیالات کی یکسانیت تھی۔ اس زمانے میں اُس کی دوستی جان ولف گینگ وان گوئٹے سے ہوگئی جو جرمنی کا بہت مشہور شاعر تھا اور جو اکثر اپنی نظموں کے عروض کے متعلّق اس کی رائے معلُوم کرتا رہتا تھا۔ ہمبولٹ نے آگے چل کر گوئٹے کی ایک وزمیہ نظم "ہرمن اور ڈروتھی" کو تنقید کی کسوٹی پر بہت سراہا ہے۔

۱۷۹۹ء میں ولہم وان ہمبولٹ کو باسک زبان سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس زمانے میں بعض دُوسرے لوگوں کی توجّہ بھی اس جانب تھی۔ کیونکہ یورپ میں صرف یہی ایسی زبان تھی جو کسی دُوسری زبان سے میل نہ کھاتی۔ باسک لوگ فرانس کے جنُوب اور اسپین کے شمال میں آباد ہیں اور یورپ کی سب سے قدیم قوم کی اولاد ہیں۔ ہمبولٹ نے طے کیا کہ اُسے زبان کی تحقیقات کرنا ہے جس کے بعد ہی وُہ کچھ عرصے کے لیے پھر سرکاری ملازمت میں داخل ہو گیا پھر روما چلا گیا جہاں ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۸ء تک

پروشیا کی نمائندگی کرتا رہا۔ وہاں اُس کے فرائض چونکہ زیادہ سخت نہ تھے اِس لیے اُس نے اپنے آپ کو رومن ثقافت میں گم کر دیا۔ یونانی زبان پڑھی جو بعد کی اُس کی تصانیف کی بُنیاد بنی۔ اپنی ذہین اور عاقلہ بیوی کے ساتھ مل کر اس نے ان جرمنوں کی ایک جماعت بھی قائم کی جو ثقافت میں دِلچسپی لیتے تھے۔ یہ وُہ دَور تھا جب پروشیا کو نپولین کے ہاتھوں شکست ہو رہی تھی۔

بہر نوع ۱۸۰۸ء میں پروشیا کی حکومت کی طرف سے اُسے وزیر تعلیم کی جگہ پیش کی گئی۔ اس نے یہ پیش کش منظور کر لی اور چند ہی ماہ کے اندر اندر اسکولوں کا سسٹم بنیادی طور سے بدل کر رکھ دیا۔ اس کا طریقہ اِصلاح سوئٹزرلینڈ کے عظیم ماہر تعلیم پیسٹا لوزی کے اصُولوں پر مُبنی تھا۔ جو اس بات پر زور دیتا کہ بچّے کی تعلیم اس کی دماغی نشوونما کی ترقی کے مُطابق ہونی چاہیئے۔ ہمبولٹ نے برلن یونیورسٹی کے قیام میں بھی بہت تعاون کیا جس میں تعلیم و تحقیق بیرون دباؤ سے بالکُل محفوظ تھی۔ ۱۸۱۹ء تک وہ سرکاری ملازمت میں رہا۔ وزیر تعلیم کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۵-۱۸۱۴ء میں ویانا کانگرس میں پروشیا کے نمائندے کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ خیال تھا کہ نپولین کی جنگ کے خاتمے پر کانگریس یورپ کی از سر نو تشکیل کرے گی لیکن پروشیا میں جو سیاسی ریشہ دوانیاں ہو رہی تھیں۔ ان سے تنگ آ کر اُس نے استعفا دے دیا اس طرح ۱۸۱۹ء کے بعد اُسے وُہ فرصت نصیب ہو سکی جس کی اُسے

ضرورت تھی اور اب وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنی تمام توجّہ اور وقت زبانوں کے سیکھنے میں صرف کرے۔

۱۸۲۱ء میں اس نے ایک کتاب تصنیف کی جس کا نام تھا "اسپین کے قدیم باشندوں کی تحقیق"۔ یہ باسک زبان کا ایک تحقیقی جائزہ تھا۔ اسی سال اُس نے سنسکرت پڑھنا شروع کی جس کے متعلّق اُس کا قول ہے کہ زبانوں کی مکمّل اور دل چسپ تحقیقات صرف سنسکرت ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس سلسلے میں جس شخص نے اسے بہت زیادہ مدد دی، وہ ماہر لسانیات فرانز باپ تھا جو ۱۸۲۱ء میں برلن یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گیا تھا اور جس نے یونانی، لاطینی، جرمن، فارسی اور سنسکرت کے رستے بتائے تھے۔

بھگوت گیتا کی دریافت اس کے لیے ایک حیرت انگیز چیز تھی۔ ولہم ہمبولٹ کا جمالیاتی ذوق اب تک یوروپین کلاسیکی ادب کا مرہونِ منّت رہا تھا اور یہ چیز اِس کے لیے بالکل نئی تھی اس لیے اُس کے سمجھنے میں اُسے کچھ وقت لگا۔ اس نے لکھا ہے کہ بھگوت گیتا ایک ایسی تصنیف ہے جو فلسفے سے مالا مال ہے اور ایک ایسے نقش کی طرح ہے جس پر شروع شروع میں کہر چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر جیسے جیسے اس پر روشنی پھیلی جاتی ہے ویسے ویسے یہ کہر صاف ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں یہ نقش نہایت صاف شفاف نظر آتا ہے۔ اِس صورتِ حال کے لیے یہ ضروری ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ اس میں دلیلیں دُہرائی جاتی ہیں اور ایک ہی مثال مُختلف دلیلوں میں آتی ہے مگر ایک نئے رنگ اور انداز سے یہ

تاثرات اُس کی ایک کتاب میں پائے جاتے ہیں جس کا نام اُس نے "مہابھارت" موسوم بہ "بھگوت گیتا کی ایک ضمنی داستان سے" رکھا ہے۔ چونکہ سنسکرت ہندوستان اور مغربی ممالک کی زبانوں میں ایک درمیانی کڑی تھی۔ اِس لیے اسے خیال گزرا کہ ممکن ہے کہ ہندوستان چین یا دونوں امریکاؤں کے درمیان کوئی رشتہ ہو اس طرح اُس کی دلچسپی کاوی زبان سے بڑھ گئی جو ۱۴۰۰ء تک جاوا میں بولی جاتی تھی۔ کاوی زبان کی بدولت اس نے انڈو ملاین زبان کا ایک مجموعہ تیّار کیا جو اس کی زندگی میں مکمّل نہیں ہُوا بلکہ اس کی موت کے بعد شائع ہُوا اس میں ایک دیباچہ بھی تھا جس میں اِنسانی زبانوں کے فرق دکھائے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ اِنسانوں کی روحانی ترقّی پر زبان کا کیا اثر پڑتا ہے زبان کے سِلسلے میں اُس نے یہ نظریہ قائم کیا تھا کہ کوئی شخص جو زبان بولتا ہے اس سے اثر پذیر ہوتا ہے، جب کہ زبان ہی اس کے عادات و اطوار سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۱۸۳۵ء میں ولہم فان ہمبولٹ کا اِنتقال ہُوا۔ اُس نے اپنے پیچھے تحقیقات کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ ان خیالات کا آئینہ ہیں جنھوں نے زِندگی بھر اُس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ حاصل ان کا یہ ہے کہ زبان و ثقافت اگرچہ بادی النظر میں ایک دُوسرے سے مُختلف ہوں مگر دونوں میں ایک چُھپی ہُوئی ہم آہنگی موجُود ہو گی۔

(جری لین)

لڈوگ فان بیتھوون

موسیقار و نغمہ ساز (۱۷۷۰ء - ۱۸۲۷ء)

بیتھوون کی پہلی اور باچ کی آخری تخلیقات میں تقریباً پچاس سال کا فرق ہے تاہم دونوں موسیقاروں کی دُنیا ایک دُوسرے سے بالکل الگ ہے۔ باچ کے یہاں متانت ہے، اپنے خدا پر اِعتماد ہے، وُہ ایک باضابطہ ہیئت کا ماہر ہے اور معمولی معمولی وسائل سے اِنتہائی نشاط انگیز نغموں کی تخلیق کرتا ہے۔ بیتھوون کے ہاں ایک زبردست اثر انگیزی ہے، اِسے خدا پر ذرا سا بھی اعتماد نہیں، وُہ روشن دماغ ہے، حرکت آفریں ہے اور ایک ایسی ہیئت کا ماہر جو باچ کی ہیئت سے بالکل مختلف ہے اس کے نغموں کی یہ ہیئت مبسوط، تنوع اور شدّت کے ساتھ داخلیت پرست ہے۔

بیتھوون فرانسیسی انقلاب کے اُنیس برس پہلے بون میں پیدا ہُوا۔ جو دریائے رائن پر واقع ہے اس میں بچپن ہی سے موسیقار بننے کا رحجان تھا۔ اِس کے باپ نے بھی اس پر زور دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ گیارہ برس کی عُمر کے بعد سے بیتھوون مدرسے نہیں گیا۔ جس میں خود اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا ـــــ ۱۷۸۷ء میں سترہ سال کی

عمر میں اُس نے پہلی مرتبہ ویانا کا دورہ کیا۔ یہ شہر اس زمانے میں یورپی موسیقی کا مرکز تھا۔ یہاں وُہ موزارٹ سے ملا۔ جس کو اس نے ایک فی البدیہہ نغمہ سنایا مگر موزارٹ نے یہ خیال کر کے یہ پہلے سے کہا ہوا ہے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اس پر بیتھوون نے اس سے کہا کہ وُہ اُسے کوئی خاص عنوان دے جس پر وُہ طبع آزمائی کرے۔ اب موزارٹ اس کی بدیہہ گوئی سے بہت خوش ہُوا اور اس نے اس کے لیے اپنی پسندیدگی کا اِظہار کیا چُوں کہ اس کی ماں کا اِنتقال ہو گیا تھا اِس لیے وہ زیادہ دن ویانا میں ٹھہر نہ سکا اور اسے گھر واپس جانا پڑا۔ بہر نوع ۱۷۹۲ء میں وُہ پھر ویانا آ گیا اور یہیں اُس نے سکُونت اِختیار کر لی۔ یہ شہر اس کام کے لیے بہت موزوں تھا۔ وہاں ایک موسیقار اور پیانو نواز کوشِش کر کے اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا اور بیتھوون کا بھی یہی اِرادہ تھا۔

بیتھوون کا ویانا میں قیام اِس مقصد کے لیے تھا کہ وُہ اپنے فن کی مزید تعلیم حاصل کرے۔ چنانچہ اُس نے ہیڈن سے سبق لینا شروع کر دیا جو ایک موسیقار تھا اور جس کی وُہ بڑی عزت کرتا تھا مگر حصولِ درس کا یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ ہیڈن بہت سُست واقع ہُوا تھا اور بیتھوون کو زیادہ عجلت تھی اس لیے اس نے دوسرے اُستادوں سے رجُوع کیا۔ اور بنیادی اصُولوں کی کافی معلُومات حاصل کر لیں۔ اس زمانے میں بیتھوون کو معاش کے بہت سے ذریعے تھے۔ اوّل تو وہ پیانو ایسا بجاتا تھا کہ اس کا شمار اُستادانِ فن میں ہوتا تھا اور اس کی بدیہہ گوئی

تو مقبول عام تھی۔ مجموعی طور پر اس کا بیشتر وقت دُوسروں کو سکھانے میں گزرتا تھا حالانکہ اس قسم کے کام وُہ پسند نہ کرتا تھا کچھ روپیہ اس کو اپنی تخلیقات سے بھی مل جاتا تھا۔ بعض کتابوں کو وُہ کسی کے نام سے معنون کر دیتا کیونکہ اکثر امراء یہ چاہتے تھے کہ ان کا نام بھی اِن نغموں کے ساتھ شامل ہو جائے اس کے علاوہ وُہ موسیقی کی محفلوں میں ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیتا تھا حالانکہ اس سلسلے میں جو معاوضہ ملتا وُہ کچھ زیادہ نہ ہوتا — بحیثیت اِنسان وُہ قطعی ناتراشیدہ، بدمزاج اور بدزبان تھا۔ اِس میں تہذیب و تمیز اور علم کی بھی کمی تھی۔ تاہم اِس کی شخصیّت ایک ایسی قوّت کی حامل تھی کہ دیانا کے بہترین گھروں میں چلا جاتا۔ شکل و شباہت میں وُہ ایک چھوٹے سے قد کا آدمی تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے مگر ان سب باتوں سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ وُہ لیڈیوں کی سوسائٹی سے حظ اُٹھاتا تھا اور وُہ بھی اس کی پذیرائی کرتی تھیں۔

۱۸۰۰ء میں اُس نے اپنی پہلی سمفونی (آہنگ ساز) شائع کی، دو اور نغماتی کارنامے دُوسرے سال منظرِ عام پر آئے مگر ان پر حسب توقع زیادہ پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وُہ ہیبن اور موزارٹ کی صاف سُتھری موسیقی کے مُقابلے میں کم تر درجے کے تھے دُوسرا سبب یہ تھا کہ ان میں جو جذبات تھے۔ ان سے لوگ واقف نہیں تھے۔ بہرحال ترقّی کا راستہ کھُل گیا تھا اور لوگ آئندہ کی تخلیقات کے

منتظر تھے۔

اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہر کام خوش اسلوبی سے چل رہا ہے مگر بیتھووِن کے ایک خط سے، جو اُس نے ۱۸۰۱ء میں اپنے بون کے ایک دوست کو لکھا، ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقتاً صورت حال اس سے مختلف تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ اس حاسد شیطان یعنی میری خرابیٔ صحت نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی ہے۔ تین برس سے زیادہ گزر گئے کہ میری قوّت سماعت بھی کم ہونا شروع ہو گئی ہے اور یہ خرابی بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ میرے اُوپر بڑا بُرا وقت آ پڑا ہے۔ آگے چل کر اس نے تحریر کیا کہ موسیقی کی فنی قابلیّت بلاشبہ بڑھتی جا رہی ہے مگر میری قوّت سماعت برابر کم ہو رہی ہے۔

۱۸۰۲ء کے موسمِ گرما میں وُہ ویانا کے ایک نزدیکی مقام ہیلی جنسٹاٹ چلا گیا تاکہ وہاں یکسوئی کے ساتھ غور و فکر کر سکے۔ یہاں اس نے ہیلی جنسٹاٹ ٹیسٹامنٹ نامی کتاب لکھی جس میں وہ اپنی کمزوری کا اعتراف کرتا ہے۔ وُہ لکھتا ہے کوئی شخص جو میرے پاس کھڑا ہو، دُور سے بجنے والی بانسری کی آواز سُن سکتا ہے مگر میں نہیں سن سکتا۔ اس صُورتِ حال سے اس میں ایک نااُمیدی سی پیدا ہو گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے قریب قریب اپنے آپ کو ختم کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا مگر ایک چیز اسے اِس کام سے روکتی رہی اور وُہ اس کا فن تھی۔ اُس نے لکھا ہے کہ جب تک میں وُہ سب کچھ نہ لکھ لوں جو مجھے لکھنا ہے اس وقت تک میں زندگی سے

دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس بحران کے بعد اس کی موسیقی نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا۔

اس نئے دور میں اس کی مشہور ترین ابتدائی تخلیق تیسری سمفونی تھی جو حقیقتاً نپولین کے نام معنون کی گئی تھی مگر جب نپولین شہنشاہ ہو گیا تو اس نے اس کا دوسرا نام "ایروئے کا" رکھ دیا۔ بیتھوون اس وقت تک نپولین کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ نپولین وہ شخص ہے جو فرانس کے لوگوں میں انقلابی روح پھونک سکتا ہے جو اُس وقت تک ناپید تھی۔ مگر نپولین ایک ظالم فرماں روا ثابت ہوا اور اپنی ہستی کو دوسرے لوگوں سے بالاتر سمجھنے لگا۔ "ایروئے کا" ۱۸۰۵ء میں عوام کے سامنے پیش کی گئی۔ یہی وہ سال تھا جب فرانسیسی افواج ویانا میں داخل ہوئیں۔ وقت بہت سخت تھا پھر بھی اس زمانے میں جو موسیقی بیتھوون نے پیش کی وہ بڑی کامیاب ہوئی اور اسے اپنے وقت کا یکتائے روزگار موسیقار کا مان لیا گیا۔ ۱۸۰۸ء میں اُس نے جرمنی کی ایک ملازمت قبول کرنے کا ارادہ کر لیا مگر اس کے چند دوستوں نے جن کا اس پر اثر تھا، اسے اس ارادے سے باز رکھا اور یہ طے کیا کہ وہ اسے ہر سال کچھ رقم پیش کرتے رہیں گے حالانکہ عملی طور پر اس رقم کی ادائیگی میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کمی رہی مگر بیتھوون نے ویانا نہیں چھوڑا۔

۱۸۰۹ء میں ایک دفعہ پھر جنگ کے بادل چھا گئے۔ ویانا کو ایک بار پھر خطرہ پیدا ہو گیا۔ شاہی خاندان نے ویانا چھوڑ دیا مگر فرانسیسی کچھ

ہی عرصہ تک ویانا میں رہے پھر وہاں سے چلے گئے۔ اس پریشانی سے بیتھوون مفلس ہو گیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ایک سال بعد اس کی مالی حالت قدرے بہتر ہو گی۔

۱۸۱۰ء میں اس نے گوئٹے کے کھیل اگمانٹ کی موسیقی کو ترتیب دیا۔ اس کھیل میں قومی آزادی کے موضوع کو زیرِ بحث لایا گیا تھا مگر اس کے سین جرمنی کے نہیں بلکہ نیدرلینڈ کے تھے۔ اِس سلسلے میں اس کا تعارف گوئٹے سے ہو گیا جو اس زمانے میں جرمنی کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ بیتھوون نے گوئٹے کو لکھا کہ وہ الماںٹ کی موسیقی سے بہت خوش ہو گا۔ پھر اس نے اسی سلسلے میں تحریر کیا کہ براہِ کرم اس کے متعلق اپنی رائے سے سرفراز فرمائیں، آپ کی تنقید میرے اور میرے فن کے لیے بہت مفید ہو گی اور میں اس کو اسی طرح شکریے کا دامن پھیلا کر قبول کروں گا جس طرح بڑی سے بڑی تعریف کو۔ بیتھوون کا گوئٹے کو اس طرح سے لکھنا بڑی قابلِ تعریف بات تھی۔ ۱۸۱۲ء میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی جس پر گوئٹے نے بعد میں اظہارِ خیال کیا کہ اس کی ذہانت حیرت انگیز ہے، بدقسمتی سے وہ ایک بالکل وحشی انسان ہے اور دنیا کو کسی حد تک قابلِ نفرت سمجھنے میں حق بجانب ہے مگر اس کا یہ انداز، کہ وہ اپنے لیے یا دوسروں کے لیے دنیا کو مسرت انگیں نہیں سمجھتا، غلط ہے اب بیتھوون پوری طرح سے بہرا ہو چکا تھا۔

۱۸۱۴ء اس نے اپنے اوپیرا (غنائی تمثیل) کو دوبارہ درست کرتا

شروع کیا جس کا نام فائی ڈیلیو تھا اور جس سے اسے بڑی محبت تھی۔ اس بار جب اوپیرا دکھایا گیا تو اس میں اسے بڑی کامیابی ہوئی۔ ۱۸۱۴ء میں ویانا کی کانگریس کے زمانے میں اور اس کے بعد ۱۸۱۵ء میں اس نے کافی روپیہ پیدا کیا اور اسی دوران اپنے بھتیجے کارل کو اپنی سرپرستی میں لے لیا مگر وہ اس کے لیے مصیبت بن گیا۔ بیتھوون اس سے بہت محبت کرتا تھا مگر اس کی آوارہ گردی سے سخت نالاں تھا۔ ۱۸۱۸ء سے اس نے سولیمنس پر کام کیا جو مذہبی نغموں کا مجموعہ تھا۔ پھر مشہور نویں سمفونی کو مکمل کیا۔ یہ اوڈ ٹو جوائے کا نغمہ تھا جو شیلر نے لکھا تھا۔ ناقدین کا خیال ہے کہ بیتھوون اسے ایک نئے رنگ کی موسیقی میں پیش کرنا چاہتا تھا مگر صرف آواز بڑھا دینے سے تو کامیابی نہیں ہوتی۔ نتیجے میں وہ پھر پرانے ڈھرّے پر آ گیا۔

۱۸۲۴ء میں نویں سمفونی پیش کرنے کے لیے تیار تھی مگر بیتھوون کو اسی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی پھر بھی بہت سے بااثر اور صاحبان ذوق لوگوں نے اُسے مجبور کیا تو وہ ان کی خواہشات کے احترام میں اس پر رضامند ہو گیا۔ جب اس کو پیش کیا گیا تو وہ اگرچہ وہاں موجود تھا مگر اس کا منہ آرکسٹرا کی طرف تھا، اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کی پیٹھ پیچھے کس زور شور سے اس کی تعریف ہو رہی ہے اور جب اُس نے اپنا مُنہ مجمع کی طرف کیا تو اُس کی سمجھ میں آیا اور اس وقت اس کی قدردانی کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد اس کی ساری دلچسپی اپنے پسندیدہ چوراگوں کی طرف

مبذول ہوگئی اور اس کی موسیقی میں ایک انفرادیت پیدا ہوگئی۔ آخری چوراگوں میں سولھویں چوراگ سے اس کے فن کی عظمت ظاہر ہوتی ہے — بیتھوون کو ہمیشہ سے زمانے کے سرد و گرم سے ٹکر لینے کی عادت تھی جو آخر دم تک برقرار رہی —— اس کے چوراگوں کے چوتھے حصّے سے، جو غالباً اس کی آخری تخلیق تھی، زندگی کی خواہش ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اس میں کوئی ایسی بات پائی نہیں جاتی جس سے بیزاری یا نا اُمیدی آشکار ہو اور ایک ایسے آدمی سے اس کی امید بھی کی جا سکتی ہے جو مریض اور بہرا ہو۔ اس موسیقی میں وہی زور اور وہی جوش و خروش ہے جو صرف بیتھوون ہی کی موسیقی میں پایا جاتا ہے۔

۱۸۲۷ء میں بیتھوون کی صحت بہت گر گئی اور ۲۶ مارچ ۱۸۲۷ء کو وہ عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔ ویانا کے لوگوں نے اُس کا جنازہ بڑے تزک و احتشام اور دُھوم دھام سے اُٹھایا۔

(جیریمی لین)

جارج ولہم فریڈرک ہیگل

مشہور و معروف فلسفی

(۱۷۷۰ء - ۱۸۳۱ء)

شاید کسی فلسفی کی تصانیف میں عالمی سیاست کا اتنا حصّہ ہو جتنا جرمنی کے مایہ ناز مفکّر جارج ولہم فریڈرک ہیگل کی تصانیف میں پایا جاتا ہے اور شاید ہی کسی فلسفی کے خیالات کو اتنے غلط معنے پہنائے گئے ہوں۔ جتنے اس کے خیالات کو پہنائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ مطلق العنانی کے خیالات کا بانی تھا جیسے مارکسزم، لیننزم، فاشزم۔ مگر فی الحقیقت یہ سب غلط ہے وُہ اپنے سیاسی نظریات میں ایک بڑی ہی آزادانہ رائے رکھتا تھا۔

ہیگل ۱۷۷۰ء میں اسٹٹ گارٹ میں پیدا ہُوا جو جرمنی میں واقع ہے یہیں اُس نے اسکول میں پڑھنا شروع کیا۔ اس کے بعد وُہ ٹوبنجن یونیورسٹی چلا گیا تاکہ اپنے والدین کی خواہش کے مُطابق دینیات کی تعلیم حاصل کرے چنانچہ پہلے اُس نے فلسفے اور ادب عالیہ کا مطالعہ کیا پھر اس مضمون کی طرف متوجّہ ہُوا جس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ جلد ہی اس کے اُستادوں نے محسوس کر لیا کہ اُنھیں اِس سے جتنی امید تھی اُس نے اس مضمون میں ویسی دلچسپی نہیں لی۔ پھر بھی ہیگل نے کسی نہ کسی طرح کورس



جارج ولہم فریڈرک ہیگل
ایک مشہور و معروف فلسفی

کو ختم کر لیا مگر اب کسی مذہبی ادارے میں شامل ہونے کے بجائے وُہ گھروں میں پڑھانے لگا۔ اس طرح اس کے پاس مطالعہ کرنے کے لیے کافی وقت نکل آتا۔ اسی دوران اُس نے امانوئل کانٹ کی تصانیف پڑھیں جو ایک بڑا فلسفی تھا اور جس کا اِس پر بہت اثر پڑا۔ ۱۷۹۹ء میں اُس کے باپ کا اِنتقال ہو گیا اور چونکہ اب اس کی تھوڑی بہت آمدنی کی صُورت بھی پیدا ہو گئی تھی اِس لیے وہ اپنا تمام وقت فلسفے کے مطالعہ میں صرف کرنے لگا اور کسی قدر ذاتی تیّاریوں کے بعد ۱۸۰۱ء میں وُہ جینا آ گیا تاکہ یونیورسٹی میں پڑھانے کی اعزازی خدمت انجام دے سکے۔ لوگوں نے پہلے پہل تو اس کے لیکچروں پر بہت کم توجّہ دی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا گیا۔ ۱۸۰۵ء میں اُسے خصوصی پروفیسر کا عہدہ دیا گیا اور دُوسرے ہی سال گوئٹے نے جو سیکسی وِیمر کی ریاست میں سرکاری مُلازمت میں تھا ایسا اِنتظام کر دیا کہ اسے اس کی خدمت کا معاوضہ ملنے لگا تھا۔

اِس زمانے میں ہیگل کو فرانس کے اِنقلاب سے بڑی دِلچسپی تھی اور وُہ جرمنی پر اس کے اثرات مرتّب ہونے کا منتظر تھا۔ ہیگل تاریخ کو افکار کی ترقّی کا ایک زینہ سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جن لوگوں نے اِنقلاب فرانس میں حصّہ لیا تھا وہ کسی حد تک حق بجانب تھے۔ وُہ ذاتی طور پر نظریات کو ترجیحی شکل دینے کا مؤید تھا اور اُس کا خیال تھا کہ جرمنی میں بھی ویسا ہی اِنقلاب آنا چاہیے جیسا فرانس میں آیا تھا۔ اِسی لیے جب نپولین نے ۱۸۰۶ء

میں پروشیا کی فوجوں کو جینا میں شکست دی تو وہ بددل نہیں ہُوا بلکہ اُس نے محسوس کیا کہ پروشیا میں ضرورت سے زیادہ ضابطے کی پابندی اور غلامانہ ذہنیت ہے لہٰذا اس کے نزدیک ان لوگوں پر ایک چوٹ پڑ جانا نامناسب نہ تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ تاریخ کی ترقّی کے سلسلے میں نپولین دُنیا کی رُوح کا مجسمہ ہے اور جب اُس نے دیکھا کہ فرانسیسی فاتح اپنے گھوڑے پر سوار جینا کی گلیوں میں گشت کر رہا ہے اور اس کے پُرانے مکانوں کو جو قدیم یادگار تھے اپنی فوج کی معیّت میں برباد کر رہا ہے تو اس پر بہت اثر پڑا۔

اِسی زمانے میں اُس نے اپنی پہلی بڑی تصنیف مُکمّل کی جس کا نام تھا "مظاہرات رُوح" اور جو شعوری مسائل پر اُس کی تحقیقات تھی۔ اب زمانہ بہت خراب آ گیا تھا۔ تاریخ کی رفتار نے پُرانی قدروں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ صُورتِ حال یہاں تک پہُونچ گئی تھی کہ جب ہیگل کو ہیمبرگ کے ایک مقامی اخبار کی ایڈیٹری کی پیش کش کی گئی تو اُس نے اس کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا اور پرچے کے معیار کو اُونچا کرنے کی فکر کرنے لگا مگر عملی طور پر اس کی ترقّی ممکن ثابت نہ ہُوئی۔ ۱۸۰۸ء میں اس نے نورم برگ کے ایک اسکول میں مُلازمت کر لی اور وہاں کا ریکٹر ہو گیا۔ اس اسکول میں وُہ کئی برس رہا جہاں بلاشبہ اس کو اپنے شاگردوں کا اعتماد حاصل تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ وہ بغیر سخت ضرُورت کے ان کے معاملات میں مداخلت نہ کرتا۔ ۱۸۱۲ء میں اس کی تصنیف "خارجی منطق" شائع ہُوئی۔ دُوسری تصنیف

"داخلی منطق" اس کے چار برس بعد چھپی انھیں تصانیف کی بدولت ۱۸۱۶ء میں ہیڈل برگ یونیورسٹی میں اُسے فلسفے کی کرسی پیش کی گئی۔ ہیگل دراصل پہلا فلسفہ دان تھا جو صحیح معنیٰ میں یونیورسٹی میں پڑھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔

اب وُہ پوری طرح اپنے کام میں مشغول تھا۔ نتیجے میں بہت جلد اس کے شاگردوں کی تعداد کافی ہو گئی مگر وُہ ورٹم برگ کے سیاسی حالات سے کچھ خوش نہ تھا۔ وہاں کی زندگی وہ غیر حقیقی تصوّر کرتا تھا اس کا خیال تھا کہ تاریخ وہاں پچاس سال سے خاموش ہے۔ ۱۸۱۷ء میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "فلسفانہ سائنس کی انسائیکلوپیڈیا" یہ کتاب اس کے تمام خیالات کا مجموعہ تھی۔ ہیڈل برگ میں اس نے صرف دو سال قیام کیا اس کے بعد وُہ برلن چلا گیا جہاں اپنے شاگردوں پر اُس کا بہت اثر تھا جب وہ برلن میں تھا تو اُس نے اپنی آخری کتاب لکھی جس کا نام تھا "فلسفۂ حقوق"۔

برلن میں ہیگل کی مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ وُہ فنونِ لطیفہ، فلسفۂ مذہب، فلسفۂ تواریخ اور تواریخ فلسفہ پر لیکچر دیا کرتا تھا اور پورے یورپ سے لوگ اُس کے لیکچر سُننے کے لیے آتے تھے حالانکہ اس کا اندازِ بیاں کچھ زیادہ پُر تاثیر نہیں تھا۔ البتّہ یونانی فلسفہ پر اُس کے لیکچر ایک مُمتاز حیثیت رکھتے تھے۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ اس کے پاس یُونانی لٹریچر کی تشریحی کتابیں نہیں تھیں اِس لیے اُن کی صراحت اُسے بڑی دِیدہ ریزی

سے اپنے طور پر کرنا پڑتی تھی۔ ان حالات میں اس کا یُونانیوں کے خیالات کو سمجھنا بڑی اہم بات تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہیگل نے یُونانی فلسفے کو بڑی ترقّی دی جو اس کی موت کے بعد زوال پذیر ہو گیا۔ اس کی ذات ہمیشہ بحث کا موضُوع رہی ہے اور ۱۸۳۱ء میں جب ہیضے کے عارضے میں اُس کا انتقال ہو گیا تو وُہ برلن کی زندگی میں ایک ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پُر ہونا مشکل تھا۔

ہیگل ایک عینیّت پسند تھا اور سلسلہ تاریخ کو ایک تصوّر قرار دیتا تھا مارکس کی طرح اُس کا یہ قول نہیں تھا کہ معاشی افکار ترقّی کا باعث ہیں۔ بلکہ وہ تاریخ کو ایک قوّت آفرین اور متحرک چیز سمجھتا تھا اور اُس کے لیے اس کا زاویہ نگاہ منطقی تھا۔ ہر عمل اور اُس کے تصوّر کا ردِّ عمل بھی ہوتا ہے، اِن دونوں کا تصادم ایک قسم کے اتحاد کی تخلیق کرتا ہے اور ان میں باہم ایک آمیزش ہو جاتی ہے جو یقیناً ردِّ عمل ہی کی ایک نوعیّت ہوتی ہے۔ اِس طرح تاریخ چلتی رہتی ہے۔ ہیگل نے اپنے ان خیالات کو حکُومت پر منطبق کیا جس میں شخصی خواہشات آزادی اور مجموعی طور پر سماجی ضرُوریات کے درمیان ایک ناقابلِ اتحاد کشمکش تھی۔ حکُومت ان دونوں چیزوں کا مجمُوعہ تھی جس کا وجُود سماجی اور شخصی حیثیتوں سے بالاتر تھا۔ خُوش حال زندگی کے لیے یہ ضرُوری تھا کہ ان دونوں حیثیتوں میں ایک توازن برقرار رکھا جائے۔ ہیگل کا خیال تھا کہ اس کے لیے پارلیمانی نظام حکُومت ضرُوری ہے جس کے ساتھ ساتھ حکُومت میں ایک حاکم اعلیٰ بھی ہو۔ اِس ضمن میں اس

کے خیالات بالکُل آزادانہ تھے اور ہر اعتبار سے توجّہ طلب۔

مذہب کے معاملے میں وُہ خُدا کے خالص رُوح ہونے کا قائل تھا۔ مگر اس کے نزدیک خُدا کو سمجھنے کے لیے مذہب کے بجائے فلسفے کی ضرورت تھی۔ مذہب اس کی نگاہ میں عقائد کا ایک مجموعہ تھا اور انسانی رُوح کو خُدا کا عرفان صرف فلسفے ہی کے ذریعہ ہو سکتا تھا۔ ہیگل ایک ایسا نظام بنانے کی کوشش میں تھا جو تضاد پر مبنی ہو لیکن جس میں پوری پوری ہم آہنگی کی صلاحیّت ہو۔ مگر ایک طویل بیماری کے بعد موت نے اُسے مہلت نہ دی کہ وُہ اپنا کام مکمّل کر سکتا پھر بھی بلا شک وشبہ اس کے خیالات اِنسانی دماغ کی اعلیٰ فراست کی یادگار ہیں۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوٹ)

ہینرخ فان کلیسٹ

(۱۷۷۷ء - ۱۸۱۱ء) ایک سائنس دان اور ڈرامہ نگار

اپریل ۱۷۹۹ء کے اوائل میں ایک نوجوان لیفٹیننٹ نے جو پروشیا کی فوج کی گارڈس رجمنٹ میں ملازمت سے سُبک دوش کر دیا جائے۔ وجہ اس نے یہ لکھی کہ اب وہ اپنا سارا وقت سائنس اور فلسفے کی تحقیقات میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ اس کا نام ہینرخ فان کلیسٹ تھا۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہُوا تھا جو روایتی طور پر فوجی تھا۔ اس نے اس زمانے میں اپنی بہن کو جو خط میں لکھا تھا اس میں وہ تحریر کرتا ہے کہ اسے فوجی زندگی سے نفرت ہو گئی ہے۔ فوجی مقاصد، ضابطے کی پابندی اور فوج کے کام کو وہ پسند نہیں کرتا۔ ۲۱ نومبر ۱۸۱۱ء کو اس شخص نے برلن میں خودکشی کر لی۔

کلیسٹ میں کچھ نہ کچھ سپاہیانہ جذبہ ہمیشہ موجود رہا۔ پروشیا کی سخت تنگ نظری کو ناپسند کرتا اور عزّتِ نفس اور اخلاقی راست بازی پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے ہمیشہ سیاسی اور اخلاقی آزادی کے لیے کوشش کی اور غالباً اسی عجیب قسم کی جدّوجہد کی بدولت ہی وہ اپنے ہمعصروں کے لیے ایک معمّا بنا رہا۔



ہنرخ فان کلیسٹ
ایک سائنسدان اور ڈرامہ نگار

ہنرخ فان کلیسٹ ۱۸ اکتوبر ۱۷۷۷ء کو فرینک فرٹ میں پیدا ہوا۔ یہ جگہ برلن کے نزدیک ہی مشرق کی طرف دریائے اوڈر پر واقع ہے۔ چونکہ کلیسٹ کا باپ فوج میں کپتان تھا اس لیے اس کو کسی دوسرے کام میں لگانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں وہ گارڈس میں ایک سپاہی کی حیثیت سے بھرتی ہو گیا اور اُس نے فرانسیسیوں کے خلاف اس جنگ میں حصّہ لیا جو انقلابِ فرانس کے بعد ہوئی۔ ۱۷۹۹ء میں اس نے فوجی ملازمت چھوڑ کر فرینکفرٹ کی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا جہاں اس نے طبیعیات، ریاضی، ثقافت، تاریخ، لاطینی اور دیگر مضامین کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۰ء میں اس کی منگنی ہو گئی مگر دو سال بعد یہ منگنی ٹوٹ گئی۔

کلیسٹ میں جو خداداد ذہانت تھی اس کا خود اُسے بھی علم تھا تاہم جیسی کامیابی اسے ہونا چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ اس کے خیالات بڑے ارفع و اعلیٰ تھے مگر زمانہ ایسا تھا کہ وہ انھیں بر روئے کار نہ لا سکتا تھا۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی اس کی فکر اور عمل میں ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل تھی۔ پچیس برس پہلے امانوئل کانٹ نے کہا تھا "ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہمیں صحیح صحیح نظر آتا ہو۔ کیونکہ حواس، جن سے ہم یہ چیزیں محسوس کرتے ہیں، چیز کو کچھ نہ کچھ کر دیتے ہیں۔" کانٹ نے کہا کہ ہم دراصل یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ صحیح کیا ہے؟ کلیسٹ نے اسی خیال کو اپنے تخلیقی ادب میں پیش کیا ہے۔

یہ ایک ایسا بُنیادی خیال ہے جس پر لوگوں کے نزدیک کلیسٹ کی تخلیق بہت زیادہ روشن ہے —— ایک چھوٹا سا قصّہ ہے جس کا نام ہے "مارکوئِس آف او"۔ "پاک ضمیر اور ایک دایہ" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصّہ کیا ہو گا؟ یہ اتنی عُمدگی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس میں بمشکل ہی کسی متعلّق کردار پر حرف آسکتا ہے۔ مارکوئیس ایک بیوہ ہے جس کے دو بچّے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ یہ محسُوس کرتی ہے کہ اس کے ماں بننے کے دن قریب ہیں لیکن حقیقتاً اسے نہیں معلوم کہ یہ صُورت کس طرح واقع ہو گئی۔ اس کے ماں باپ کسی طرح اسے بے گُناہ ماننے کو تیار نہیں۔ باپ ایک قسم کا فوجی خبطی انسان ہے۔ وہ تو اس کو مار ڈالنے تک پر اُتر آیا ہے۔ آخر کار مارکوئیس گھر چھوڑ دیتی ہے اور کلیسٹ کے بیان کے مُطابق خود اپنی ذات پر اعتماد کرتی ہے۔

ہونے والے بچّے کا باپ ایک رُوسی افسر تھا جس نے مارکوئیس کی بے ہوشی سے ناجائز فائدہ اُٹھایا تھا۔ وہ ایک قلعہ پر کچھ سپاہیوں کے ساتھ دھاوا کر رہا تھا جس کی کمان مارکوئیس کے باپ کے ہاتھ میں تھی۔ مارکوئیس جنگ وجدل کے خوف سے غش کھا گئی تھی۔ اس موقع پر رُوسی افسر پر حیوانیت طاری ہو گئی —— بعد کو اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے۔ وہ اپنے گُناہ کی تلافی پر آمادہ ہوتا ہے اور بغیر کوئی سبب بتائے مارکوئیس سے شادی کی درخواست

کر دیتا ہے۔ مارکوئیس کی نظر میں اس کی بہت عزّت ہے۔ وہ اس بچّے کا بار اس پر ڈالنا نہیں چاہتی جس کے متعلّق اسے نہیں معلُوم کہ اس کا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے سے اِنکار کر دیتی ہے۔ پھر ایک عجیب ترکیب کرتی ہے۔ اپنے بچّے کے باپ کے لیے اِشتہار دیتی ہے اور مُلاقات کا وقت مقرّر کر دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ رُوسی افسر وقت مقرّرہ پر پہنچ جاتا ہے۔ اب اس قِصّے میں ایک بڑا فنکارانہ موڑ آتا ہے۔ مارکوئیس یہ معلُوم کر کے کہ وہ افسر اس کے بچّے کا باپ ہے۔ اس کی طرف بالکُل توجّہ نہیں دیتی اور جب وہ بغیر کِسی ظاہری فائدے کے ایک شادی شُدہ آدمی کی ذمّہ داریاں قبُول کرنے پر تیار ہوتا ہے تو بڑی بے دِلی کے ساتھ اس سے شادی کر لیتی ہے۔ پھر بتدریج وہ اس سے محبّت کرنے لگتی ہے —— حالانکہ اگر جنگ کے دوران پہلے وہ فرشتے کے رُوپ میں ظاہر نہ ہوتا اور اسے غُنڈے سپاہیوں سے نہ بچاتا، پھر خود ہی شیطان بن کر اس کی عزّت نہ لُوٹ لیتا تو مارکوئیس اس سے بغیر کِسی حیل وحجّت کے شادی کر لیتی —— صحیح حالات سے لاعلمی اور اس کے نتائج اِس قِصّے کا ماحصل ہیں۔ کلیسٹ کے کردار بہت جذباتی ہیں۔ مارکوئیس کے باپ کو جب یہ معلُوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی پر کِتنا ظُلم کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ کیسی نااِنصافی کی ہے تو وہ روتا ہے۔ افسر بھی

رونا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی اپنی حالت پر شرمندہ نہیں ہوتا۔
کلیسٹ حلقۂ محبّت کو صحیح جذبات سے عاری نہیں ہونے دیتا۔
ایک کھیل جس میں یہ صورت نہایت عمدگی اور پُر اثر طریقے سے دکھائی گئی ہے "امفٹ ریون" ہے۔ "ایلکینے" "امفٹ ریون" کی محبّت کرنے والی شریف بیوی ہے۔ ایک دن جوپیٹر دیوتا زمین پر آتا ہے اور "ایلکینے" کے گھر میں اس کے خاوند کے رُوپ میں داخل ہوتا ہے۔ رات کو وہیں ٹھہرتا ہے۔ ایلکینے لاعلمی میں اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتی ہے جس طرح اپنے شوہر سے پیش آتی تھی۔ جب اس کو حقیقت حال کا علم ہوتا ہے تو اس سے اِنکار نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے خاوند کے مقابلے میں جوپیٹر سے زیادہ محظوظ ہُوئی اور اسے اس کا ذرا بھی افسوس نہیں ہے کیونکہ اس کا ضمیر صاف ہے۔ اس انکشاف سے امفٹ ریون دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ جوپیٹر حالات کو ہموار کرنے کے لیے یہ التزام کرتا ہے کہ ان دونوں کے اِتّصال سے جو بچّہ پیدا ہو گا وہ بہت بڑا ہیرو ہو گا۔ یہ کھیل مقبُول نہ ہو سکا کیونکہ اس میں کرداروں کی زبان سے عشق و محبّت کے جو مکالمے پیش کیے گئے، وہ روزمرّہ کی زندگی کے تھے لہٰذا انھیں سوسائٹی میں قطعاً غیر ضرُوری قرار دیا گیا۔ ایک دُوسرا کھیل "ہوم برگ کا شہزادہ" بھی کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس زمانے میں جنگ ہو رہی تھی شہزادہ فریڈرک ایک مشہور سپاہی ہے۔ وہ ہمیشہ یہ خواب دیکھتا

رہتا ہے کہ میدانِ جنگ میں اپنے بہادری کے جوہر دِکھا کر نام آوری حاصل کر لے۔ اِن خیالات میں وہ اِتنا مستغرق ہوتا ہے کہ ان ہدایات پر بھی کچھ دھیان نہیں دیتا جو اسے جنگ سے پہلے دی جاتی ہیں اور اس حکم کو بھی غور سے نہیں سنتا کہ جب تک حکم نہ دیا جائے اُس وقت تک ہرگز ہرگز حملہ نہ کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے ہی لڑائی میں کود پڑتا ہے۔ لڑائی میں فتح تو ہو جاتی ہے مگر یہ فتح اتنی شاندار نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ شہزادے پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جاتا ہے اور اسے موت کی سزا ہو جاتی ہے کیونکہ اس نے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے۔ شہزادے کو پہلے تو یہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے ڈرانے کے لیے ایسا کیا گیا ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی اس کے لیے موت کا حکم دیا گیا ہے۔ اب وہ اپنی زندگی کی بھیک مانگتا ہے، اور کماندارِ اعظم الیکٹر کہتا ہے کہ اگر شہزادے کو یہ خیال ہے کہ اس کے ساتھ نا اِنصافی کی گئی ہے تو وہ اپنی زبان سے نا اِنصافی کا اِظہار کر دے، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اس موقع پر شہزادے کو محسوس ہوتا ہے کہ الیکٹر نے جو کچھ کیا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔ آخر وہ اپنا قصور تسلیم کر لیتا ہے اور اس طرح الیکٹر کو اپنی رہائی کا موقع دیتا ہے۔ پھر شہزادہ بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے نام و نمود کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اس چکر میں پھنس کر

دُوسری ضرُوری باتوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
اس کھیل کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ فوجی آداب اور فتوحاتِ جنگ کا کوئی قصیدہ ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ ذیل میں شہزادے کے اس وقت کے بیان کا مختصر سا خلاصہ دیا جاتا ہے جب وہ یہ محسُوس کرتا ہے کہ موت قریب ہے۔ واضح رہے کہ کلیسٹ نے یہ کھیل قوم کی فوجی ضرُورت کی خاطر لکھا ہے۔

"اب میں زندگی کی آخری منزل پر ہُوں تو مستقبل میرے سامنے پریوں کے ملک کی طرح پھیلا ہُوا ہے۔
کل میں دو تختوں کے بیچ میں دبا ہُوا پڑا ہوں گا تو صرف میرا سنگِ مزار بتا سکے گا کہ کبھی دُنیا میں میرا وجُود تھا۔
میں ان تاریک سایوں سے کہتا ہوں کہ مجھے ملامت نہ کرو، زندگی کا حظ اُٹھانے اور بوڑھا ہونے تک جینے دو۔ مجھے میری ملازمت سے الگ کر دو جس کا میں مستحق ہُوں اور اگر قانون کا منشا ہو تو مجھے معزُول کر دو۔
مجھے گارڈ سے نکال دو۔ اے میرے خدا! میں نے اپنی قبر دیکھ لی ہے مگر مجھے صرف زندہ رہنے کا ارمان ہے۔ اب مجھے عزّت کی ضرُورت نہیں، صرف زندگی درکار ہے۔"

کلیسٹ کو ممکن کوشش کے باوجُود کوئی ادبی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس کی ایک ایکٹ کی کامیڈی ٹوٹا ہوا جگ تھا جو ایک دیہاتی

جج کے متعلق تھی اور جس میں وہ خود ایک مجرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ کامیڈی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے کردار بالکل خاک نشیں ہیں جو صحیح معنیٰ میں کسان ہیں۔ جج کا نام آدم ہے جو ایک موٹا تازہ چالباز آدمی ہے۔ وہ اس تکلیف دہ صورت حال سے بچنے کی ممکن کوشش کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے اور اسے بھاگ جانا پڑتا ہے۔ لوگوں نے اس کھیل کو پسند نہیں کیا کیونکہ یہ اس زمانے سے مطابقت نہ کرتا تھا لیکن آج کل یہ کامیڈی جرمن زبان کے بہترین کھیلوں میں شمار کی جاتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ کلیسٹ وقت کی رفتار کے لحاظ سے ایک کامیاب مصنّف نہیں تھا۔ اس نے ایک ایسے افسر کا نقشہ کھینچا ہے جس پر قومی ضرورت کے وقت موت کا خوف طاری تھا۔ کسانوں کی تصویر کشی بلاشبہ حسب حال ہے۔ ایک کھیل میں کلیسٹ نے جنسی برائیوں کی ملامت پر زور دیا ہے تو دوسرے میں اس کی مسرّتیں بھی دکھائی ہیں۔ درحقیقت وہ بڑا جذباتی آدمی تھا اور اپنی معمولی سی برمحل مخالفت بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ۱۸۰۸ء کے شروع میں اس نے مشہور زمانہ شاعر گوئٹے کو نثر کے چند مضامین اور اپنا کھیل پنتھی سیلیا بھیجا تو گوئٹے نے ان کے متعلق لکھا:

"نثر کے مضامین دیکھ کر، جن میں سے بعض میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں، مجھے بڑی مسرّت ہوگئی مگر پنتھی سیلیا کو میں اپنا نہیں سکتا۔

کیونکہ یہ اتنا عجیب و غریب ہے اور اس کا ماحول اس قدر نامانوس ہے کہ مجھے اس سے روشناس ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔"
اِن الفاظ سے کوئی رائے قائم کرنے کا اِنحصار اس پر ہے کہ نامانوس موضوع کا کیا مفہوم سمجھا جائے۔ زمانہ سیاسی طور پر بھی کلیسٹ کے موافق نہیں تھا۔ وہ جب برلن "ایوننگ پیپجز" کا می اخبار کا ایڈیٹر تھا تو اس نے اس میں اسپین میں ہونے والے فرانس کے نقصان کی تفصیل دی۔ اس پر فرانسیسی اس سے خفا ہو گئے اور پولیس کی سرپرستی کے باوجود اس پر سنسر کی قیود زیادہ کر دی گئیں۔ اس کے بعد حصولِ ملازمت کے لیے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی گئی۔ کسی نے اسے کوئی مالی امداد نہ دی اور نہ ناشروں ہی نے اس کی تصانیف میں کوئی دلچسپی لی۔ آخر کار اس نے اپنے آپ کو ختم کر ڈالنے کا ارادہ کر لیا۔
اس نے اپنی محبوبہ ہنریٹے ووجل کے ساتھ خودکشی کا منصوبہ بنایا دونوں سفر کر کے برلن میں وانسی جھیل پر پہنچے۔ کافی پینے کے بعد ساتھ ساتھ جھیل کے کنارے آ گئے۔ دو گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ کلیسٹ نے ہنریٹے کے دل پر گولی چلائی پھر پستول کا رُخ اپنی طرف پھیر لیا۔ اس کی عمر اس وقت چونتیس برس کی تھی۔ مرنے سے کچھ پہلے اس نے اپنی بہن الرائک کو خط لکھا تھا "تم نے میرے بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتی تھیں، کر لیا۔ صرف بہن ہی کے رشتے سے نہیں بلکہ انسانیت کے رشتے سے بھی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اب دُنیا میں کوئی چیز مجھے بچا نہیں سکتی۔"

(جرمنی لین)

آرتھر شوپن ہار

عظیم و معروف مستشرق اور فلسفی

(۱۷۸۸ء - ۱۸۶۰ء)

دُنیا میں یہ کہاوت ہمیشہ کے لیے چلی آرہی ہے کہ رموزِ کائنات اور اسرارِ حیات صرف اُنھیں لوگوں پر کھُلتے ہیں جو ان کے جاننے کے لیے تحمل و استقلال کے ساتھ اَن تھک کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ فطرتاً تنہائی پسند ہوتے ہیں۔ جرمنی نے بھی ایسے چند افراد پیدا کیے ہیں جو اس معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ مشہور فلسفی آرتھر شوپن ہار بھی انھیں لوگوں میں تھا۔

شوپن ہار ۲۲ر فروری ۱۷۸۸ء کو ڈان زگ کے شہر میں پیدا ہوا جو بحیرۂ بالٹک پر واقع ہے۔ وہ ایک تاجر ہنرک فلورس شوپن ہار کا لڑکا تھا جو ایک آزادی پسند اور بُرد بار آدمی تھا اور انسان پر بے جا دباؤ سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی ماں جوہنا ایک مہذّب مگر کسی قدر زندہ دِل خاتون تھی۔ ۱۷۹۲ء میں جب ڈان زگ پروشیا میں شامل ہو گیا تو ہنرک فلورنس شوپن ہار اپنے خاندان کو لے کر ہیمبرگ چلا آیا جو ایک آزاد شہر تھا۔

آرتھر شوپن ہار ہیمبرگ، فرانس، انگلستان، سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا،

مختلف مقالات پر تعلیم حاصل کرتا رہا کیونکہ اس کا باپ سفر کرنے کی موافقت میں تھا۔ اس کے نزدیک سفر کرنا بجائے خود تحصیل علم کے مترادف تھا۔ ۱۸۱۳ء میں شوپن ہار نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

آرتھر شوپن ہار کے بچپن کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے عزلت پسند اور سب سے الگ تھلگ رہنے والا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اور اس کے والدین کے درمیان زیادہ اتّفاق نہ تھا اور عموماً اپنی ماں سے اس کی اَن بن رہتی تھی۔

۱۸۰۳ء میں جب شوپن ہار لندن گیا تو وہاں کی شان و شوکت نے اُس کے دل پر کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ اس نے درباری خاتونوں کو "کسان عورتیں فینسی لباس میں" کہہ کر یاد کیا۔ پھر کہا "بادشاہ ایک بہت ہی خُوش نما بوڑھا آدمی ہے، ملکہ بدصُورت اور بے ڈھنگی ہے اور شہزادیوں میں تو کوئی بھی خوب صورت نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بوڑھی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔"

۱۸۰۵ء شوپن ہار کو تجارتی تربیت کے لیے ہیمبرگ کے ایک تاجر کے دفتر میں بھیجا گیا۔ وہاں اسے چند ہی دن گزرے تھے کہ اس کا باپ ایک نہر میں ڈوب کر مر گیا جس کے بعد اس کی ماں ویمر چلی آئی۔ شوپن ہار اکثر اس سے ملنے کے لیے وہاں جاتا رہتا۔ چونکہ اسے تاجرانہ زندگی کچھ پسند نہ تھی اس لیے اس نے ادب عالیہ کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۱۸۰۹ء میں وہ گوٹنگن یونیورسٹی چلا گیا جہاں پہلے اس

نے طبابت کی تعلیم حاصل کی پھر فلسفے کے مطالعہ میں لگ گیا۔ ۱۸۱۱ء اور ۱۸۱۳ء کے درمیان اس نے برلن یونیورسٹی میں مشہور جرمن فلسفی جان گوٹلیپ فیشے کے درس میں حصّہ لیا۔

۱۸۱۳ء میں جب اس کا مقالہ "چہار بنیادی اصُولِ منطق پر شائع ہو چُکا تو شوپن ہار ویمر واپس آگیا۔ اس کی ماں، جو کبھی کبھی ادب میں دِل چسپی لیتی تھی، زمانے کے رواج کے مُطابق اکثر بڑے لوگوں کو اپنے گھر پر مدعو کرتی۔ ان مہمانوں میں سب سے بڑی شخصیت گوئٹے کی تھی۔ رفتہ رفتہ شوپن ہار اور گوئٹے میں دوستی ہو گئی۔

شوپن ہار ہندوستان کے قدیم علم وفضل سے سب سے پہلے مشہور مستشرق فریڈرک میر کے ذریعے روشناس ہُوا۔ میر نے اس کو انکویٹیل ڈوپیرن کا فرانسیسی ترجمہ پڑھنے کو دیا جو سنسکرت کے اپنشد کے فارسی ترجمے سے کیا گیا تھا اور اگرچہ اصل اصُول تک پہنچنے کے لیے ایک پیچیدہ راستہ تھا۔ پھر بھی دِل چسپی بڑھانے کا ایک یقینی ذریعہ تھا۔ پھر میر نے اسے گوتم بدُھ کی تعلیمات کے بارے میں بھی بہت کچھ بتایا۔

۱۸۱۴ء میں وہ چھبیس سال کی عُمر میں ڈرسڈن گیا جو سیکسونی میں واقع ہے۔ منشا اس سفر کا یہ تھا کہ اسے تنہائی میسّر آجائے اور وہ ہندوستانی یوگیوں کی طرح گیان دھیان میں وقت گزار سکے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس کی عظیم تصنیف "دُنیا بطورِ عزم وخیال" کا بُنیادی

منصوبہ بتدریج پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ۱۸۲۵ء اور ۱۸۳۱ء کے درمیان اس کا قیام برلن میں رہا۔ اس قیام کی خاص وجہ ایک مقدمہ تھا جس میں شوپن ہار ماخوذ تھا۔ یہ مقدمہ ایک درزن نے دائر کیا تھا جو ایک روز اس کے کمرے کے باہر شور مچا رہی تھی جس پر اسے اتنا غصّہ آیا کہ اسے اُس نے بے دردی کے ساتھ دھکیل دیا اور درزن کو چوٹ لگ گئی۔

۱۸۳۱ء میں وہ فرینک فرٹ چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں اس کی مالی حالت بہت اچھّی تھی کیونکہ اس قیام میں اس نے اپنے کو بہترین غذا، نفیس شراب، موسیقی، تھیٹر اور ادب کے لیے وقف کر لیا تھا۔ مگر درحقیقت اسے سچّی خوشی حاصل نہ ہو سکی اسے اس بات کا بے حد افسوس تھا کہ اس نے فلسفے پر جو کام کیا اس کی قدردانی نہیں ہوئی۔ کچھ دنوں کے وقفے سے لیپزگ یونیورسٹی نے اس کے نظریوں کی تشریح اور تنقید پر انعام کی پیش کش کی اور ایک سال کے اندر اندر اس کے افکار جرمنی کی تمام یونیورسٹیوں میں موضوعِ بحث بن گئے۔ اس وقت سے اُسے بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی اب اکثر لوگ اسے صرف ایک مشہور فلسفی ہی نہ سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک ایک بالاتر ہستی کا مالک تھا اور علم و فضل کا اُستاد — یہ عزّت و احترام ۲۱ ستمبر ۱۸۶۰ء میں اس کی موت واقع ہونے کے بعد بھی برقرار رہا۔

شوپن ہار نے خاص طور پر قدیم ہندو افکار، یونان کے افلاطون

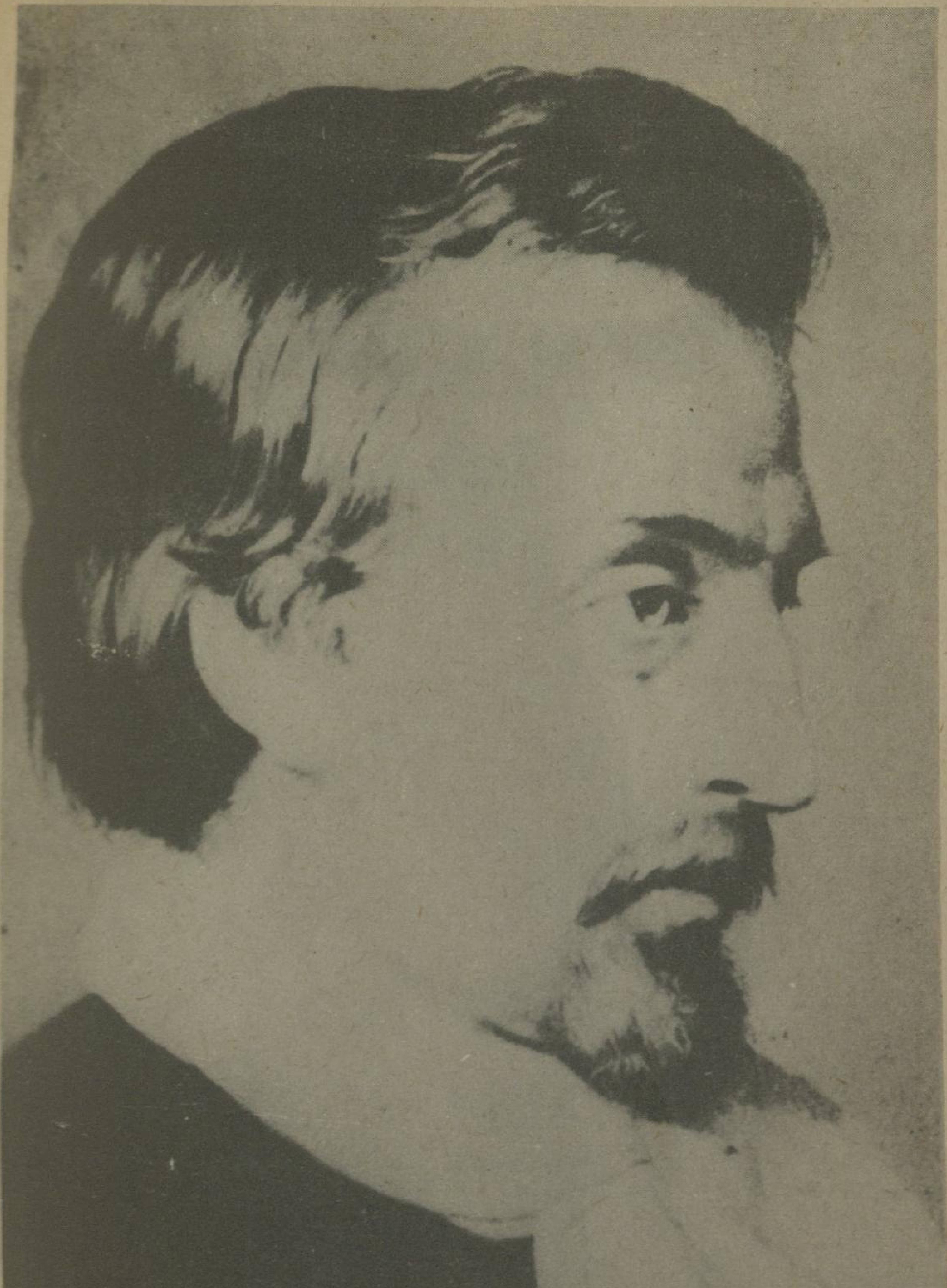
جرمن فلسفی شیلنگ اور انگریز محقّقین کا بہت اثر قبول کیا ہے۔ اس نے اپنے علمی نظریے میں مظہر اور غیر مظہر کا فرق دکھایا ہے۔ مظہر وہ شے ہے، حواس یا دماغ بلاواسطہ جس کا ادراک کر سکے اور غیر مظہر وہ شے ہے جو صرف نام کے لیے ہو جیسے وقت یا خلا اور علت جس کی جگہ تصوّر کے سوا کہیں نہ ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ زندگی اور کائنات میں قوّت محرکہ صرف عزم ہے۔ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ان کے کاموں میں عقل ان کی رہبری کرتی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ عقل تو صرف ایک ایسا آلہ ہے جو عزم کو اپنے مقاصد پورا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ شخصی ارادے کی آزادی کا خیال ایک فریب ہے۔

اس کے نزدیک سچّی حقیقت وہ بے امتیاز قوّت محرکہ ہے، جو مادّی شکل میں اپنے کو ظاہر کرتی ہے۔ افراد میں یہی قوّت خواہش حیات کا روپ دھارتی ہے۔ بعض اوقات یہ آگہی سے نیچے کی سطح پر بھی عمل پیرا ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ مسلسل اپنے آپ کو اوپر اچھالنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ جب عمل مقصد تحریک کو پورا کرنے میں ناکام رہتا ہے تو فہم و آگہی سامنے آتی ہے۔ کوئی انفرادی عمل بغیر ایک جذبۂ مضطرب کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ دنیا دراصل غیر مطمئن خواہشات یا دکھوں کی دنیا ہے۔ خوشی صرف دکھ کی عدم موجودگی کا نام ہے جو قطعی عارضی ہوتی ہے — راہ نجات صرف ترک تمنّا یا بدھ مت کے نظریات کے مطابق نفی

خواہش میں ہے ۔ عارضی نجات شدّت خواہشات، سائنس اور فن سے بھی حاصل کی جاسکتی ہے ۔ شوپن ہار کے اس فلسفہ کا عملی پہلو صرف ہمدردی پر مبنی ہے جس میں اخلاقی خواہش دُوسرے کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتی ہے اور دردمندی کے ساتھ دُکھوں کو دُور کرنے کی کوشش کرتی ہے ۔

شوپن ہار ان اوّلین مفکّرین میں سے تھا جنھوں نے اپنے ہم وطنوں کو ہندوستان کے ثقافتی ورثے اور اس کے علم و فضل سے روشناس کردیا۔

(گنتھر سٹاک)



ہنرخ ہین
شہرہ آفاق شاعر و ادیب

ہینرخ ہین

(۱۷۹۷ء - ۱۸۵۶ء) شہرہ آفاق شاعر و ادیب

"میں ڈسل ڈورف میں پیدا ہوا جو دریائے رائن پر واقع ہے۔ اس مقام پر یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ میرے مرنے کے بعد جرمنی کے دوسرے سات شہر بھی یہ شرف حاصل کرنے کا دعویٰ کریں گے کہ وہ میرا وطن رہے ہیں۔ ان شہروں کے نام ہیں، ہنسلڈا، کراونگل، یوک وز، بشم، ڈلک، گوٹنجن اور شوپن سٹارٹ۔"

یہ اس شخص کے الفاظ ہیں جو ۱۷۹۷ء میں رائن کے کنارے ڈسل ڈورف میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام ہینرخ ہین تھا جو طبعاً نہایت خشک مزاج اور مردم بیزار آدمی تھا اور جرمنی زبان کی بہترین غنائیہ نظموں کا خالق تھا۔ اس کے عادات و اطوار بجائے جرمنوں کے غیر جرمنوں سے ملتے جلتے تھے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف انتظامیہ کے کسی حکم سے بھی انکار کر دینے کی جرأت رکھتا تھا بلکہ ضرورت پڑنے پر ترکِ وطن تک کر سکتا تھا۔

حالانکہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنھیں جرمنی سے بے پناہ محبت تھی، جو اس کی خاطر تکالیف برداشت کر سکتے تھے، اسے

بڑے پیار بھرے الفاظ میں یاد کرتے اور اس کے اندرونی اور بیرونی معاملات سنوارنے میں کوشاں رہتے تھے۔ انیسویں (۱۹) صدی عیسوی کے اوائل نصف میں باہر کا مطلب خاص طور پر پیرس سے لیا جاتا۔ کیونکہ یہی شہر اس زمانے میں جمہوریت کا گڑھ تھا اور یہیں اس نے وہ نغمہ لکھا تھا جو تمام غم زدہ جرمن مہاجرین کی آواز ہے۔

"رات کے وقت جب مجھے جرمنی کا خیال آتا ہے، تو میری آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی ہے۔" سیمسن ہین یعنی ہیر ہین کے باپ کا مقولہ تھا: "نیکی کرو، کھاؤ پیو اور عیش اڑاؤ۔" جس کے لیے اس کے نامور بیٹے نے بعد کو لکھا ہے۔

"مجھے اپنے باپ سے دُنیا کے تمام آدمیوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ محبّت تھی۔"

ہین کی ماں بڑی ذہین عورت تھی جو یہودیوں کے ایک مالدار ڈاکٹروں کے خاندان سے تعلّق رکھتی۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی بول سکتی تھی اور لاطینی زبان بھی پڑھ سکتی تھی۔ بانسری بجانے میں بھی اس کو دخل تھا۔ اس نے اپنے بچّوں کی تربیت بڑی عمدگی سے کی۔

ہینرخ ہین نے جب تک پروٹسٹنٹ مسلک قبول نہیں کیا تھا اُس وقت تک اس کا نام ہیری ہین تھا —— جب اس نے پابندیوں سے نفرت کے باوجود کسی نہ کسی طرح ہائی اسکول پاس

کر لیا تو خاندانی روایات کے مطابق کاروباری زندگی شروع کی۔ مگر بہت جلد اسے معلوم ہو گیا کہ یہ اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس کے ایک معزّز اور دولت مند چچا نے جو ہیمبرگ میں بینکر تھا، کہا تھا۔

"یہ بے وقوف نوجوان کبھی کاروباری آدمی یا بینکر نہیں بن سکتا۔"

بہرحال اس کے چچا سالومن ہین نے اس کے لیے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کا انتظام کیا۔ ہین نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ "مجھے پہلے ہی سے اس کا احساس تھا کہ بینکر لوگ پوری دنیا پر غلبہ حاصل کر لیں گے اور خدا شاہد ہے کہ میں بھی ایک بینکر ہی ہونا چاہتا تھا، مگر میں نے سمجھ لیا کہ یہ کام میرے امکان کے باہر ہے۔ اس لیے اس نے ایک دوسرا کام شروع کر دیا۔" مشہور جرمن فریڈرک فلسفی نیٹشے نے اس کے لیے کہا تھا۔

"ہین کے کلام سے مجھے یہ احساس ہوا کہ غنائیہ نظم بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اس میں جو کیفیات ہیں، وہ خداداد ہیں جن کے بغیر نظم مکمّل نہیں ہو سکتی۔"

اس صلاحیت کے ساتھ ساتھ ہین میں وہ شدّتِ احساس بھی تھی جو شاعر کو حزن پسند بنا دیتی ہے اور حزنیہ تاثرات کے اظہار پر قادر کر دیتی ہے۔ ہین صرف جرمنی ہی کے غم و محبّت میں گرفتار نہیں تھا بلکہ اس کی سرد آہوں کے پس پردہ اصیلیا کا عشق بھی چھپا ہوا تھا جو اس کی بنت عمّ تھی، پریوں جیسی سبز آنکھوں والی لڑکی،

نازک اندام اور ایک مجسّم نغمہ ۔ مگر ہین کی قسمت میں تو ناکامی ہی ناکامی لکھی تھی ۔ وہ سائنس میں اور طالب علمانہ زندگی میں بھی ناکام ہی رہا تھا اور آخر ہر چیز کی رومانی محبّت سے بھی نفرت کرنے لگا تھا ۔ جرمنی کی اُس محبّت سے بھی جس نے جرمنی کو نپولین کی گرفت سے آزاد کرانے کے سِلسلے میں طلبہ کو اپنا شکار بنا لیا تھا ۔ وہ عالموں کے کاغذی عِلم سے بھی نفرت کرتا تھا ۔ بڑے بڑے علما اور ادیبوں کی مُلاقات بھی اس کے اس انداز کو بھی نہ بدل سکی ۔ ان علماء میں شاعرِ آزادی مورتز آرلنسٹ ، جرمنی میں سنسکرت کی تعلیم کا بانی آگسٹ ولہم اور شلیجل بھی شامل تھے ۔

ہین نے قانون کی تعلیم بون ، گوٹنجن اور برلن میں حاصل کی ۔ برلن میں جو چیز اسے سخت ناپسند تھی وہ ضابطے کی پابندی تھی ۔ پھر بھی یہاں ایسے کئی مقامات تھے جہاں آرٹ اور ادب کے تذکرے ہوتے جن میں وہ شرکت کرتا تھا ۔ اس سِلسلے میں اس کی ملاقاتیں سائنس اور دُنیائے ادب کے بڑے بڑے مشہور لوگوں سے ہُوئیں جن میں الیکزنڈر وان ہمبوٹ جو سائنس داں اور جنوبی امریکہ کا سیّاح تھا ۔ اور ہیگل جو مشہور فلسفی تھا اور دُوسرے لوگ شامل تھے ۔ تاہم ہین کبھی برلن کو پسند نہ کرسکا کیونکہ بقول اس کے یہاں کی ریت موٹی اور چائے پتلی ہے ۔ ایک دِن وہ ایک خوب صورت خاتون سے سرد آہ بھر کر کہنے لگا :

"میرے ساتھ ہندوستان چلو جو سورج کا مُلک ہے اور جہاں خُوشبودار پھول ہوا کو معطّر کر دیتے ہیں۔" اس کی بہت سی نظموں میں مشرقی مناظر دکھائے گئے ہیں مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ برلن سے چلا تو اٹلی پہنچا۔ پھر انگلستان آیا اور وہاں سے بحرِ شمالی کے ایک طوفان خیز جزیرے میں جا پہنچا جس کا نام ہیلی گولینڈ ہے۔ وہ ایسی دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتا تھا جو ہر یہُودی النسل کو اس بات پر مجبُور کرتی کہ وہ یورو پین تہذیب میں داخل ہونے کے لیے داخلے کا ٹکٹ خریدے جس کی قیمت عیسائی مذہب کا بپتسمہ تھا۔ ہین نے جو پہلے ہی سے دہریہ تھا، عیسائیت کے داخلے کا ٹکٹ خرید لیا۔ یہ وہ سال تھا جس سال اسے قانون میں ڈاکٹری کی ڈگری ملی تھی۔

"کیا ہی اچھّا ہوتا اگر انسان وقت سے بھی فرار حاصل کر سکتا جیسے وہ ایک مقام سے کر سکتا ہے۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو ہین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہے،

اس ہین نے جو ڈاکٹر آف لا تھا، دو منظوم المیوں اور متعدّد دلچسپ سفرناموں کا مصنّف۔ ۱۸۳۰ء میں جب وہ ہیلی گولینڈ میں تھا، تو اس کو اطّلاع ملی کہ پیرس میں جولائی کے انقلاب میں رحم دل شہری شاہ لوئی فلپ فتحیاب ہو گیا، جس کی فتح حقیقتاً غریبوں کی فتح تھی۔ ہین نے اس وقت کے متعلّق لکھا ہے:

"ایک ماہی گیر میرے پاس یہ خبر لے کر آیا کہ غریب کامیاب ہو گئے مجھے اس سے اِتنی خوشی ہُوئی کہ میں پاگل سا ہو گیا۔"

اور ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقتاً پاگل ہی ہو گیا ہو۔ ورنہ اس میں اتنا جوش و خروش کہاں سے آتا! بہر نوع ۱۸۲۱ء کے موسمِ گرما میں جب ہین پیرس پہنچا جو انقلاب کا مرکز تھا تو شہر اپنے پُورے شباب پر تھا۔ اس نے ہین کو ہاتھوں ہاتھ لیا جو بتیس سال کا ایک بلند و بالا، کشادہ پیشانی اور گھنے عنبریں بالوں کا نوجوان تھا۔ خوب صُورت خواتین دِل و جان سے اس کی پذیرائی کے لیے تیار رہنے لگیں۔ اسی دوران میں اس کی نظر ایک حسین دیہاتی لڑکی پر جم کر رہ گئی جو اپنی چچی کے جُوتے بنانے کے کارخانے میں کام کرتی تھی۔ اس کا نام کریسنشیا تھا مگر ہین کو یہ نام لینے میں تکلّف محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے اس نے اس کا نام میتھلڈ رکھ دیا۔ شرُوع شرُوع میں ان کے طور طریقے کچُھ ایسے ہی رہے کہ وہ بالکل "بچے" معلوم ہوتے۔ اکثر ان کے مابین تُو تُو میں میں ہونے لگتی، لڑائی جھگڑے کی صُورت پیدا ہو جاتی۔ آخر کار آہستہ آہستہ ان کے دلوں میں ایک پائیدار محبّت گھر کرتی گئی۔ سوال یہ ہے کہ اس کھلنڈرے اور بے فکرے جوڑے کا ذریعۂ معاش کیا تھا؟ اس کا جواب پیرس میں ہین کی مقبولیت دے گی۔

اس نے اسی مدّت میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا اور خاصی دولت کمائی تھی۔ کوٹاز البگیمین زیٹنگ اخبار میں نامہ نگار کی حیثیت سے اسے

معقول معاوضہ مِلتا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے اپنی ان کتابوں سے بھی رائلٹی مِلتی تھی جو کہ جرمنی میں ممنُوع تھیں مگر چوری چھپے بِکتی رہتی تھیں۔ اس کا چچا سالومن ہین جو ہیمبرگ کا ایک دولت مند بینکر تھا وہ بھی دِل کھول کر اس کی امداد کرتا رہتا۔ مزید برآں پیرس کے بینکر رتھ چائلڈ سے بھی وقتاً فوقتاً مالی اعانت مِل جاتی تھی۔ بعد کو حکومت فرانس نے بھی اس کی شاعری پر اعزازی پنشن عطا کی۔

۱۸۲۷ء میں اس نے اپنی نظموں کا مجمُوعہ "گیتوں کی کتاب" کے نام سے شائع کیا جو فوری طور پر مشہُور ہو گیا۔ یہ شہرت دائمی تھی۔ اس کے بعد ہی اس کی کئی نظموں کی دُھنیں بنائی گئیں، مثلاً لورلی کا گیت، یہ گیت وائن کی ایک خوبصُورت دوشیزہ کے متعلّق ہے جو اپنے گرویدہ ملاّحوں کو حُسن کے جال میں پھنسا کر پہاڑیوں کی طرف بھٹکا دیتی تھی۔

۱۸۴۳ء میں ہین نے بارہ برس کے طویل عرصے تک باہر رہنے کے بعد جرمنی کا دورہ کیا اور دُوسرے سال اپنے وطن واپس آ گیا اپنی آمد پر اس نے ایک تُند و تلخ کتاب قلم بند کی ہے جس کا نام ہے: "موسمِ سرما کا ایک قِصّہ" یہ ایک منظُوم کہانی ہے جس میں جرمنوں کی کمزوری پر خندہ زنی کرتا ہے۔ جرمنی میں مذہب اور فلسفے کی تاریخ میں وہ جرمن اور فرانسیسیوں کے درمیان مُفاہمت کی کوشش کرتا ہے اور لکھتا ہے "جرمنوں کی ہنسی مت اُڑایئے، وہ خواب و خیال

کے دیوانے ہو سکتے ہیں مگر ان میں سے بعض کے خواب اتنے خوبصورت ہیں کہ میں ان پر دُوسروں کی بیداریاں قربان کر سکتا ہُوں۔"

جب وہ دُوسری بار جرمنی آیا تو وطن کے چند محبوب اہل خیال سے ملا جن میں مشہور ادیب فریڈرک ہیبل اور سوشلسٹ مفکّر کارل مارکس بھی تھے۔

۱۸۴۸ء میں خزاں میں وہ ایک ایسے وبال میں مبتلا ہو گیا جس سے زندگی بھر اس کا پیچھا نہ چھُوٹا۔ یہ درد کی تکلیف تھی جس کے متعلق وہ لکھتا ہے "یہ ایک ایسا جہنّم ہے جسے دماغ میں لیٹے لیٹے بھرنا پڑتا ہے۔" اسے ریڑھ کی ہڈّی کی بیماری ہو گئی تھی جو لاعلاج تھی اور جس میں وہ بقول خود آٹھ سال تک گدّوں کے مقبرے میں پڑا رہا۔ وہ لکھتا ہے "شاید میں اب سے بہت پہلے مر چکا ہُوں — اور شاید بدہئیت نقوش اور خیالی تصوّرات ہیں جو رات کو ایک رنگین جلوُس کی شکل میں میرے دماغ میں چکّر لگاتے ہیں۔"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی نقوش جب اس کے مضامین اور نظموں میں ڈھلتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اسے اُن پر پوُری قدرت حاصل ہے۔ اس کا بیّن ثبوُت اس کی کتاب "رومان سرد" ہے جو ۱۸۵۱ء میں شائع ہوئی۔

پیرس کے رہنے والے یا وارد ہونے والے، جنھیں نام و نمود، عزّت و حُرمت اور عقل و دانش کا کچھ خیال ہوتا، وہ اس کے ہاں

ملاقات کو ضرور جاتے تھے ۔ ان میں ایک سوشلسٹ نوجوان فرڈیننڈ لاسلے بھی تھا ۔ ہین کو اس کی ذات سے بڑی توقعات تھیں ۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب اس کی سیکرٹری بیمار ہو گئی تو ایک عورت نے باہمت میتھل ڈے کو اس کی تیمارداری پر مقرر کر دیا ۔ یہ ملاقات بڑی اندوہناک اور فلسفیانہ تھی ۔ ہین مذاق میں اسے تتلی کہا کرتا تھا ۔ اس نے تتلی سے کہا "الفاظ موجود ہیں مگر عمل کا فقدان ہے ۔ چیز سامنے ہے مگر اس پر دانت نہیں مارے جا سکتے ۔" فروری ۱۸۵۶ء میں اس نے دنیا کو خیر باد کہا اور مونٹ مری کے پُرسکون قبرستان میں دفن ہوا ۔

(جینٹے روبرٹ)

جسٹس فان لیبگ

زرعی سائنس دان اور
(۱۸۰۳ء - ۱۸۷۴ء)
کھاد کا موجد

ایک شخص، جو اسکول میں ناکارہ سمجھا جائے اور ایک امیدوار کیمیا دان کی حیثیت سے بھی ناکام ہو جائے اور اس پر بھی وہ اکیس ۲۱ برس کی عمر میں یونیورسٹی کا پروفیسر بن جائے، وہ کوئی معمولی دل و دماغ کا آدمی تو نہیں ہو سکتا۔ یہ آدمی تھا — جٹس فان لیبگ جو ایک بڑا ماہرِ کیمیا تھا اور واقعی غیر معمولی دِل و دماغ کا اِنسان تھا۔

فان لیبگ ۱۸۰۳ء میں ڈارسٹاٹ کے شہر میں پیدا ہُوا، جو ہیسی میں واقع ہے۔ اس کا باپ محسُوس کرتا تھا کہ اس کے بیٹے میں قابلیت و ذہانت کا جوہر موجُود ہے اور جب وہ گریمر اسکول کا کورس پُورا نہ کر سکا جس کے مضامین اس کے لیے غیر دِل چسپ تھے تو باپ نے اسے یونیورسٹی میں بھیج دیا جو اس زمانے میں سولہ سال کی عمر میں ممکن تھا۔ لیبگ نے یونیورسٹی میں ان چیزوں کو سیکھنے میں محنت کی جن میں وہ اسکول میں ناکامیاب ہُوا تھا۔ ۱۸۲۲ء میں اس کے پروفیسر نے اس کی ذہانت اور محنت سے

خوش ہو کر اس کو پیرس میں حصولِ تعلیم کے لیے وظیفہ دِلا دیا، جو اس زمانے میں سائنسی تجربوں کا مرکز تھا۔ وہاں اس نے لیگوسک کے لیکچروں سے اِستفادہ کیا، گیسوں پر جس کی تحقیقات کا بڑا شہرہ تھا۔

لیبگ جب خود تجربات کی دُنیا میں داخِل ہُوا تو اسے محسُوس ہُوا کہ عالمِ جمادات، عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات کے کیمیاوی اثرات آپس میں ایک رِشتہ رکھتے ہیں، کوئی شے اکیلی قائم نہیں رہ سکتی، سب ایک دُوسرے سے مربُوط ہیں۔ اس تعلّق پر اس نے ایک مقالہ لِکھا جس پر اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈِگری مِلی۔

۱۸۲۳ء میں اس نے دھماکے پیدا کرنے والی چیزوں پر کام کیا جس کی بہت تعریف ہُوئی۔ خاص طور پر الیکزنڈر ہمبوٹ اس سے بہت متأثر ہُوا۔ اس نے ہیسی کے گرانڈ ڈیوک کو لِکھا "وہ ایسا پروفیسر ہو گا جو اپنے مُلک کو عزّت بخشے گا۔" گرانڈ ڈیوک نے جسٹس فان لیبگ کو گیسن یونیورسٹی میں پروفیسر کا عُہدہ دے دیا۔ جو خود اس کی اپنی ریاست کی حدُود میں تھی۔ یہاں پہنچ کر اس نے جو پہلی درخواست کی وہ یہ تھی کہ تعلیم کے کاموں کے لیے ایک لبوریٹری بنائی جائے، دوسرے مضامین کے پرانے پروفیسروں نے اس کی راستے میں روڑے اٹکائے مگر لیبگ نے کسی نہ کسی طرح حکومت کی منظوری حاصِل کر لی اور اِدھر اُدھر سے روپیہ

جمع کر کے ایک بہت چھوٹی سی لیبوریٹری بنالی جس میں بڑا مختصر سا سازوسامان تھا۔

پہلے تو لوگوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر ۱۸۲۷ء اور ۱۸۲۸ء کے موسمِ سرما کی شش ماہی میں سب جگہیں پُر ہو گئیں۔ لیبگ کی تعلیم کے دو اصُول تھے، غیر نامیاتی اور نامیاتی کیمیا کا تجزیہ اور اس کی تحقیقات۔ فی زمانہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مگر اُس زمانے میں اس کو ایک عجوبہ سمجھا جاتا تھا۔

گیس میں اس نے ایک بہُت ہی اعلیٰ تجزیے کی بُنیاد ڈالی۔ وہ یہ کہ نامیاتی مرکّبات میں کاربن اور ہائیڈروجن کا کتنا حصّہ ہے؟ اس کے علاوہ اس نے علمِ امراض اور علمِ بدن میں پہلے پہل کیمیا سے کام لیا اور زراعت کے سلسلے میں بھی اس کا استعمال کیا۔ ۱۸۳۲ء میں اس نے اپنے ایک دوست فریڈرک ووہلر کی مدد سے ایک قرطاس شائع کیا جو کڑوے باداموں کے تیل کے متعلق تھا اور جس میں یہ دِکھایا گیا تھا کہ اصل جوہر بنزول بہُت سے مرکّبات کی تیاری میں ایک ناقابلِ تبدیل جوہر کی صُورت میں کارآمد ہے۔

حیوانی عِلمِ بدن میں اس نے یہ دِکھانے کی کوشِش کی کہ کیمیاوی اور طبعی قوانین زندگی تندرستی کو برقرار رکھنے میں کس طرح معاون ہوتے ہیں۔ اس نے ایسی چیزوں کا بھی تجزیہ کیا جو

اِنسانی صحّت کے لیے ضروری ہیں۔ جیسے صفرا، خون، قارورہ۔ اپنا کچھ وقت اس نے پکانے کے فن پر بھی صرف کیا۔ منشاء اس کا یہ تھا کہ ایسے عرقیات جو قیمتی ہیں، محفوظ کر لیے جائیں۔ کھانے کی تحقیقات کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز بنا لینا چاہتا تھا جو اطمینانی طور پر ماں کے دُودھ کا متبادل ہو سکتی۔

لیبگ کا نام آج کل اس تحقیقات کے سبب سے بہت مشہور ہے جو اس نے زراعت پر کی تھی۔ ۱۸۴۰ء میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "زراعت اور علمُ الابدان میں نامیاتی کیمیا اور اس کا استعمال" جس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہُوا اور اس کے متعدد اڈیشن شائع ہُوئے۔ یہ کتاب عالموں کے طبقے اور کم پڑھے لوگوں میں یکساں پسند کی گئی۔ اس کے بعد اس نے ایک دُوسری کتاب شائع کی جس کا نام تھا "علم الامراض اور علم الابدان میں نامیاتی کیمیا اور اس کا استعمال"۔ اس نے لکھا ہے "یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ کیمیاوی طاقتیں زندہ جسم میں ہمیشہ برسرِ کار رہتی ہیں"۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کیمیاوی اجزاء نامیاتی قسم کے ہوتے ہیں کیونکہ وہ جمادات سے تعلّق رکھتے ہیں۔ زندگی کی اس نے ایک نئی شکل پیش کی اور بتایا کہ موت جو ایک سلسلے کو ختم کر دیتی ہے، دُوسرے سلسلے کے لیے زندگی کا باعث بنتی ہے۔ اس نے اِس بات کی بھی تحقیقات کی کہ پودے اپنی غذا کیسے حاصل کرتے ہیں؟"

اس زمانے کے لوگوں کی عام رائے کے خلاف اس نے تحقیق کیا کہ کھاد پودوں کو غذا نہیں پہنچاتی بلکہ نامیاتی اجزاء، جو کھاد کے سڑنے کے بعد اس سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ یہ کام انجام دیتے ہیں، وہ نئی چیزوں کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔ پودوں کے مرنے اور سڑنے کے بعد یہ اجزاء پھر زمین میں مِل جاتے ہیں۔ لیبگ نے اس کا بھی انکشاف کیا کہ اگر ان میں سے ایک جُز بھی ضرورت سے کم ہو تو خواہ کچھ بھی کیا جائے پودے کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔

اِن سب باتوں کا مطلب یہ ہُوا کہ سائنس کی تاریخ میں لیبگ کا ایک مقام تھا بلکہ حقیقتاً اس کی ہستی اس سے بھی اعلیٰ اور ارفع تھی۔ ان امور کے بعد اس نے زندگی کے چکّر کی طرف توجّہ کی اور اپنے الفاظ میں اس پر روشنی ڈالی کہ تمدّنی خلفشار سے دور افتادہ خطوں اور غریب کسانوں کے ماحول میں فِطری زندگی کا پہیّہ چلتا رہتا ہے اور اس کی رفتار میں کوئی خلل نہیں پڑتا مگر بڑے بڑے شہروں کے بننے سے اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ زمین روز بروز کم زور ہوتی جا رہی ہے اور اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو آخر میں بنجر ہو جائے گی۔ لیبگ کا یہ خیال تھا کہ بہت سی بڑی بڑی تہذیبیں اس لیے برباد ہو گئیں کہ اُن میں شہریت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کا ایک قول یہ بھی تھا کہ روما کی نالیاں سلطنتِ روما

کی دولت کو بھلا بیٹھے گئیں۔ وہ بڑے شہروں کی اہمیت کو بھی سمجھتا تھا اور ان کے وجود کو بھی ضروری قرار دیتا تھا۔ اسی لیے اس نے معدنی پیداوار سے توازن کو درست کرنے کی کوشش کی اور پیشین گوئی کی "ایک زمانہ ایسا آئے گا جب کھیتوں اور پودوں کے لیے کھاد کارخانوں میں تیار کی جائے گی۔" لیبگ اس طریقے کو مصنوعی نہ سمجھتا بلکہ اپنے نزدیک تو وہ زندگی کے پہیئے کا چکر درست کر رہا تھا۔ اس کے اِس خیال کی بڑی مخالفت کی گئی۔ خاص طور سے جرمن کسانوں نے تو اسے سخت ناپسند کیا۔ ایک شخص نے تو یہاں تک کہہ دیا "اگر کوئی شخص جو کھاد کی مخالفت کرتا ہے اس کو باندھ کر جلا دینا چاہیے۔"

لیبگ نے پہلے پہل گیسن کے نزدیک ایک چھوٹے سے ریتلے قطعۂ زمین پر جو تجربے کیے وہ ناکام ہو گئے اور ایک عام رائے قائم کر لی گئی کہ اس کا خیال صحیح نہیں ہے مگر دراصل اس نے ایک غلطی کی تھی۔ وہ یہ کہ اس نے ایسا مرکب بنایا تھا جو ٹھنڈے پانی کے سوا عام طور پر حل نہ ہو سکتا اور زمین میں جذب نہ ہو سکتا تھا۔ ۱۸۵۰ء کے قریب برطانیہ میں مختلف تجربوں کے بعد اس غلطی کی گرفت کی گئی کہ زمین کی مٹّی میں یہ خاصیت ہے کہ پودوں کو جس نمکین حل پذیر مادے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے جذب کر لیتی ہے اور بارش کے باوجود اپنے میں محفوظ رکھتی ہے۔ لیبگ نے اپنی

اس فروگزاشت کو خدا کی ناانصافی قرار دیا۔ کچھ دنوں بعد جرمن کسانوں نے اس کی نئی تحقیقات کو کافی اہمیت دی۔ اور اُنھوں نے طے کیا کہ اسے کوئی اعزاز بخشا جائے۔ اس پر لیبگ نے کہا کہ وہ ایک فاؤنڈیشن قائم کرنا پسند کرے گا چنانچہ ۱۸۷۰ء میں اس کو لیبگ فاؤنڈیشن کا پہلا سونے کا تمغہ دیا گیا۔

مالتھس نے کہا تھا کہ دُنیا کے ہر آدمی کو غذا مہیا کرنا ممکن نہیں، لیبگ نے بتایا کہ یہ غلط ہے اگر پورے ذرائع سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا اور ظاہر ہے کہ بحالتِ موجودہ تمام ذرائع کو استعمال نہیں کیا جا رہا۔

(ارنسٹ ہاکس)

رچرڈ ویگنر

(۱۸۱۳ء - ۱۸۸۳ء) موسیقار

رچرڈ ویگنر یوروپین موسیقی کے ماہرین میں ایک بلند مقام رکھتا ہے اس کے اوپیرا یا بقول اس کے موسیقی کی تمثیلیں، جن میں جرمن دیومالائی کہانیاں موسیقی کا لباس پہنے ہوئے تھیں، اپنے دور میں اتنی انقلاب انگیز ثابت ہوئیں کہ دوسرے لکھنے والے بھی نئے نئے راستے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ موسیقی کی تمثیل کا بنیادی تصور محبت کے جذبے کو اکساتا ہے اور قوت فہم کے بجائے احساسات کو متاثر کرتا ہے۔

ویگنر کی پہلی تصنیف جس وقت منظر عام پر آئی اس وقت سے اس کی ذات بحث کا ایک موضوع بن گئی ہے جو کئی پہلو رکھتی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا اور خیال ہے کہ وہ ایک مثالی جرمن تھا، دوسرے اس کی موسیقی کو روایتی یوروپین موسیقی کی پیداوار قرار دیتے ہیں اور ماضی و مستقبل دونوں کے لیے ایک اشاریہ ٹھہراتے ہیں۔

خود ویگنر کو موسیقی کے علاوہ بدھ مت کی طرح دوسری روایات سے بھی بہت دلچسپی تھی، ہندوستان کی ثقافتی روایتوں کے بارے میں اس کی رائے بہت اچھی تھی، ایک بار اس نے لکھا کہ مشرق کی قدیم و عظیم خالص

انسانی تہذیب کے مقابلے میں ہماری پوری ثقافت کتنی حقیر معلوم ہوتی ہے
رچرڈ ویگنر کے حالاتِ زندگی بھی ایک ناول کی طرح ہیں۔ اُس کی اصالت کا بھی کچھ صاف صاف پتا نہیں چلتا۔ مئی ۱۸۱۳ء میں وہ لیپ زیگ میں پیدا ہوا۔ کہنے کو وہ ایک پولیس افسر کا بیٹا تھا۔ مگر یہ صورتِ حال تو وہ ہے جو تحریر میں آئی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ درحقیقت وہ ایک ایکٹر اور شاعر لڈوگ گیر کا بیٹا تھا جس نے بعد کو اس کی ماں سے شادی کر لی تھی۔

ویگنر نے دو قدیم تعلیم گاہوں میں تعلیم پائی جو اس وقت اپنی موسیقی کی تعلیم کے لیے مشہور تھیں۔ ان میں سے ایک تو ڈرسڈن کی اسکول آف دی کراس تھی، دوسری لیپ زیگ کی ٹامس اسکول کی تعلیم گاہ، جہاں کسی زمانے میں جان سیباسٹین بیگ کام کرتا تھا۔ لیپ زیگ یونیورسٹی میں بھی کچھ دنوں تک اس کی موسیقی کی تعلیم کا سلسلہ رہا تھا۔ قدرت نے اس کو موسیقی کی فطری صلاحیت سے نوازا تھا۔ اس کا پہلا اور واحد نغمہ ہی اتنا کامیاب ہوا کہ اس کو ورزبرگ میں موسیقی کا ہدایت کار مقرر کر دیا گیا۔ اس لیے کچھ عرصے کے لیے اسے اپنے گھر سیکسونی کو چھوڑنا پڑا۔ ایک سال بعد وہ تھیٹر والوں کے ساتھ سیکن سے گزرا تو اس کی ملاقات ایک ایکٹریس سے ہو گئی جس کا نام منا پلانر تھا۔ بعد کو اس نے کونگزبرگ تک اس کا پیچھا کیا جو مشرقی پروشیا کا دارالسلطنت تھا، پھر ان دونوں نے شادی کر لی۔
ویگنر کو ریگا میں موسیقی کے ہدایت کار کی حیثیت سے ایک جگہ مل گئی جو

۱۸۴۹ء میں اس کو عین اس وقت ڈرسڈن سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی۔ جبکہ موسیقی کی دنیا نے اس سے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

ویگنر نو برس تک سوئٹزرلینڈ میں رہا۔ پھر اٹلی چلا گیا۔ اس کے بعد پیرس چلا گیا جہاں سے بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی دوران اس نے اپنی جماعت کے ساتھ روس، ہنگری اور ویانا کا دورہ کیا۔ وہ ویانا جو مزارت اور بیتھوون کا شہر تھا۔ ہر مقام پر بڑے جوش وخروش سے اس کا خیر مقدم کیا گیا لیکن اس کی آمدنی اس کی شاہ خرچی کے مقابلے میں بہت کم تھی لہٰذا اس کو قرض خواہوں کی قید کے خوف سے ویانا سے بھی بھاگنا پڑا۔ ۱۸۶۴ء میں جب وہ اسٹیٹ گارٹ میں تھا، جو جرمنی کے جنوب مغربی حصے میں ہے تو اسے بیوایا کے بادشاہ لڈوک دوم کی طرف سے میونک آنے کا پیغام موصول ہوا اور وہ اسی طرف روانہ ہوگیا۔ نوجوان بادشاہ اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس کا دوست اور سرپرست بن گیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ٹرسٹان اور آئی سولڈے کو پہلی مرتبہ پیش کیا جن کو اس نے سوئٹزرلینڈ میں تصنیف کیا تھا۔ اس مقام پر اسے رہائن لینڈ کی ایک شاعرہ میتھلڈ ولینڈ ونک سے محبت ہوگئی تھی۔ اس کھیل میں اس کی محبّت کا عکس پایا جاتا ہے۔

ٹرسٹان اور آئی سولڈے محبت وموت کے راز ونیاز پر ایک زندہ تصنیف ہے اور ویگنر کا ایسا کارنامہ جس کے مضمون اور موسیقی میں وہ اپنے جذبات کے دھارے پیش کرتا ہے۔ اس تمثیل کی موسیقی بھی نئے

روسی بالٹک پراونس لیٹویا کا دار السلطنت تھا۔ مگر جلد ہی وہ اپنے رئیسانہ اخراجات کے سبب بہت مقروض ہو گیا۔ آخر کار اس نے قرض خواہوں سے بچنے کے لیے لندن جانے کا ارادہ کر لیا۔ راستے میں اس کا جہاز زبردست طوفان میں پھنس گیا جس سے اس کو خیال پیدا ہوا کہ وہ جلد پرانے قصے فلائنگ ڈچ مین پر ایک اوپیرا لکھے گا۔

ویگنر لندن میں بہت کم عرصہ مقیم رہا اور جلد ہی پیرس آگیا جو دُنیا کا ایک مخصوص شہر اور مختلف اقوام کا فنون لطیفہ کا مرکز تھا۔ پیرس میں سارے زمانے کے بڑے مشہور شاعر بھی رہتے تھے یعنی اٹلی کا روسینی اور اسپونٹینی، پولینڈ کا چوپن اور جرمنی کا میربیر جو گرانڈ فرنچ اوپیرا کا سب سے بڑا ماہر مانا جاتا تھا۔ اوپیرا کی یہ قسم مختلف فنون کا مجموعہ تھی جس میں اٹلی کا رومانتی گانا، جرمنی کی نغمہ کاری، فرانسیسی سازینہ اور طرح طرح کے رقص اور نغموں کے مناظر شامل تھے اور جن میں پُر اثر ڈرامائی طمطراق نے چار چاند لگا دیے تھے۔ ویگنر کا پہلا اوپیرا رینزی جو پیرس میں مکمل ہوا تھا، پوری طرح میربیر سے متاثر ہے۔ اس کے بعد ڈرسڈن کے درباری تھیٹر نے اس کے اوپیرا کو کھیلنے کے لیے قبول کر لیا اور ویگنر نے فرانس چھوڑ دیا، جہاں وہ بالکل مجبوری سے ٹھہرا ہوا تھا ـــــ پیرس سے چل کر وہ جرمنی آگیا اور ڈرسڈن درباری آرکسٹرا کا ہدایت کار مقرر ہو گیا۔ اگلے برسوں میں اس نے اپنے موسیقی کے ڈرامے فلائنگ ڈچ مین اور ٹان ہاسر پایۂ تکمیل کو پہنچائے۔ اسی قیام میں اسے ایک انقلابی مجرم قرار دے دیا گیا اور

قسم کی ہے جو نہایت تابناک صورت میں آگے بڑھتی ہے۔ مگر سُروں کی ہم آہنگی سے بے نیاز جو اس سے قبل کسی نغمے کے لیے انتہائی اہم عنصر تھی۔ بالکلیہ موسیقی کا دارومدار زیادہ گونجنے والی آواز پر ہوتا ہے جو اس انداز سے بہت مطابقت کرتا ہے جس کو فرانس میں کلاڈ ڈے ڈیبسی اور جرمنی میں رچرڈ اسٹراس نے اختیار کیا تھا۔ یہ دونوں بیسویں صدی کے بہترین غنائی تمثیل کار تھے۔ یہی طریقہ اٹلی کے گیاکو موپکین کا بھی تھا۔ اس طرح پہلی بار موسیقی کے ذریعے آہنگ ساز کا التزام کیے بغیر احساسات کو بے نقاب کیا گیا تھا اور جذبات کی واضح ترجمانی کی گئی تھی جس سے اس دور کی ہلکی پھلکی موسیقی بہت متاثر ہے۔

ٹرسٹان نے ایک ہلچل مچادی۔ پریس نے وگینر کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا جس میں اس کے ساتھ ساتھ بادشاہ کو لپیٹ لیا گیا تھا جس نے اسے امداد دی تھی حالانکہ اس کا نام کہیں بھی نہیں لیا گیا تھا۔ وگینر اس مخالفت پر سینہ تان کر سامنے آگیا جس سے بیوریا کا بادشاہ بڑی الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے دیگنر کو ہدایت کی کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ملک چھوڑ دے چنانچہ وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا جہاں سے جنوبی فرانس آگیا جہاں اس نے اپنی ہلکی پھلکی موسیقی کا دوسرا اوپیرا مکمل کیا جس کا نام تھا "نورمبرگ کے موسیقار"۔ اسی زمانے میں اس کی بیوی منا کا انتقال ہوگیا۔ میتھلڈے ولینڈ ونک کے ساتھ اس کی محبت کے بعد اس سے علیحدہ ہوگئی تھی۔ اب دیگنر کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ وہ کوسیما فان بلو سے

شادی کر لے جو ایک موسیقار اور پیانو نواز فرانز لزٹ کی بیٹی تھی اور جس سے اس کے کئی سال سے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ خاتون بعد کو بھی اس ٹرسٹ کی متولی ہُوئی جو ویگنر نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا ۱۸۶۹ء میں وہ اپنے شوہر ہنس فان بلو سے طلاق حاصل کر سکی جس کے ایک سال بعد ویگنر نے اس سے شادی کر لی۔

اگلے چند برسوں میں اس نے اپنی ایک اور تصنیف مکمل کی جس کا نام تھا "رنگ آف دی بنلنگ" یہ تصنیف چار حصوں میں منقسم تھی جس کا ہر حصہ ایک ایک شام کو دکھانے کے لیے تھا۔ اس عظیم تصنیف کے مضامین و موسیقی ویگنر کے شاہکار ہیں ——— جس میں ازمنہ وسطیٰ کی رزمیہ نظموں کو اس نے اپنے سانچے میں ڈھالا ہے اور پرانی جرمن نظم کی صفت اپنائی گئی ہے یعنی جن الفاظ پر نظم میں زور ہو، وہ ایک ہی طرح کی آواز سے شروع ہوں۔ موسیقی کے نقطہ نظر سے آرکسٹرا پر زیادہ توجہ دی گئی ہے، گانے والوں کی روایتی اہمیت کو کسی حد تک پیچھے ڈال دیا گیا ہے اور تمام موسیقار اپنے نغمے آرکسٹرا کے پس منظر میں گاتے ہیں اس تمثیل کا یورپ کے اوپیرا پر کافی اثر پڑا۔ چونکہ رنگ آف دی بنلنگ کے مظاہرے کے لیے بیوریا کے بادشاہ اور چند دوستوں کی مدد حاصل کی اور بیری یوتھ میں ایک تھیٹر کی تعمیر شروع کر دی جو اب بھی ویگنز میں موسیقی کا مرکز ہے۔ ۱۸۷۶ء میں اس میں رنگ آف دی بنلنگ کو مصنف کی زیرِ ہدایت دکھایا گیا اور ناظرین سے خراجِ تحسین حاصل کیا گیا۔

اس کی آخری تصنیف "پارسی فل" جو ایک مذہبی ڈرامہ تھا، ۱۸۸۲ء میں پہلی بار بیری یوتھ میں دکھایا گیا اور بہت کامیاب ہُوا۔

اسی سال موسم خزاں میں وگینر مع اپنے خاندان کے اٹلی روانہ ہُوا۔ ۱۲ فروری ۱۸۸۳ء کو اس پر دل کا دورہ پڑا اور وینس کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا مگر وہ بیری یوتھ میں اپنے گھر کے باغیچے میں دفن کیا گیا۔

کوسیما اس کی بیوہ ۱۹۳۰ء تک زندہ رہی۔ وہ اس کے مرنے کے بعد ہر سال بیری یوتھ میں ایک مجلس موسیقی کا التزام کرتی اور اس کی یاد کو تازہ کرتی رہتی۔ پھر اس کے لڑکے سیگ فریڈ نے جو خود بھی ایک مصنف تھا، اور اس کے دو پوتوں نے اس روایت کو قائم رکھا۔ آج بھی دنیا کے بہترین وگینرین ہدایت کار موسیقار ہر سال بیری یوتھ آتے ہیں اور رچرڈ وگینر کا کلام پیش کرتے ہیں۔

(کرٹ ڈیڈھی رکس)

ایڈالف کولپنگ

جرمنی میں مزدوروں کی اصلاحی تنظیم کا بانی

(۱۸۱۳ء - ۱۸۶۵ء)

صنعتی انقلاب جب یہ لحاظ کیے بغیر مسلط کر دیا گیا کہ اس کی کیا قیمت ادا کی گئی ہے، تو اس سے ایک غیر متوقع ابتری پھیل گئی۔ وہ کارخانے جن میں تربیت یافتہ کاریگر کام کرتے تھے، بند ہو گئے اور ایسے کارخانے جن میں نیم تربیت یافتہ یا غیر تربیت یافتہ لوگ تھے، کھل گئے۔ انسانی خودداری اور وقار کو صنعتی مزدور طبقے کے مفاد کی خاطر خوف ناک طریقے پر مجروح کیا گیا۔ مزدوروں کی رہائش ایسی تھی کہ صفائی ایک خواب و خیال بن کر رہ گئی۔ لوگوں کی بڑی تعداد کام کی تلاش میں شہر بہ شہر گھومنے لگی۔ طرح طرح سے برباد ہوتی رہی اور کام نہ ملنے کی صورت میں وہیں کی ہو کر رہی۔ البتہ ان لوگوں کو تباہی کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوا جو اُجرت پر کام کرنے والے یا تربیت یافتہ کاریگر تھے۔ ایسے آدمی جب کام سیکھنے میں کامیاب ہو جاتے تو عام طور پر جرمن کی سڑکوں پر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے، ایک کارخانہ دار کے پاس سے دوسرے کارخانہ دار کے پاس جاتے اور اس طرح اپنے تجربوں میں اضافہ کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی تھوڑی سی سیر بھی کر لیتے۔ ۱۸۴۰ء، ۱۸۵۰ء اور

۱۸۶۰ء کے درمیان یہ صورتِ حال بدل گئی اور بے روزگاری کا خوف ان پر بھی مسلط ہو گیا۔ ایڈ الف کولپنگ، جو اجرت پر کام کرنے والے تربیت یافتہ کاریگروں کا باپ کہلاتا ہے، اس نے اس موقع پر ان کے لیے بہت کچھ کیا۔

کولپنگ ۱۸۱۳ء میں کولون کے نزدیک ایک مقام پر پیدا ہُوا۔ اس نے بڑی مصیبتیں جھیل کر کامیابی حاصل کی۔ ان مصیبتوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ غریب والدین کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ اوائل عمر ہی میں اس کو ایک جفت ساز کے پاس کام سیکھنے کے لیے بٹھا دیا گیا اور جب وہ کام سیکھ گیا تو کولون میں ایک کارخانہ دار کے یہاں کام کرنے لگا۔ وہ کولپنگ سے اتنا خوش ہُوا کہ اس نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کر دینے کا ارادہ کر لیا مگر کولپنگ کا پروگرام ہی کچھ اور تھا۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ کسی گرجا گھر میں داخل ہو جائے گا اور اس طرح بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کام کرے گا۔ چونکہ وہ رومن کیتھولک کا عقیدہ رکھتا تھا اس لیے شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا مگر قبل اس کے کہ وہ پادری بن سکے اور اس زندگی کا آغاز کر سکے جو اسکا نصب العین تھی، اس کو اپنی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ کیونکہ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے وہ اس معاملے میں اب تک بالکل کورا تھا۔ اس مقصد کی خاطر پہلے اس نے گھر پر پڑھنا شروع کیا تاکہ حرف شناسی ہو جائے۔ پھر اسکول میں داخل ہو کر پڑھنے والے بچوں میں شامل ہو گیا۔ یہ ۱۸۲۷ء کا واقعہ

ہے۔ حسبِ توقع پہلے تو اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی۔ کیونکہ ایک سن رسیدہ آدمی کے لیے یہ بہت مشکل تھا کہ وہ اسکول کے بچّوں کی عادتیں اختیار کرے۔ بہرصورت وہ چار برس میں اس قابل ہو گیا کہ اسکول لیونگ کا امتحان پاس کر سکے چنانچہ یہ امتحان پاس کر کے اس نے سارٹیفکٹ اپنی جیب میں رکھا اور دینیات کی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تعلیم کے دوران ایک شخص اس کی سرپرستی کرتا رہا جو اس سے بہت پر اُمید تھا اور آخر کار ۱۳، اپریل ۱۸۴۵ء کو اِسے پادری بنا دیا گیا اور سب سے پہلے البر فلڈ وو پرٹل کے ایک اسکول میں بطور چیپلین اس کا تقرر ہو گیا۔

البر فلڈ وو پرٹل کے نزدیک ایک صنعتی شہر ہے جو اس زمانے میں بے روزگاروں کی آماجگاہ تھا اور صنعتی انقلاب کے طوفان کے سبب پیچھے رہ جانے والے لوگ اس کے گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ چہار جانب ایک معاشرتی بدحالی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی ——

لوگوں کو اس طرح تکلیف میں دیکھ کر کولپنگ پر بڑا اثر ہوا۔ اُس نے طے کیا کہ وہ ایک ایسی سوسائٹی بنائے گا جو کم سے کم تربیت یافتہ کاریگروں کی امداد کر سکے۔ اس منصوبے میں اسے اتنی کامیابی ہوئی کہ نیم تربیت یافتہ کاریگروں کی ایسوسی ایشن سارے جرمنی میں پھیل گئی۔ پھر اس کا دائرہ کار جرمنی کے سرحدی علاقوں سے آگے بڑھ

کر دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا۔ اس کی پہلی شاخ کی بنیاد کولون میں ڈالی گئی اور ۱۸۴۹ء میں جرمن انقلاب کے ناکام ہونے کے بعد ایڈالف کولپنگ بھی اس مقام پر منتقل ہو گیا۔ یکم مئی ۱۸۵۰ء میں رہائن لینڈ میں ایسوسی ایشن کی اتنی شاخیں قائم ہو گئی تھیں کہ ان کا گروپ بنایا جا سکتا۔ ۱۸۵۵ء میں ایسوسی ایشنوں کی تعداد ایک سو چار ہو گئی جن میں بارہ ہزار ممبر تھے۔ اس کے نو سال بعد یہ تعداد اور بڑھ گئی یعنی چار سو بیس تک پہنچ گئی اور اس کے ساٹھ ہزار ممبر ہو گئے آگسٹ بیبل، جس نے آگے چل کر سوشل ڈماکریٹک پارٹی قائم کی، وہ بھی فری برگ اور سالزبرگ کے کیتھولک کاریگروں کی ایسوسی ایشن کا ممبر تھا۔ اس نے وہاں جس باہمی ہمدردی کا مشاہدہ کیا، اس کا تذکرہ اس نے بڑے صدق دل کے ساتھ کیا ہے

کولپنگ کی اس تحریک کے مقاصد قطعی طور پر غیر سیاسی نہیں تھے ۱۸۶۳ء میں فرڈی ننڈ لاسلے نے جب جنرل جرمن ورکرس ایسوسی ایشن قائم کی تو اسے یہ بات پسند آئی کہ اب کاریگر بھی اپنے آپ کو معاشرے میں کسی درجے کا مستحق سمجھنے لگے ہیں۔ یہ صورتِ حال انتہا پسندی کی طرف بھی ایک دعوتِ فکر تھی مگر اس نے اس کو آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ اس کو یہ خیال بھی تھا کہ سوشل ترقی پر زور دینا کچھ زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ وہ کاریگروں کی تحریک کے بعض پہلوؤں کو قابلِ تعریف سمجھتا تھا مگر اس کا قول تھا کہ ان کی پریشانیاں درحقیقت

اتنی سطحی نہیں ہیں جتنی معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ وہ کافی گہری ہیں اور اوپر کھال کے بجائے پیٹ کے اندر رہیں۔ جسمانی تکالیف اور ظاہری بربادی سے زائد ان کو مفلسی کا غم ہے جو دل کی بیماری کے مترادف ہے۔ اسے اس بات کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ اپنے طرزِ معاشرت کے اونچا کرنے کے "چکر" میں صنعتی پرولتاریت کی تکمیل کرنے سے غافل ہو جائیں جو سوسائٹی اور مذہب سے بھی متعلق تھی —— اور اس کے لیے صرف جذبات کافی نہیں تھے بلکہ عمل کی بھی ضرورت تھی۔ کولپنگ آدمیوں کو آدمی سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ سب سے چھوٹی انسانی وحدتوں یعنی خاندانوں کو اس کی کوششوں کا مرکز بننا چاہیے لیکن اس زمانے کی معاشرتی ضروریات کے باعث بہت دشوار تھا کہ وہ خاندان بنانا شروع کریں یا اپنے گھروں سے رابطہ قائم رکھیں۔ اس لیے کولپنگ نے ایسوسی ایشنوں کو خاندانی وحدت کا درجہ دیا اور یہ صورت ۱۸۶۵ء میں اس کی موت کے بعد بھی باقی رہی۔

فی زمانہ کولپنگ خاندان پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے ہیں اور ان کی نمائندگی اٹھارہ ملکوں میں ہوتی ہے جن کے تین لاکھ پچاس ہزار ممبر ہیں اور چار ہزار مقامی گروپ۔ ساری دنیا میں تقریباً چار سو کولپنگ گھر ہیں جو کولپنگ خاندانوں کے اراکین کو گھر مہیا کرتے ہیں۔

کولپنگ خاندان ترقیاتی امداد کے سلسلے میں برابر مصروفِ عمل ہیں اور اب "کیتھولک چرچ فریٹر کمپین" کا ایک حصّہ بن چکے ہیں۔ اس کے

کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ہندوستان اور پاکستان میں بھی پائی جاتی ہے اور یہ نوجوانوں کو مختلف فنون کی تعلیم دیتی ہے، جیسے موٹر انجینئرنگ، الکٹرک انجینئرنگ اور زراعت۔ اس طرح یہ سلسلہ اب تک اپنے بانی کے نظریات کا حامل ہے اور معاشی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

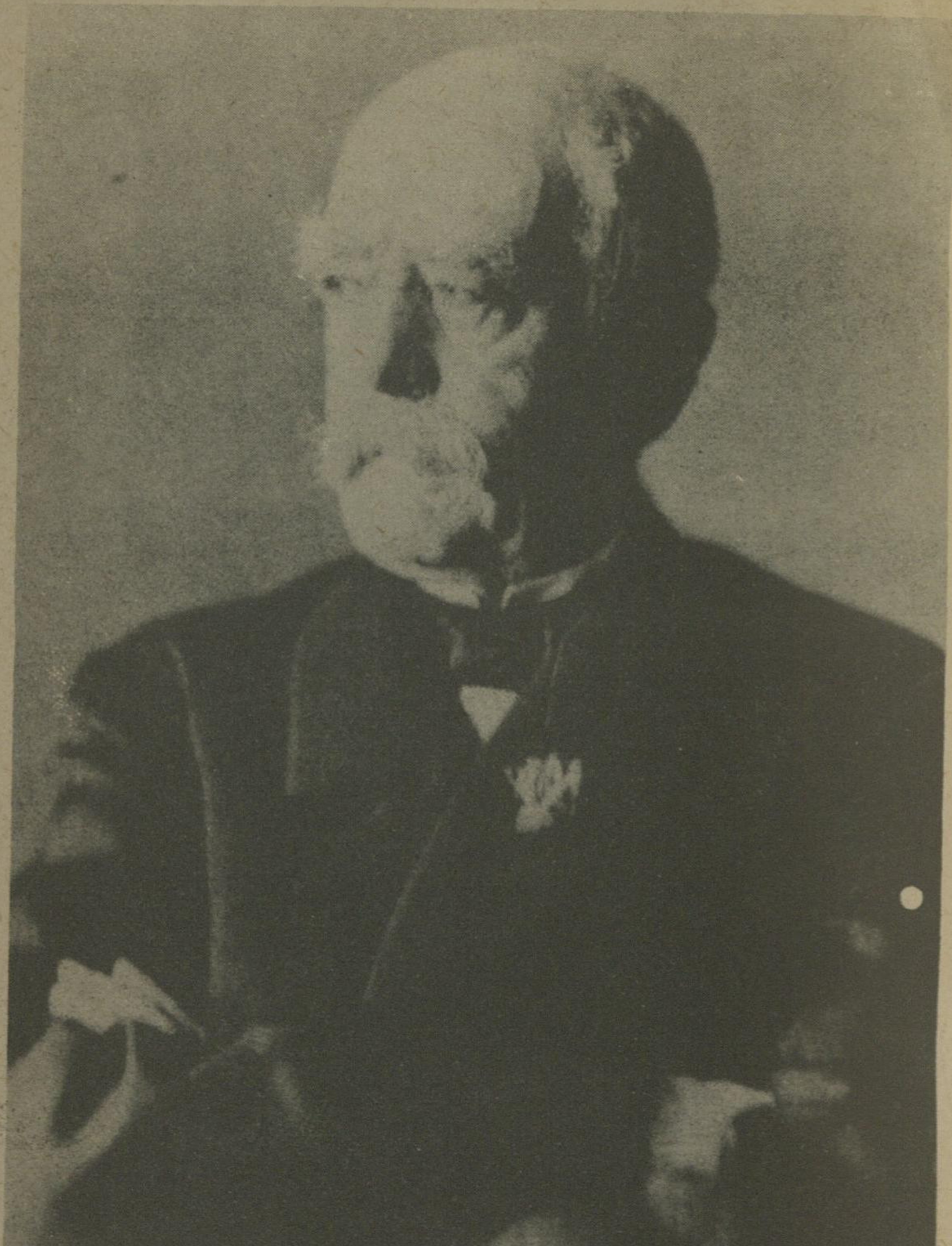
(ہرمن۔ ایم۔ اسٹینر)

اوٹو فان بسمارک

(۱۸۱۵ء - ۱۸۹۸ء) سیاستدان

ویانا کی کانگرس، جو نپولین کی جنگی تباہ کاری کے بعد، ۱۵-۱۸۱۴ء میں منعقد ہوئی، اس میں یورپ کی ازسرِنو تشکیل کی گئی اور طے پایا کہ جرمنی کی ریاستوں کا ایک وفاق قائم کیا جائے جس کے دو خاص ارکین آسٹریا اور پروشیا تھے۔ یہ وفاق باوجود اپنی کمزوریوں کے، ۱۸۶۶ء تک قائم رہا جس کے بعد اس کی جگہ شمالی جرمن وفاق نے لے لی اور جس پر پروشیا کو غلبہ حاصل رہا۔ یہ سب کچھ اوٹو فان بسمارک کا کارنامہ تھا۔

اوٹو فان بسمارک شون ہاسن میں پیدا ہوا تھا جو دریائے ایلب پر برلن کے قریب مغرب کی سمت واقع ہے۔ اس کا سن پیدائش ۱۸۱۵ء ہے۔ یہی وہ سال ہے جب ویانا کی کانگرس کا انعقاد ہوا تھا۔ یوں تو عموماً جرمنی کے معاملات میں اسے دخل رہا۔ مگر حقیقی اقتدار اس وقت حاصل ہوا جب پروشیا کے بادشاہ ولہم اوّل نے ۱۸۶۲ء میں اس کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ بادشاہ ایک ایسا مضبوط آدمی چاہتا تھا جو مخالفت کے باوجود فوجی منصوبے پورے کر سکے۔ بسمارک نے پارلیمنٹ



آٹو فان بسمارک
سیاست دان

کو ختم کر دیا اور اس کی منظوری کے بغیر فوج کے لیے روپے کا انتظام کر لیا اب وہ اس قابل تھا کہ ملک کے جرمن بولنے والے حصوں میں پروشیا کا سب سے بڑا رقیب تھا۔ یہاں شلیس وگ اور ہولسٹین کا سوال اٹھایا جا سکتا تھا اور مقصد براری کے اسباب پیدا کیے جا سکتے تھے۔

شلیس وگ اور ہولسٹین دو چھوٹی ریاستیں تھیں جو جزیرہ نمائے جٹ لینڈ پر واقع تھیں اور جن کا شمالی حصہ اب ڈنمارک میں شامل ہے۔ یہ دونوں ریاستیں ڈنمارک کی حکومت کے ماتحت تھیں حالانکہ وہاں کے لوگ صرف جرمن زبان بولتے تھے۔ اسی زمانے میں ڈنمارک کے بادشاہ نے بعض قوم پرستوں کی تحریک پر ایک کوشش کی کہ ان ریاستوں کو باقاعدہ ڈنمارک میں شامل کر لے۔ ۱۸۶۳ء میں اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان ریاستوں اور ڈنمارک کے بیے ایک مشترک آئین بنا دیا گیا جس کو رد کرنے کے لیے پروشیا اور آسٹریا نے ڈنمارک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ نتیجے میں ڈنمارک کو شکست ہو گئی۔ بسمارک نے طے کیا کہ شلیس وگ آسٹریا کے زیر نگیں رہے اور ہولسٹین پروشیا کے زیر حکومت آ جائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ صورت اختلاف کا باعث ہو گی اور ہوا بھی ایسا ہی، ۱۸۶۶ء میں دونوں کے مابین لڑائی چھڑ گئی جس میں آسٹریا کو شکست ہوئی جس کے بعد اس نے جنگ کو طول دینا مناسب نہ سمجھا اور بسمارک نے ڈھیل ڈال دی۔

اس سے قبل پروشیا نے ایک جرمن وفاق قائم کیا تھا، اب اس کے

بجائے جرمن کنفیڈریشن بنا دیا گیا جو جرمن کو متحد کرنے کے لیے پہلا قدم
تھا کیونکہ جنوبی جرمنی کی ریاستیں کسٹم کے سلسلے میں اس سے ملی ہوئی تھیں
دوسرا کام یہ تھا کہ مغربی جرمنی کی ریاستوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ اپنے آپ
کو مکمل طور پر پروشیا کے حوالے کر دیں۔ اتفاق سے یہ موقع بھی جلد ہی
ہاتھ آگیا ـــــ ہوہنز ولرن خاندان کا ایک رکن پروشیا میں برسرِ حکومت
تھا۔ اس نے ان ہی دنوں اسپین کی گدی کے لیے کدوکاوش شروع کی
تھی جو اس وقت خالی تھی مگر فرانس نے اس کی مخالفت کی اس لیے یہ
کوششیں تو ختم کر دی گئیں لیکن فرانسیسیوں نے ضد کی کہ انھیں آئندہ
ایسی کوئی جدوجہد نہ کرنے کا اطمینان دلایا جائے۔ بادشاہ ولہم اوّل نے
ان کی بات معذرت کے ساتھ رد کر دی بسمارک نے بادشاہ کا ایک
مفصل بیان شائع کیا اور اسے فرانس کے سفیر کے پاس بھیج دیا۔ اس
بیان کو ایمس ڈسپیچ کہا جاتا ہے جس سے بسمارک کا منشا یہ تھا کہ فرانسیسی
مشتعل ہو جائیں۔ وہی ہوا کہ فرانسیسیوں نے جرمنی کے خلاف جنگ کا
اعلان کر دیا۔ جنوبی ریاستیں بھی اس لڑائی میں فرانس کے خلاف صف آرا
ہو گئیں۔ جرمنی نے میدان جیت لیا اور ۱۸ جنوری ۱۸۷۱ء کو باستثنائے
آسٹریا ایک متحدہ جرمن عالم وجود میں آگیا جس کا بادشاہ ولہم اول تھا۔
اس نے قیصر اوّل کا لقب اختیار کیا اور بسمارک چانسلر بنا دیا گیا جو اس
عہدے پر انیس برس تک برقرار رہا۔

بسمارک کی بنیادی پالیسی یہ تھی کہ وہ جرمنی کو طاقت ور بنائے مگر

اتنا طاقتور بھی نہیں کہ دوسرے ممالک اس سے خوف کھانے لگیں اور اس کے خلاف محاذ بنالیں۔ اس دور میں سب سے پریشان کن مسئلہ بلقان کا تھا جس کے بڑے حصے پر ترکی کا قبضہ تھا۔ روسی چونکہ سلافی قوم سے تعلق رکھتے تھے اس لیے اگر سلافیوں میں بے چینی پھیلتی تو توقع کی جاسکتی کہ روسی اس سے فائدہ اٹھائیں گے اور آسٹرین سے امید ہوسکتی تھی کہ وہ اس میں حائل ہوں گے اور اگر روس و آسٹریا میں جنگ ہوتی تو روس فرانس کو اپنا حلیف بنانے کی کوشش کرتا اور جرمنی کے لیے امکان تھا کہ وہ آسٹریا کی مدد کرتا۔ بسمارک نے اس کے سدّباب کے لیے ۱۸۷۲ء میں تینوں قدامت پسند ملکوں کو ایک عہد نامے کے ذریعے منسلک کردیا اور روس، جرمنی اور آسٹریا کو ایک دوسرے کا حلیف بنادیا۔ تینوں شاہنشاہوں کے باہمی عہد کا بنیادی مطلب سوشلسٹ خیالات کے خلاف کام کرنا تھا۔

۱۸۷۷ء میں بلقان میں شورش پھیلی تو روسیوں کو موقع مل گیا کہ وہ ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کردیں۔ اس جنگ میں ترکوں کو شکست ہوئی اور صلح کے بعد یورپ میں ترکی مقبوضات نہ ہونے کے برابر رہ گئے جس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلنا ہی تھا کہ روس کا اثر بڑھ گیا اس پر آسٹریا اور برطانیہ نے اعلان کیا کہ اگر صورتِ حال کو بدلا نہ گیا تو وہ جنگ کے لیے تیار رہیں۔ اس موقع پر بسمارک نے ثالثی کا کردار ادا کیا اور ۱۸۷۸ء میں اپنی صدارت میں برلن کانگرس کا انعقاد کیا جس میں مناسب تبدیلیاں

عمل میں لانا طے ہُوا جس کی رُو سے یورپ میں جرمنی کا اثر و اقتدار مسلّم ہو گیا بلقان پر ترکی کی حکومت کسی حد تک بحال کر دی گئی اور روس کا اثر کم ہو گیا جس کے لیے روس نے بسمارک کو مورد الزام ٹھہرایا حالانکہ اس نے اسے بڑی مشکلات سے نجات دلائی تھی۔

اب تینوں شہنشاہوں کا عہد نامہ ختم ہو چکا تھا لہٰذا بسمارک نے اس کے بدل کی کوشش کی اور آسٹریا کو یقین دلایا کہ اسے روس کی طرف سے خطرہ ہے۔ آخر ۱۸۷۹ء میں آسٹریا نے روس کے خلاف جرمنی سے ایک صلح نامہ کیا جس کو روسیوں نے اپنے خلاف ایک دھمکی قرار دیا اور اس کے تدارک کے طور پر ایک نیا معاہدہ کر کے تین شہنشاہوں کے اتحاد میں شامل ہو گئے۔ اس معاہدے کی رو سے مشرقی بلقان روس کے زیر اثر رہا اور مغربی بلقان آسٹریا کے حلقے میں تین سال بعد ۱۸۸۴ء میں اس معاہدے کی تجدید ہوئی۔

۱۸۸۵ء میں سلافیوں اور بلغاریہ کے لوگوں میں جنگ شروع ہو گئی اور ۱۸۸۷ء میں یورپ ایک عام جنگ کے کنارے آ کھڑا ہُوا۔ صورت حال یہ تھی کہ آسٹریا اور روس کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے تھے۔ ان دونوں میں جنگ ہوتی تو ممکن کہ فرانس روس کی مدد کرتا اور جرمنوں کو مجبوراً آسٹریا کا ساتھ دینا پڑتا۔ اِس طرح انھیں بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا پڑتا۔ اب بسمارک پھر مصروفِ عمل ہوا۔ اس نے آسٹریا کو اطلاع دے دی کہ وہ اس کے بعض مقاصد

سے اتفاق نہیں کرتا اس لیے وہ روس سے ایک نیا صلح نامہ کرتا ہے اس صلح نامے کے مطابق آسٹریا روس پر حملہ کرتا تو جرمنی غیر جانبدار رہتا اور فرانس جرمنی پر حملہ آور ہوتا تو روس کسی کا ساتھ نہ دیتا۔ بسمارک کو امید تھی کہ اس طرح روس اور فرانس کے اتحاد میں خلل پڑ جائے گا اور آسٹریا بھی چُپ ہو جائے گا —— اس دوران وہ بلقان پر روسی اثر کا جائزہ بھی لیتا رہا۔

بسمارک کو اس صلح نامے سے ایک وقتی کامیابی ہو گئی تھی پھر بھی جرمنی اور روس کے تعلقات کچھ بہتر نہ ہوئے کیونکہ جرمنی کو تاریخ میں پہلی بار غلّہ باہر سے منگانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس غلّے کا بڑا حصّہ روس سے درآمد کیا گیا کیونکہ روس کے غلّے کی قیمتیں بہت کم تھیں جرمنی کے زمینداروں پر اس کا تباہ کن اثر پڑا کیونکہ اس سے خود جرمنی میں پیدا ہونے والے غلّے کی فروخت متاثر ہو گئی اور مجبوراً بسمارک کو باہر سے آنے والے غلّے پر محصول لگانا پڑا۔ یہ بات روس کے مفاد کے خلاف تھی۔ مزید برآں بسمارک نے جرمن سنٹرل بینک کو روسیوں کو قرض دینے کی ممانعت کر دی تھی لہٰذا وہ اپنی ضروریات فرانس سے پوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ طرفہ ستم یہ ہوا کہ ۱۸۹۰ء کے نئے صلح نامے کی تجدید بھی نہیں کی گئی کیونکہ اب بسمارک کی جگہ کاؤنٹ کیپرلوی نیا چانسلر مقرر ہو گیا تھا۔ وہ جرمنی اور روس میں زیادہ ارتباط کو پسند نہ کرتا تھا کیونکہ روس اس زمانے میں یورپ کا ایک رجعت پسند ملک تھا۔ آخر

روس اور فرانس میں ایک جنگی معاہدہ ہو گیا۔ یہ معاہدہ روس اور جرمنی کے درمیان معاہدے کی نفی تھا۔

بسمارک کو اپنے ملک کی ہر اس بات سے دلچسپی تھی جو اس کے وقار کو قائم رکھتی۔ اس لیے ریشستاگ میں قومی آزاد جماعت پر اعتماد کرتا تھا کیونکہ وہ حکومت کے معاملات میں مداخلت کو روکتی تھی۔ اس زمانے میں جرمنی کے کیتھولک لوگوں نے بھی ایک مرکزی پارٹی بنالی تھی، جو حکومت کی طرف سے مذہبی اور اخلاقی مسائل کے احترام کی خواہاں تھی بسمارک کو اس سلسلے میں ان سے ٹکر لینا پڑی اور کیونکہ وہ پروٹسٹنٹ تھا اور قیصر بھی پروٹسٹنٹ، اس لیے کیتھولک لوگوں نے اس کے رویے کو ایک دھمکی قرار دیا اور بسمارک نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیتھولکوں کو دبانا پڑے گا۔ قومی آزاد جماعت نے اس کی حمایت کی۔ یہ جھگڑا "کلٹر کیمپ" کے نام سے مشہور ہے جو دو جماعتوں کی باقاعدہ لڑائی کا باعث ہوا۔ ایک جماعت حکومت کے معاملات میں مذہبی اقتدار چاہتی تھی اور دوسری بالکل علیحدگی کی خواہاں تھی۔ اسی جھگڑے کے دوران بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں جن میں سول میرج، پادریوں کی تعلیم کا انتظام اور حکومت کی طرف سے تعلیم کی نگرانی شامل تھی اور یہ قاعدہ بھی کہ پادری اس طرح تبلیغ کریں کہ امن عامہ میں خلل نہ پڑے۔ اس سے کیتھولک مرکزی پارٹی کے لوگ بھی اس سے ناخوش ہو گئے کیونکہ اس نے بعض محصول لگا دیے تھے اور قومی آزاد پارٹی والے کھلی تجارت کے حق میں تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

اس کو اپنی امداد کے لیے زیادہ قدامت پسند لوگوں سے رجوع کرنا پڑا اور اس طرح کلچر کیمپ کا قصہ ختم ہو گیا جو بسمارک کے نقطۂ نظر سے اس کی ناکامیابی تھی۔

بسمارک کی دوسری ناکامی اس کا اور سوشلسٹوں کا جھگڑا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں دو خاص سوشلسٹ جماعتوں کو ملا کر ایک پارٹی بنائی گئی جس کا نام سوشل ڈیماکریٹک پارٹی رکھا گیا۔ اس نے سوشلسٹوں کے ہاتھ اتنے مضبوط کر دیے کہ وہ اپنے مطالبات پیش کر سکیں۔ یہ مطالبات بسمارک کی مرضی کے خلاف تھے۔ اس دوران دو بار قیصر کی جان لینے کی کوشش بھی کی گئی جس کو بنیاد قرار دے کر بسمارک نے ان سب لوگوں پر پابندی عاید کر دی جو سوشل ڈیماکریٹک پارٹی کے حامی تھے یا سوشلسٹ تھے اور کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے —— نئے قوانین بھی سوشلسٹوں کے خلاف تھے، وہ بھی اس آگ کو اور ہوا دینے کا موجب ہوئے اور سوشلسٹوں کی طاقت بڑی تیزی سے جڑ پکڑنے لگی —— قانون کی مخالفت عام تھی مگر پولیس نے بڑی سختی کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ مرنے والوں کو شہید کا درجہ دیا گیا۔

رفتہ رفتہ سوشلسٹوں اور حکومت کے درمیان نفرت کی ایک گہری خلیج حائل ہو گئی۔ بسمارک اس صورت حال کو کسی قیمت پر پسند نہ کرتا تھا چنانچہ اس نے بعض معاشرتی قانون بنا کر حالات کو سلجھانے کی کوشش کی۔ ۱۸۸۱ء میں بیماری کے بیمے کا بل منظور کرایا، دوسرے سال حادثات

کے نیمے کا بل پیش کیا، ۱۸۸۹ء میں معذور اور ضعیف آدمیوں کی پنشن کا اعلان کیا اور مزدوروں کی فلاح کے لیے پہلی بار بعض قانون پاس کیے مگر مزدوروں پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر یہی مناسب معلوم ہوا کہ مزدوروں کے خلاف جتنے بھی قانون بنے ہیں، ان سب کو ختم کر دیا جائے۔

بسمارک کو سب سے بڑا دھچکا اس وقت پہنچا جب ۱۸۸۸ء میں قیصر کا انتقال ہوگیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قیصر صرف نام کا بادشاہ تھا۔ سارے اختیارات بسمارک کے ہاتھ میں تھے۔ وہی جرمن کا مختار کل تھا ــــــ

قیصر اول کے بعد اس کا پوتا قیصر ثانی تخت نشین ہوا جو اپنی رائے سے کام کرنا چاہتا تھا لہٰذا جلد ہی بسمارک سے اس کے اختلافات ہو گئے سوشلسٹوں کے خلاف قانون سازی کے سلسلے میں اس کے فیصلے اور روس کے مسئلے میں اس کی جرمن پالیسی سے بسمارک نے اتفاق نہ کیا۔ قیصر روس سے تعلقات منقطع کر دینے کے حق میں تھا۔ آخر کار اس نے بسمارک کو معزول کر دیا۔ اس طرح اس کی انیس برس کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس پر ایک انگریزی میگزین "پنچ" نے ایک تصویر شائع کی جس کا عنوان تھا: "پائلٹ جہاز سے رخصت ہوتا ہے"

بلاشبہ جرمن اور یوروپین تاریخ میں بسمارک کا ایک مرکزی مقام ہے اس نے ملک میں ایک وحدت قائم کی۔ اس کے منصوبے خواہ کچھ ہی

کیوں نہ رہے ہوں، مگر معاشرے کے لیے قانون سازی کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے یورپ کو ایک طویل عرصے کے لیے امن و امان کی نعمت بھی دی اور اسی کے زمانے میں سرمایہ داری اور میکانکی ترقی کی بنیاد پڑی۔

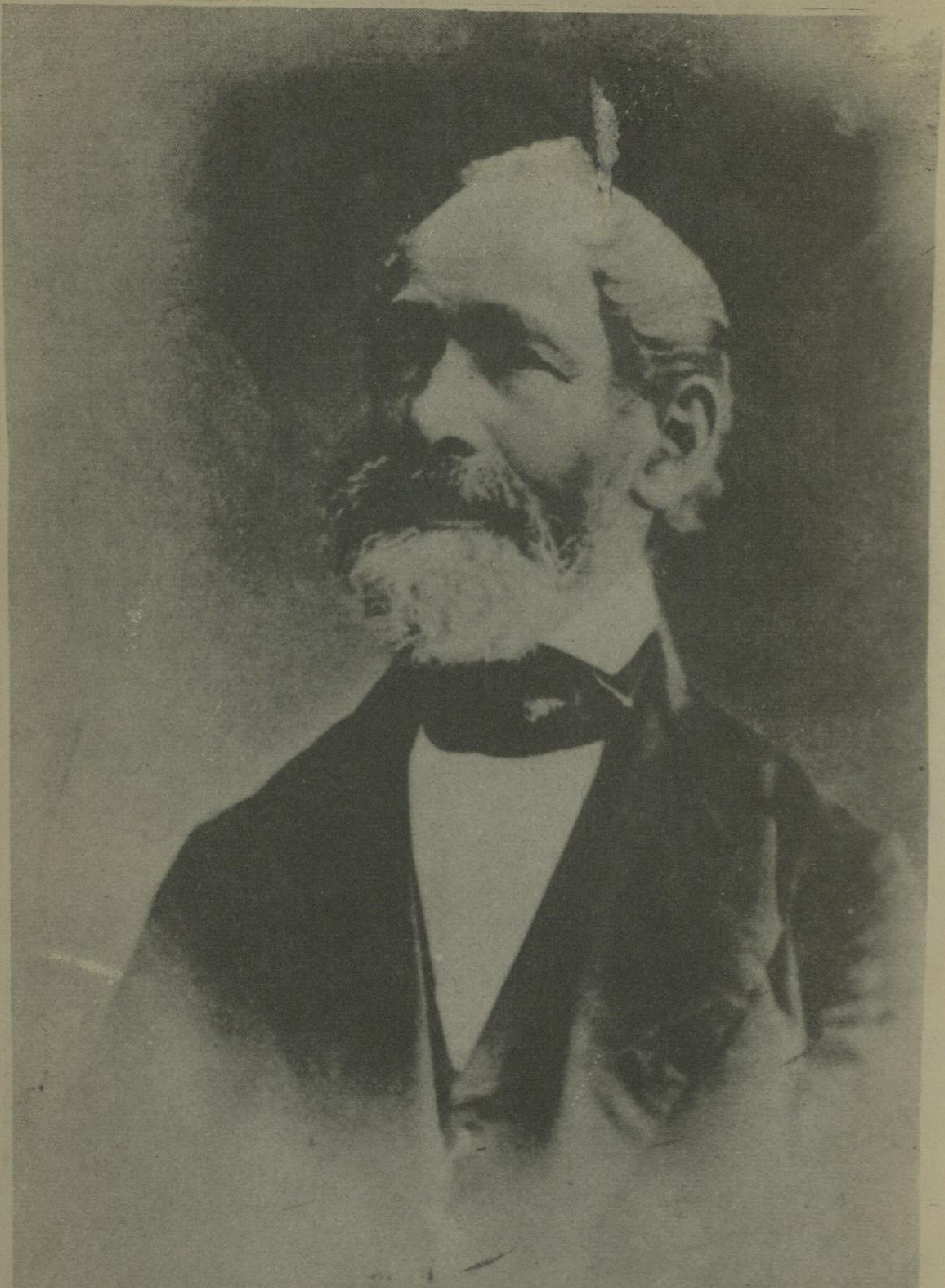
(ڈاکٹر ولفرام جارج رگرٹ)

کارل زیس اور ارنسٹ ایبے

(۱۸۱۶ء - ۱۸۸۹ء اور ۱۸۴۰ء - ۱۹۰۵ء) آلات بصری کے موجد

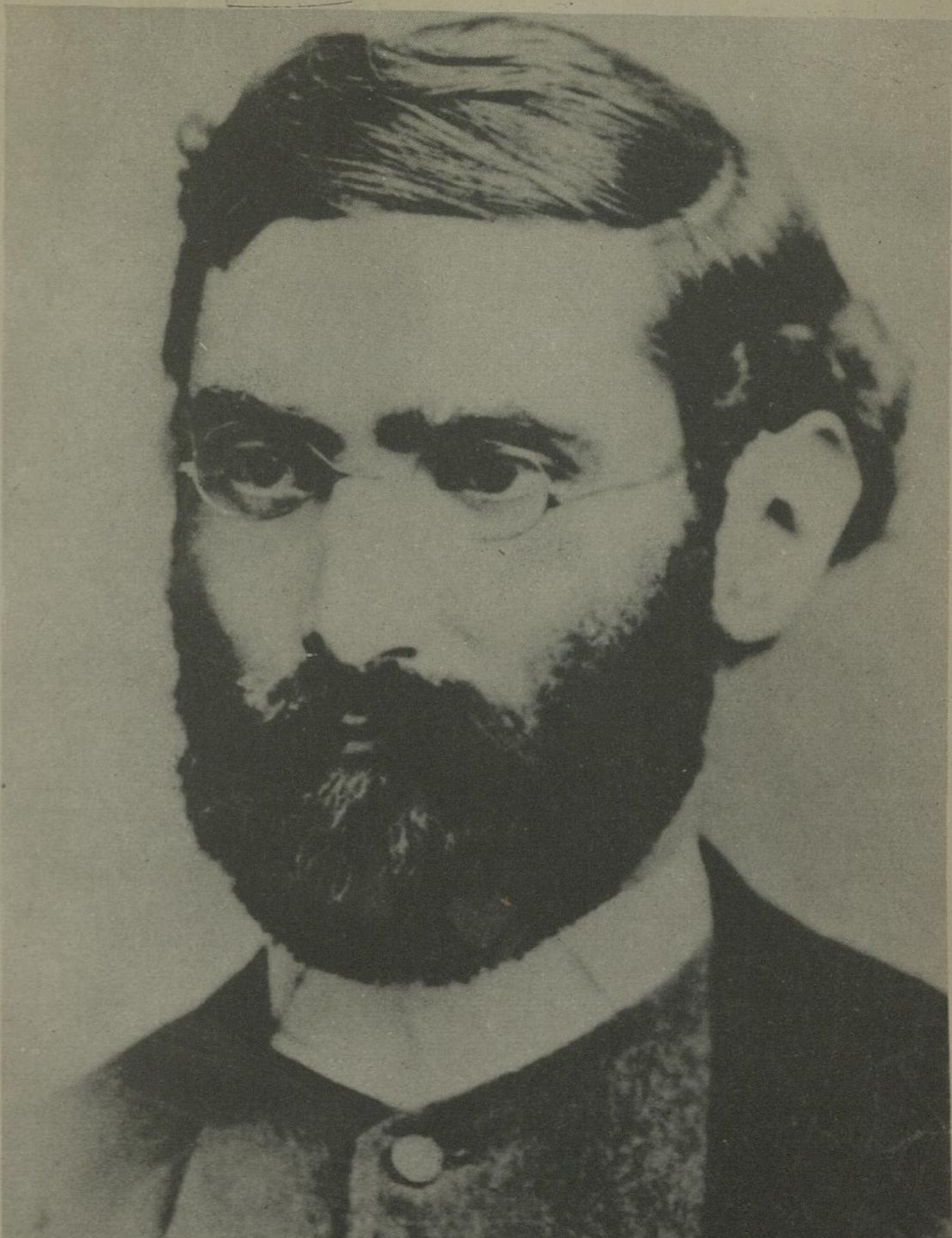
آنکھ جسم انسانی کا کوئی کُلّی طور پر بے نقص حصّہ نہیں، وہ بغیر کسی مدد کے ان اشیا کو ناقص طور پر دیکھتی ہے جن کو پوری طرح نظر آنا چاہیے۔ لہٰذا سائنس کا زمانہ آتے ہی لامحالہ خوردبین کی ضرورت محسوس ہوئی ـــــ تحقیقی کام کرنے والوں کو جن آلات کی ضرورت پیش آئی، ان کو بہتر بنانے میں دو شخصیتوں نے اہم کردار ادا کیے جن کے نام تھے کارل زیس اور ارنسٹ ایبے۔

کارل زیس ۱۸۱۶ء میں ویمار میں پیدا ہوا۔ اسے ابتدا ہی سے میکانکی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس لیے طے کیا گیا کہ اسے اس کی عملی تعلیم دی جائے۔ چنانچہ اسے ایک ایسے شخص کے سپرد کر دیا گیا جو جینا یونیورسٹی کا سامان بناتا اور دُرست کرتا تھا۔ اس کے پاس ایک مدّت تک کام سیکھنے کے بعد وہ مزید تجربات کے لیے اسٹٹ گارٹ چلا گیا۔ ۱۸۴۶ء میں اس نے جینا یونیورسٹی میں ضروری سامان بنانے اور مرمت کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا کارخانہ قائم کر لیا۔ اس وقفے میں اس نے اپنی توجہ زیادہ تر بصری آلات پر مرکوز رکھی۔



کارل زیس

آلاتِ بصری کا موجد



ارنسٹ ایبے
آلاتِ بصری کا موجد

اور اگرچہ اس کے کام کی بنیاد سائنسی اصولوں پر نہ تھی تاہم اِس نے اس فن میں نئے نئے راستے پیدا کیے۔ چونکہ اس کا سامان اس زمانے کے لحاظ سے بڑے اعلیٰ قسم کا ہوتا تھا، اس لیے اس کو یونیورسٹی سے اور الگ الگ پروفیسروں سے کافی آرڈر ملتے رہے۔ زیس سمجھتا تھا کہ یہ اس کی ہنرمندی کی ایک حد ہے پھر بھی اسے یہ احساس تھا کہ سائنس کی موجودہ ترقی کے لحاظ سے اس کو قدرے بہتر آلات کی ضرورت ہوگی۔ اب اس نے کسی ایسے شخص کی تلاش شروع کر دی جو اسے اس کام کے اصول بھی سمجھا سکتا اور اس کی مدد بھی کر سکتا۔ اِس تلاش میں اس کی ملاقات ارنسٹ ایبے سے ہوگئی جو اس سے چوبیس برس چھوٹا تھا

۱۸۶۳ء میں اس کے ایک سرپرست نے اس کے لیے ایسے امکانات پیدا کر دیے کہ وہ معلّم کی جگہ حاصل کر سکے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں وہ پروفیسر ہو گیا۔

ایبے اور زیس کی ملاقات پہلے پہل ۱۸۷۰ء میں ہوئی۔ زیس نے اس سے اپنی خواہشات کا اظہار کیا۔ ایبے نے بتایا کہ بصری آلات کے متعلق اس کی معلومات بھی محدود رہی ہیں۔ بہر نوع وہ اس پر غور کرنے کے لیے رضامند ہو گیا۔ اس سلسلے میں جب اس نے کچھ کام کیا تو اس کی دلچسپی بڑھنے لگی اور وہ تحقیقات کرتا رہا۔ تین برس اس نے خوردبینوں کے بنانے کی تیاری کی، علمی اور عملی طریقوں پر تجربات کیے اور ساتھ ہی ساتھ یونیورسٹی میں بھی اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ نئے

طریقوں کے حصول کے لیے اس نے سارا کام بذاتِ خود انجام دیا پہلے ماحول پر تحقیقات کی، لینس کی طاقت ناپنے کے لیے آلات تیار کیے۔ ان عیبوں کا مطالعہ کیا جو شیشے میں ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کی اصلاح کی اور شیشوں میں چمک بڑھائی۔ وہ مضامین جو اس کی تحقیقات اور دریافت کے سلسلے میں شائع ہوئے، ان سے برلن میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔ پروفیسر ہرمن ہمبولٹ، ایک مشہور ماہر طبیعات، بہت سی چیزوں کا موجد اور افتھلمو اسکوپ کا خالق بھی تھا، اِس نے خواہش ظاہر کی کہ ایبے برلن آجائے تاکہ اسے اس سلسلے میں کچھ آسانیاں فراہم کر دی جائیں مگر ایبے نے انکار کر دیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے لیے جینیا میں رہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ آخر اس کا کافی روپیہ صرف ہو گیا مگر اس کا نتیجہ بھی بڑا شاندار نکلا اور نئی زلیس ایبے خوردبین اپنے وقت کی عظیم کامیابی ثابت ہوئی۔ زلیس ایبے کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسے ۱۸۷۵ء میں اپنے کارخانے میں حصے دار بنا لیا۔

اس نئی ذمہ داری نے ایبے میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ اب اس کی کوشش صرف اتنی ہی نہ تھی کہ خوردبین اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی ہوں بلکہ اس کی خواہش یہ بھی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ فروخت بھی ہوں۔ مگر ایک مسئلہ اب بھی باقی تھا، وہ یہ کہ بہترین شیشہ بنانے کے لیے کیا صورت اختیار کی جائے؟

آخر زیس اور ایبے کی قسمت نے یاوری کی اور ایبے کی ملاقات ایک نوجوان شیشہ ساز سائنس داں سے ہوگئی جس کا نام اوٹو شاٹ تھا، اس نے ایبے کو اپنی تحقیقات کے کچھ نتائج پیش کیے۔ ۱۸۸۲ء میں وہ جینا آگیا۔ اسی زمانے میں پروشیا کی حکومت نے اسے مالی امداد دی اور اس نے ۱۸۸۴ء میں "شاٹ اور ایسوسی ایٹس" کے نام سے ایک کارخانہ قائم کرلیا۔ اب شاٹ، زیس اور ایبے نے مل کر فن شیشہ سازی کو عروج پر پہنچادیا۔ اسی سال ان کے بنائے ہوئے سامان کی پہلی فہرست تقسیم ہوئی۔ اب کارخانے کی بین الاقوامی شہرت یقینی تھی جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ بصری شیشے کی صنعت انتہائے کمال تک پہنچ چکی ہے۔

زیس اس نئے دور کی ابتدا دیکھنے کے لیے زیادہ جی نہ سکا، جو اس کی چھوٹی سی ورکشاپ سے شروع ہوا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔ دوسرے سال اس کے لڑکے نے کارخانے سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایبے کو مختار کل بنادیا۔ اس وقت اس کارخانے میں پانچ سو آدمی کام کرتے تھے جنھوں نے اس مدت میں دس ہزار سے زیادہ خوردبینیں بنائی تھیں۔ ایبے اب سرمایہ دار بن چکا تھا لیکن چونکہ وہ ایک مزدور کا لڑکا تھا اس لیے دولت نے اس کے دماغ کو خراب نہیں کیا اور اس کا مصرف اس نے یہ نکالا کہ زر کثیر سے کارل زیس فاؤنڈیشن قائم کردیا اور خود اس کے بورڈ کا ممبر بن گیا۔

کتنی بڑی فیاضی ہے یہ اس شخص کی جس نے محنت شاقہ سے روپیہ پیدا کیا ہو۔ یہ ایک ایسی بات تھی، جس کی اس دَور میں نظیر نہ مل سکتی تھی۔ ـــــ وہ کام اور کام کرنے کی اوقات کی بڑی دیکھ بھال کرتا جس پر فاؤنڈیشن کا دارومدار تھا۔ کام کرنے کے دن میں آٹھ گھنٹے مقرر تھے اور کاریگروں کو پنشن کا حق بھی حاصل تھا۔ مختلف پرزوں کے بنانے کی مزدوری بڑی احتیاط سے طے کی جاتی اور جب ساری ادائی ہو چکتی تو بقایا روپیہ جینا یونیورسٹی میں دے دیا جاتا۔ معمولی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی نقد امداد کے فنڈ قائم تھے۔ ایسے کے منصوبے بہت صحیح قسم کے ہوتے۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ کس موقع پر کیا کرنا چاہیئے۔ آخر برسوں کی لگاتار محنت سے اس کی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا اور ۱۹۰۵ء میں جینا میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اسے اتنا وقت نہ مل سکا کہ وہ اپنی سائنسی تحقیقاتوں کو یکجا کر کے شائع کرا سکتا جیسا کہ اس کا منصوبہ تھا۔ اس نے اپنے پیچھے ایک بہت ہی اعلیٰ اور ترقی یافتہ بصری شیشوں کا کارخانہ چھوڑا۔ اس میں ماہر کاریگر کام کرتے ہیں جن کا ساری دنیا میں شہرہ ہے۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)

تھیوڈور مومین

(۱۸۱۷ء - ۱۹۰۳ء) مؤرّخ اور ادیب

تھیوڈور مومین دوسرا شخص تھا جس کو ادب میں نوبل پرائز ملا اور اس لحاظ سے یہ بڑی تعجب خیز بات ہے کہ ابتداً وہ مؤرّخ تھا۔ بعض کے نزدیک وہ ایک عالم تھا جو تحریر پر بھی قدرت رکھتا تھا۔ بعض کی رائے ہے کہ وہ ایک اچھا لکھنے والا تھا جس کی تحریر عالمانہ ہوتی تھی۔ خود اس کا اپنا قول یہ ہے کہ مؤرّخ کو پہلے فن کار بننا چاہیے۔

۱۸۱۷ء میں وہ گارڈنگ میں پیدا ہوا جو شسوگ میں واقع ہے اور جرمن کے بالکل شمالی حصے میں ہے۔ اس کا باپ ایک پروٹسٹنٹ پادری تھا جو اپنے خیالات اور اعمال میں بڑا سخت گیر تھا۔ ممکنات میں سے ہے کہ اسی سخت گیری کی بنا پر مومین آخر عمر میں دہریہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی نہ تو بطور ایک مؤرّخ کے شروع کی اور نہ ادب عالیہ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے بلکہ ابتدائی عمر میں ایک قانون داں تھا۔ قانون کی تعلیم اس نے کیل کی مقامی یونیورسٹی سے حاصل کی اور ۱۸۴۳ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔

اس کے بعد اسے ایک وظیفہ مل گیا جس نے سیّاحی کو اس کے

لیے ممکن بنا دیا۔ پہلے وہ روما گیا جہاں اس کی دلچسپیاں روما کی قدیم آزاد حکومت پر مرکوز ہو گیئں۔ یہیں اس کے رومن تاریخ کے علم کی بنیاد پڑی۔ تاریخ نویسی کے متعلق مومین کے خیالات قدرے غیر معمولی تھے۔ اس کو یقین تھا کہ حقیقی مؤرّخ وہی ہو سکتا ہے جو ملکوں اور قوموں کے اندرونی حالات دریافت کرے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے پس منظر کا بھی علم رکھتا ہو۔ یہ باتیں صرف سخت محنت کر کے ہی معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ان کا قول تھا کہ رومن تاریخ کی تحقیق کرنے کے لیے چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ قدیم طرزِ تحریر کا مکمل علم، سرکاری اور نجی قوانین کی وسیع معلومات، واقعات کی منطقی تحقیق، اور ان کے تانے بانے کو جوڑ کر درست کرنا خواہ اس میں وقت کے اتار چڑھاؤ سے کتنی پیچیدگیاں کیوں نہ پیدا ہو گئی ہوں۔ مومین کے زمانے میں اگرچہ یہ صورتِ حال نہ تھی کہ لوگ یونانی اور رومن زمانے کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوں پھر بھی بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایک اچھا زمانہ تھا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو جمہوریت کا تذکرہ کرتے مگر وہ یہ بھول جاتے تھے کہ اس سے صرف اقلیت ہی فیض یاب ہوتی تھی اور غلام اس کی خاطر محنت، مشقت کرتے تھے۔ مومین نے ان میں سے کسی خیال کو ذہن میں جگہ نہیں دی۔ اس نے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا جائزہ لیا جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ رومن زمانے میں زندگی کی کیا کیفیت تھی؟

اٹلی میں مومین نے اپنا وقت ان کتبوں کے پڑھنے میں بھی صرف کیا

جو رومنوں کی یادگار تھے۔ ان کتبوں میں ایسی تفصیلات درج تھیں جنھیں لیوی جیسے بڑے بڑے رومن مورّخوں نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ان کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ اپنی کتابوں میں شامل کرتے۔

۱۸۴۷ء میں جب مومین کافی مواد یکجا کر چکا تو اس نے فیصلہ کیا کہ جرمنی واپس چلا جائے جہاں ان دنوں بہت سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ بہرحال جرمنی واپس آکر وہ لیپزگ یونیورسٹی میں، جو سیکسونی کی حکومت میں تھی، قانون دیوانی کا پروفیسر ہو گیا۔ اس مقام پر مقابلتاً زائد سیاسی خلفشار تھا۔ فروری ۱۸۴۸ء میں پیرس میں انقلاب آگیا۔ بادشاہ لوئی فلپ کو وہاں سے بھاگنا پڑا اور شہنشاہیت کے بجائے ایک جمہوری سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔ یہ انقلاب جرمنی میں پھیلی ہوئی بے چینی کے لیے خطرہ کا ایک نشان تھا جہاں معاشرتی آزادی اور متحدہ جرمنی کے مطالبات پیش کیے جا رہے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ یہ معاملہ دور تک نہیں پہنچے گا۔ انھیں دنوں لیپزگ میں مزدوروں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ فرینک فرٹ میں ایک قومی اسمبلی کا جلسہ ہوا تا کہ پورے جرمنی کے لیے ایک آئین تیار کیا جائے۔ چونکہ فرانس میں مزدوروں نے یہ کوشش کی تھی کہ قومی کارخانے قائم کر کے خودمختار بن جائیں۔ اس لیے ان کے کام میں مشکلات بڑھ گئی تھیں جس کو دیکھ کر جرمنی کو ایک خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں حالات یہاں بھی قابو سے باہر نہ ہو جائیں، لہٰذا پرانے احکامات پر پھر سے عمل درآمد شروع ہو گیا اور بادشاہ نے

سیکسونی میں ریش کے آیئن کو نامنظور کر دیا۔ اس پر لوگوں کو احساس ہُوا کہ ان کے ساتھ ایک بار پھر دھوکہ کیا جا رہا ہے اس لیے وہ مرنے مارنے پر تیاّر ہو گئے مگر انھیں کچل دیا گیا ——— تھیوڈور مین بھی ان لوگوں کے حمایتوں میں تھا۔

اس موقع پر سیکسن حکومت نے اس کی روش کو کچھ اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ ایک ایسے شخص سے جو قانون کا پروفیسر ہو' ان حرکتوں کا ارتکاب برداشت نہ کیا جا سکتا تھا لہٰذا اسے معزول کر دیا گیا اور وہ ہنسی خوشی سوئٹزرلینڈ کی زیورچ یونیورسٹی چلا گیا جہاں اس نے دو سال گزارے اور سوئٹزرلینڈ پر رومنوں کے قبضے پر ایک کتاب قلم بند کی۔ اسی دوران اس نے روما کی تاریخ بھی لکھنا شروع کر دی ۱۸۵۴ء میں اس کا تقرر بریسلا یونیورسٹی میں ہو گیا۔ یہ مقام پروشیا کے ایک صوبے سلیشیا کا دارالحکومت تھا۔ اسی سال تاریخ روما کی پہلی جلد شائع ہوئی جس نے اپنی رائے ظاہر کی کہ عہد قدیم کے لوگ آج کل کے لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔ اس لیے دونوں کا مقابلہ کرنا ناممکن نہیں۔ بات کو واضح کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ ماضی کے لوگ زیادہ اہل تھے۔

مومین اس حقیقت سے واقف تھا کہ توازن و تقابل میں کیا کیا خطرات ہیں مگر اسے اپنی علمی قابلیت پر پورا اعتماد تھا جس کے بل پر وہ ایسے ہر مرحلے میں عہدہ برآ ہو سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے کو ماضی میں منتقل کرنے کے لیے اسے ایسے فیصلے کرنا تھے جن میں خود اس کی رائے

کا دخل ہوتا۔

سسرو وکیل جس کے بیانات کیٹلین، فلپ پکس اور انٹونی کے خلاف آج بھی موجود ہیں، اس کو وہ بدترین جرنلسٹ قرار دیتا۔ سیزر اس کی رائے میں ایک پختہ اور مکمل انسان تھا حالانکہ سیزر جمہوریت کے نام پر ایک شخصی حکمراں تھا۔ مومسین آزاد اور جمہوریت پسند ہونے کے باوجود رؤسار کی اس جماعت کے متعلق کچھ نہ لکھ سکا جو سسرو نے بنائی تھی۔ اس کے عظیم کام کی تین جلدیں ۱۸۵۴ء اور ۱۸۵۶ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ چوتھی جلد میں اس زمانے کا حال ہونا چاہیے تھا جب روما میں عسائیت کی اشاعت ہوئی۔ مومسین کا کہنا تھا کہ اس نے اس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ دوسرے اس کام کو اس سے بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ بہر نوع عام خیال یہ ہے کہ وہ دہریہ تھا اس لیے اسے اس زمانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پانچویں جلد ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی جو رومن سوسائٹی اور رومن ثقافت پر ایک لاجواب کتاب ہے اور جس میں معمولی جزئیات کی بڑی چھان بین کی گئی ہے۔

۱۸۵۴ء میں برلن اکیڈمی نے اسے اُن رومن کتبوں کی تحقیقات کا کام سپرد کیا جو وہاں محفوظ تھے۔ اس سلسلے میں برلن میں اس کی موجودگی ضروری تھی اور چونکہ وہ برسیلا میں پروفیسر تھا اس لیے بار بار آنے جانے میں دقّت ہوتی تھی۔ اس کے پیشِ نظر ۱۸۵۸ء میں اسے برلن یونیورسٹی میں قدیم تاریخ کے پروفیسر کا عہدہ دے دیا گیا۔ ان کتبوں کی پہلی جلد

۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوسری جلدیں منظر عام پر آئیں۔ ضروری نہیں کہ خود مومین سارے کتبوں کو تیار کرتا ہو مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ مشہور ہے کہ مومین یوں تو آزادی کا بہت بڑا حامی تھا مگر ماتحتوں کے ساتھ اس کا برتاؤ بُرا جابرانہ تھا۔ اس نے بڑے مستند طریقے پر روما کے آئینی اور تعزیراتی قوانین کے متعلق لکھا ہے اور جرمن تاریخ کی یادگاریں مکمل کرنے میں بھی کافی مدد دی ہے۔ وہ سیاسیات میں بھی حصّہ لیتا رہا اور پروشین ڈیٹ اور ریشستاگ کا ممبر بھی تھا۔ اکثر وہ بسمارک سے بھی اُلجھ پڑتا بلکہ کئی بار تو ایسا ہوا کہ اس نے بسمارک کی توہین کی۔ بسمارک نے جواباً صرف اتنا کہا کہ اس نے یعنی بسمارک نے جرمنی کے لیے جو کچھ کیا ہے، مومین اس کی قدر نہیں کرتا اس لیے یقیناً اس کی تاریخ دانی مشتبہ ہے۔ اس توہین کے باعث بہت سے لوگ مومین کے خلاف ہو گئے، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چانسلر بسمارک پر اس بدتمیزی کے ساتھ اعتراض نہ کرنا چاہیے۔

۸۰ - ۱۸۷۹ء میں جرمنی میں یہودیوں کا جھگڑا ہُوا۔ اس میں مومین نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ایک دوسرے مؤرخ ہینرک فان ٹریشکی نے کہا تھا کہ یہودی جرمنوں کی بدنصیبی ہیں۔ اس کا مطالبہ تھا کہ جرمنی کے سارے یہودیوں کو جرمن بن جانا چاہیے۔ دوسری طرف مومین کا کہنا تھا کہ یہودیوں کو شہری زندگی سے علیحدہ کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیے

بلکہ انھیں من حیث القوم الگ رہنے کا حق دینا چاہیے۔

اس کے قلم اور اس کے دماغ نے ضعیف العمری میں بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اپنی وصیّت میں، جو ۱۹۰۳ء میں اس کی موت کے بعد شائع ہوئی اس نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اسے فراموش کر دیا جائے۔

(پیٹر کلوز)

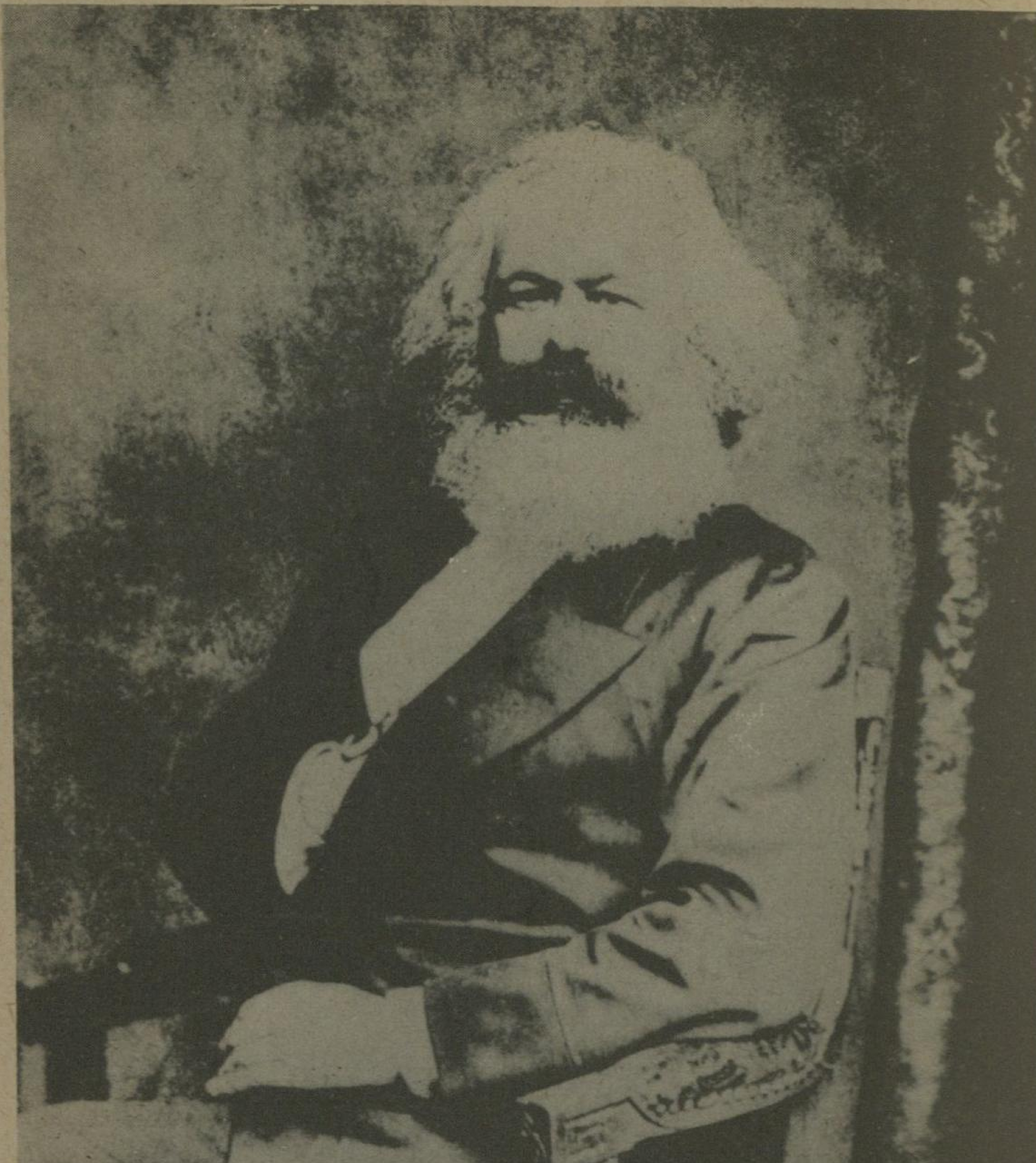
کارل مارکس

کمیونزم کا بانی

(۱۸۱۸ء - ۱۸۸۳ء)

کارل مارکس مارکسزم کا بانی تھا۔ مارکسزم وہ سماجی اور سیاسی تعلیم ہے جوفی زمانہ دُنیا کے بہت سے حصوں میں حکومتی نظام، معاشیات اور سماج پر حاوی ہے مگر آج کی مارکسزم اپنے بانی کے اصلی خیالات سے بہت مختلف ہے کیونکہ بعد کے سوشلسٹ مفکرین نے مارکس کے الفاظ کی مختلف تاویلیں کی ہیں اور اس طرح مارکسزم کی بہت سی قسمیں ہو گئی ہیں حالانکہ اس کے حامی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے مارکسزم کی بنیاد کارل مارکس کی تحریروں پر ہے۔

مارکس اب سے تقریباً ڈیڑھ سو برس قبل پیدا ہُوا تھا۔ اس کے خیالات نے سماجی اور سیاسی انقلاب کا ایک طویل سلسلہ قائم کر دیا اور اس نے اوپرٹل کے ایک بڑے سرمایہ دار فریڈرک انجل کے تعاون سے تیس سال کی عمر میں کمیونسٹ منشور تحریر کیا، کمیونسٹ مزدُوروں کی پہلی بین الاقوامی جماعت تشکیل کی اور ایک شہرۂ آفاق کتاب لکھی جس کا نام سائنسی سوشلزم ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب ہم مارکس کو کن الفاظ میں یاد کریں؟ اسے انقلاب پسند کہیں، خیال پرست، سماجی نقاد، عالم



کارل مارکس
کمیونزم کا بانی

یا مفکر کہہ کر پکاریں! لیکن ان زاویہ ہائے نگاہ سے اس کا جائزہ لیا جائے گا تو وہ صرف نام کا انقلاب پسند ٹھہرے گا، کام کا نہیں کیونکہ بطور ایک اخبار نویس کے اس کی سرگرمیاں سخت ناپسند کی گئی تھیں اور اسے جرمن چھوڑنا پڑا تھا جس کے بعد اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ ایک سیاسی مہاجر کی حیثیت سے باہر بسر کیا۔ لندن میں چونتیس برس بڑی غربت کے عالم میں کاٹ دیے اور مرنے کے بعد ہائی گیٹ کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

مارکس حقیقتاً ایک اُلجھی ہوئی طبیعت کا آدمی تھا جو ماحول کے فطری تغیر سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ ۱۸۱۸ء فرانس کے لوگوں کے لیے کبھی فراموش نہ ہونے والا سال تھا، کیونکہ اسی سال ملک میں ایک بڑا انقلاب آیا اور اسی سال مارکس پیدا ہوا ——— اس کے بعد نپولین کی شکست نے اگرچہ فتح مند طاقتوں کو یہ موقع دے دیا تھا کہ وہ یورپ کی ازسرِنو تشکیل کر کے اپنے حالات کو درست کر لیں لیکن بادشاہوں اور شہزادوں کے مزاج رجعت پسند تھے، وہ نہ چاہتے کہ ان کے مفاد کو ذرا سا بھی نقصان پہنچے۔ ظاہر ہے کہ اس استبداد پسندی کی تجدید سے مارکس کو اس زمانے سے تنفّر پیدا ہو گیا کیونکہ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوا تھا جس میں آزاد خیالی کی قدر کی جاتی جو انقلاب فرانس کا باعث ہوئی تھی۔ اسی طرح متوسط طبقے کے بہت سے تعلیم یافتہ خاندانوں کے ذہن بدل چکے تھے۔ اگرچہ حکومت اس صورتِ حال کو اپنے لیے خطرناک سمجھتی

تھی لیکن ایک بڑی تعداد اس کی موید تھی ——— مارکس کا باپ ایک اوسط درجے کا وکیل تھا جو جرمن کے ایک پرانے شہر ٹرائر میں رہتا تھا۔ یہ شہر دریائے موسلے پر فرانسیسی سرحد سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے مارکس کے خاندان کے اکثر اراکین یہودی عالم تھے مگر مارکس کی پیدائش کے وقت اس خاندان نے عیسائیت کا لیبل لگا لیا تھا کیونکہ پروشیا کی حکومت نے یہ پابندی عاید کر دی تھی کہ کوئی سرکاری ملازم غیر عیسائی نہیں ہو سکتا چنانچہ اس کے خاندان نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ پروٹسٹنٹ ہونے کا اعلان کر دے۔

مارکس نے اٹھارہ برس کی عمر میں بون اور برلن کی یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن اسے حقیقی دلچسپی فلسفے اور تاریخ سے تھی، لہٰذا جلد ہی وہ عظیم فلسفی ہیگل کے خیالات سے متاثر ہو گیا۔ ہیگل کے جدلیاتی فلسفے میں اسے وہ طریقہ نظر آیا جس کے ذریعے ان عناصر کی توضیح ممکن تھی جو معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں ——— ہر خیال، کیفیت یا حقیقت کا ایک تضاد ہوتا ہے اور حقیقت اور تضاد کی کش مکش سے ایک نیا خیال اور نئی حقیقت وجود میں آتی ہے جو ایک نئے تضاد کی حامل ہوتی ہے۔ مارکس نے اس اصول کو اپنے جدلیاتی مادی فلسفے کی بنیاد بنایا جو آگے چل کر سائنٹفک سوشلزم کی روح رواں بن گیا۔

اس کا ارادہ دراصل یونیورسٹی کا معلّم بننے کا تھا مگر جب اس نے اپنا کام پیش کیا تو وہ یونیورسٹی کے منشا کے مطابق نہیں تھا اس لیے وہ کامیاب

نہ ہو سکا اور مجبور ہو کر کولون چلا گیا جہاں بعض آزاد خیال شہریوں نے ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام تھا "رھینش زٹینگ"۔ مارکس اس رسالے کے ادارتی عملے میں شامل ہو گیا اور پھر اس کا چیف ایڈیٹر ہو گیا۔ ابھی تک اس کی تحریریں اگرچہ مستقبل کے اندازِ فکر کی معمولی سی جھلک تھی۔ پھر بھی حکومت نے اس کا ترقی پسندانہ انداز دیکھ کر رسالے کو بند کر دیا۔ آخر مارکس کو طے کرنا پڑا کہ وہ اس پیش کش کو قبول کر لے گا جو اسے جرمن فرانسیسی سالناموں کی ادارت کے لیے پیرس سے کی گئی۔ یہ پرچے بھی جرمنی کے حالات پر بڑی تنقید کر رہے تھے۔ بہر حال مارکس کے پیرس جانے سے اس کی زندگی میں ایک تبدیلی پیدا ہو گئی ——— اس سے کچھ ہی پہلے اس نے "جینی نان ویسٹ فالین" سے شادی کی تھی جو بہت عرصے سے اس کی منگیتر تھی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے مصیبت اور پریشانی کے زمانے میں بڑی وفاداری سے اس کا ساتھ دیا۔

پیرس اس زمانے میں انقلابی خیالات کا مرکز تھا۔ مارکس نے وہاں پہنچ کر کمیونزم کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیے۔ ۱۸۴۵ء میں پروشین حکومت نے فرانسیسی حکومت کو ترغیب دی کہ وہ مارکس کو شہر بدر کر دے اس لیے اسے مجبوراً برسلز کا رُخ اختیار کرنا پڑا اور چونکہ جرمنی کی حکومت اس پر بغاوت کی سازش کے الزام میں مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کو مناسب معلوم ہوا کہ وہ جرمنی کی شہریت ہی سے دست بردار ہو جائے پھر بھی اس نے کسی دوسری جگہ کی شہریت اختیار نہ کی۔ مگر اب واقعی اُس

کے اور اس کے خاندان کے لیے بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بروسلز کے زمانہ قیام میں اُس نے ایک کمیونسٹ منشور تیار کیا تھا، جس کے چند ہی روز بعد اسے وہ شہر چھوڑنا پڑا اور پھر کولون واپس چلا گیا جہاں ایک اخبار "نیو رہین زیٹنگ" کا ایڈیٹر ہو گیا۔ اُسی زمانے میں وہ اُس مقدمے سے بھی بری ہو گیا جو اس پر چلایا گیا تھا۔ مگر پروشیا کی حکومت نے اس پر بھی اسے شہر بدر کر دیا۔ کیونکہ اب وہ جرمن شہری نہیں رہا تھا لہٰذا وہ پیرس چلا گیا پھر لندن آ گیا جہاں اس کی بقیہ زندگی کے دن بسر ہوئے۔

لندن اس زمانے میں دنیا کی اقتصادی زندگی کا مرکز تھا۔ چنانچہ یہاں اس نے اقتصادیات کا گہرا مطالعہ شروع کیا۔ کیپٹل کی پہلی جلد اُس نے ۱۸۶۷ء میں یہیں شائع کرائی، دُوسری اور تیسری جلدیں اس کے مرنے کے بعد چھپیں۔ اس نے اپنی کتاب میں اس نظریے پر زور دیا ہے کہ سرمایہ داری کو اندرونی ناقابل مصالحت تخالف کے باعث ختم ہو جانا چاہیے۔ فریڈرک انجل بڑی فراخدلی سے اس کی مالی امداد کرتا تھا پھر بھی لندن میں مارکس کی زندگی افلاس اور پریشانی سے دوچار رہی۔

فی زمانہ ایک سوال رہ رہ کر سامنے آتا ہے کہ موجودہ مارکسزم کس حد تک مارکس کے نظریات کا آئینہ دار ہے جب کہ خود مارکس نے ایک بار مزاحاً کہا تھا "تمہیں معلوم ہے کہ میں کوئی مارکسسٹ نہیں ہوں"۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)

ہینرخ شیلمان

(۱۸۲۲ء - ۱۸۹۰ء) ماہرِ آثارِ قدیمہ

ہینرخ شیلمان انیسویں صدی کے ممتاز تحقیق کنندگان میں ایک اہم شخصیت کا مالک ہے جس نے ٹرائے کے باقیات کا انکشاف کیا۔ جب تک اس کی کاوشوں کا نتیجہ منظرِ عام پر نہ آیا، اس وقت تک ٹرائے کو ایک داستانی شہر سمجھا جاتا رہا جو ایشیائے کوچک میں کہیں واقع تھا جہاں یونانیوں اور ٹروجانیوں نے دس سال کی طویل جنگ کی تھی اور جس کا ذکر صرف یونانی شاعر ہومر کی رزمیہ نظم میں ملتا تھا۔ بہرحال ہینرخ شیلمان نے اس شہر کے وجود کو دیومالائی تصورات سے باہر نکالا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ پرانی کہانیاں ٹھوس حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس کے اس عمل نے علمِ آثارِ قدیمہ کو ایک نئی ڈگر پر ڈال دیا۔

ہینرخ شیلمان آثارِ قدیمہ کا کوئی پیشہ ور ماہر نہ تھا۔ صرف ذاتی طور پر اس کا تجسس رکھتا تھا اور ہمیشہ ٹرائے کو ڈھونڈ نکالنے کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن اس خواب کے شرمندۂ تعبیر کرنے کے سلسلے میں اسے بڑی سختیاں جھیلنا پڑیں۔

وہ ۱۸۲۲ء میں نیو بکو میں پیدا ہوا جو شمالی جرمنی کے علاقہ ڈوچی اف

میکن برگ میں واقع ہے۔ اس کا باپ ہومر کا بہت شائق تھا اور گھنٹوں اپنے بچوں کو ٹروجان کی جنگ کے بہادرانہ واقعات سنایا کرتا جس کی وجہ سے اس کے بیٹے کے دل میں اس افسانوی شہر کا بڑا اشتیاق پیدا ہو گیا چونکہ کنبہ بڑا تھا اور گھر کی مالی حالت خراب تھی اس لیے جب شلیمان کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو اسے اسکول کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر ایک سبزی فروش کی دوکان پر ملازمت کرنا پڑی جہاں وہ صبح سے رات تک کام کیا کرتا اس لیے اسے پڑھنے کا وقت نہ ملتا۔ اس پر طرفہ ستم یہ ہوا کہ اسکول میں اس نے جو تھوڑی بہت تعلیم حاصل کی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ اس کے حافظے سے غائب ہونے لگی۔ لیکن اس کا کوئی علاج بھی نہ تھا۔ اُنیس سال کی عمر کو پہنچ کر اس نے سوچا، بہتر یہی ہے کہ جرمنی سے نکل کر کہیں اور قسمت آزمائی کی جائے۔ بالآخر اسے وینیز ویلا جانے والے ایک جہاز میں کیبن بوائے کی جگہ مل گئی اور دسمبر ۱۸۴۱ء میں وہ ہیمبرگ سے روانہ ہو گیا لیکن یہ جہاز ہالینڈ کے ساحل سے دور گہرے سمندر میں ایک حادثہ کا شکار ہو گیا۔ جہاز کا عملہ کسی نہ کسی طرح بچا لیا گیا اور اس طرح شلیمان امسٹرڈم پہنچ گیا اور وہاں اس نے ایک پیغام رساں لڑکے کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اپنے منصوبوں کی ان ناکامیوں کے باوجود اس کا حوصلہ پست نہ ہوا بلکہ ترقی کرنے کے عزم راسخ نے اس میں مزید استقلال پیدا کر دیا۔ اب اس نے اپنی ساری توجہ مختلف زبانیں سیکھنے پر مرکوز کر دی تاکہ وہ اپنی حیثیت کو کچھ بہتر بنا سکے۔ جلد ہی

اس نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سیکھ لیں اور ایک تجارتی مرکز میں خط و کتابت کرنے کا کام حاصل کر لیا۔ اس کے بعد اسپینی، پرتگیزی، اور اطالوی زبانوں کا مطالعہ کیا اور آخر میں روسی زبان پڑھنے لگا۔ روسی کو اس نے اس لیے ضروری قرار دیا تھا کہ آمد و رفت کی دقت کے باوجود اس ملک سے تجارت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی اور جس کمپنی میں وہ ملازم تھا، اس نے سینٹ پیٹرز برگ میں، جسے اب لینن گراڈ کہا جاتا ہے، اپنی ایک شاخ قائم کر دی تھی۔ روسی زبان سیکھ جانے کے بعد شلیمان کو اس کمپنی نے وہاں کا انچارج مقرر کر دیا جب کہ شلیمان کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔

دولت پیدا کرنے کا یہ بہترین زمانہ تھا۔ شلیمان جلد ہی خود مختار ہو کر اپنا کاروبار کرنے لگا۔ وہ خاص طور پر نیل کی تجارت کرتا تھا جو اس دور میں ایشیا کی نیلے رنگ میں رنگنے کی واحد چیز تھی ——— اس کا کاروبار جلد ہی ترقی کر گیا۔ جنگ کریمیا (۱۸۵۳ء - ۱۸۵۶ء) کے دوران جس میں روس نے برطانیہ، فرانس اور ترکی سے ٹکر لی۔ شلیمان کو دولت کمانے کا زیادہ موقع ملا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد شلیمان نے محسوس کیا کہ اب وہ کافی آسودہ ہو چکا ہے اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے یعنی ٹرائے کے آثار کی دریافت پر اطمینان کے ساتھ توجہ دے سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے قدیم و جدید یونان کے حالات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ۱۸۶۴ء میں وہ اتنا دولت مند ہو گیا کہ اس نے مزید کام کرنے کو غیر ضروری

قرار دے دیا اور چھتیس سال کی عمر میں کاروبار سے ریٹائر ہوگیا۔ دو سال تک دنیا کی سیاحت کرتا رہا۔ پھر پیرس آکر مقیم ہوگیا۔ یہ شہر اس دَور میں آثارِ قدیمہ کا مرکز تھا۔ یہاں شلیمان نے پوری توجہ کے ساتھ قدیم علم وفن کا مطالعہ کیا جس کے بعد ۱۸۷۱ء میں پہلی بار وہ اس مقام پر جا پہنچا جو ترکی کے مغربی ساحل پر درۂ دانیال کے قریب واقع ہے اور جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ٹرائے کبھی اس کے گردونواح میں آباد تھا۔ پہلے مشاہدہ کے موقع پر اس کے جو تاثرات تھے وہ ان کے بارے میں لکھتا ہے " میں اعتراف کرتا ہوں کہ جب میں نے ٹرائے کے اس عظیم میدان کو دیکھا جو بچپن ہی سے میرے تصوّرات کی آماجگاہ رہا ہے تو میں اپنے جذبات پر بڑی مشکل سے قابو پاسکا "

شلیمان اس بات کا قائل تھا کہ شہر ٹرائے حصارلک کی پہاڑی پر آباد رہا ہے۔ اس عہد میں یہ بات تسلیم نہ کی جاتی تھی مگر ہومر نے اپنی نظم ایلیاد میں اس شہر کا جو محل وقوع بیان کیا تھا اس کے پیش نظر شلیمان اس کے علاوہ اور کسی جگہ کا تصوّر ہی نہ کر سکتا تھا۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۷۱ء کو جب اس مقام کی کُھدائی شروع کی گئی تو مٹی اور ملبہ کے بڑے بڑے ٹیلے برآمد ہونا شروع ہو گئے۔

پہلی چیز جو اس کھدائی کے نتیجے میں سامنے آئی، وہ یونانی طرز کی دیواروں کے آثار تھے۔ مزید کھدائی کرنے پر کچھ پیالے اور دیگر قسم

کے ظروف بھی نظر آئے جن میں اس طرز کے جام بھی شامل تھے جن کا ذکر ہومر نے کیا ہے۔ اس کے بعد کھدائی جب دوسری طرف سے شروع کر دی گئی تو یکایک دیواروں کے کچھ ایسے حصے دکھائی دینے لگے جن پر آتشزنی کے نشانات ظاہر تھے۔ بالآخر ایک پھاٹک کے باقیات ابھر کر سامنے آ گئے جسے شلیمان نے شہر ٹرائے کے ان دروازوں میں سے ایک دروازہ تصور کیا جن کے بارے میں اسے علم تھا کہ وہ جلا دیے گئے تھے پھر ایک عمارت برآمد ہوئی، شلیمان نے خیال کیا کہ یقیناً یہ پریام کا محل ہو گا جو اس شہر کا بادشاہ تھا لیکن بعد میں اس کا یہ قیاس غلط ثابت ہوا کیونکہ دراصل وہ ابھی اصل شہر تک پہنچا ہی نہ تھا اور ان آثار سے دھوکا کھا گیا تھا جو اس مقام پر آباد کسی دوسرے شہر کے تھے۔ کھدائی جاری رکھنے پر ایک مزید انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ ایک جگہ شلیمان کو تانبے کی ایک بڑی سی چیز دکھائی دی جس کے پیچھے سونے کی سی کسی دھات کی اشیا تھیں۔ یہ چیز ایک ایسی مخدوش دیوار کی جڑ میں دھنسی ہوئی تھی جو کسی بھی لمحے گر سکتی تھی۔ شلیمان خطرے کی پرواہ کیے بغیر ان چیزوں کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگا، اور ایک ایک کر کے ساری چیزیں اس کے سامنے آنے لگیں جن میں سونے کے ایسے جام بھی تھے جن میں سے ہر ایک کا وزن ایک پاؤنڈ تھا۔ اس کے علاوہ نکلس، کنگن اور سونے کی اشرفیاں بھی ملیں جن کی مجموعی تعداد آٹھ ہزار سات سو تھی۔ بلاشبہ یہ ساری چیزیں کسی بادشاہ

کے خزانے سے کم نہ ہو سکتیں؟ شلیمان نے محسوس کیا کہ اب اس کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ کھدائی کا باقی کام دوسروں پر چھوڑ دینا چاہیے چنانچہ جون ۱۸۷۳ء میں اس نے کھدائی بند کر دی۔

شلیمان کی اس دریافت کی خبر سے ہر طرف ایک سنسنی پھیل گئی۔ اصولاً اب اسے کچھ دنوں آرام کرنا چاہیے تھا مگر وہ یونان میں اس مقام پر جا پہنچا تھا جہاں کبھی قدیم شہر میسینا آباد تھا۔ اس جگہ کچھ ابتدائی کھدائیاں کرنے کے بعد اس نے ایک ایسا مقبرہ دریافت کر لیا جس میں متعدد لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب اعلیٰ زیورات سے آراستہ تھیں۔ چنانچہ شلیمان کو خیال ہوا کہ یہ لاشیں میسینا کے شاہی خاندان کے افراد کی ہیں

مردوں کے چہروں پر سونے کے ایسے نقاب تھے جن پر ان کے خدوخال ظاہر کیے گئے تھے اور عورتوں کی لاشیں کثیر قیمتی زیورات سے مرصع تھیں۔ مزید براں لاشوں کے تہہ خانوں میں انتہائی شاندار قسم کے ظروف اور ہنر کاری کی دوسری اشیا بھی موجود تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ لوگ جو یہاں دفن ہیں جب دوسری دنیا میں پہنچیں تو یہ ظاہر کر سکیں کہ فانی دنیا میں ان کا کیا مرتبہ تھا۔ اب شلیمان کے لیے یہ فرض کر لینا مبالغہ آمیز نہ تھا کہ جو مقبرہ اس نے دریافت کیا ہے وہ شاہ اگمنان اور اس کے خاندان کے افراد کا ہے۔ اگمنان وہی شخص تھا جس کی سربراہی میں یونانی فوج ٹرائے پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے دس سال تک اس کا محاصرہ جاری رکھا تھا پھر جب فتحیاب ہو کر واپس پلٹا تھا تو اپنی بیوی اور اس

کے آشنا کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ یہ دریافت بھی آثار قدیمہ کے سلسلہ کی عظیم کامیابی تھی۔

چونکہ اس وقت کی حکومت ترکیہ ٹرائے کی کھدائی کو پسند نہ کرتی تھی اس لیے کسی کو وہاں کام کرنے کی اجازت نہ ملتی تھی لیکن شلیمان نے اپنے قابل قدر تعلقات کی وجہ سے ایسا اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا چنانچہ ۱۸۷۸ء میں اس نے وہاں کھدائی کا ایک نیا دور شروع کر دیا۔ اس مرتبہ اس کی پچھلی غلط فہمی دور ہو گئی اور اندازہ ہو گیا کہ ٹرائے کا اصل شہر حصارلک کی پہاڑی کے کھنڈروں کی آخری تہہ پر آباد تھا جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اس مقام پر یکے بعد دیگرے تہہ بہ تہہ نیچے اوپر تین شہر بسے ہوئے تھے۔ اسی موقع پر ایک محل یا محل جیسی عمارت روشنی میں آئی اور یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو گئی کہ شہر ٹرائے کی صرف مختص عمارتیں ہی پہاڑی کے اوپر بنی ہوئی تھیں۔ باقی عمارتیں نیچے ہموار میدان میں واقع تھیں۔ شلیمان نے وہاں اِن بہادروں کی قبریں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی جنھیں ہومر کے بیان کے مطابق میدان میں دفن کیا گیا تھا لیکن جدوجہد کے باوجود ان کا کوئی نشان نہ مل سکا۔ اب ترکی کی حکومت نے کھدائی کے بارے میں رخنے ڈالنا شروع کر دیے۔ لہٰذا یہ سلسلہ آئندہ پر ملتوی کرنا پڑا۔ پھر بھی شلیمان نے جو نتائج اخذ کیے تھے، ان کے صحیح ہونے کے بارے میں ہر شخص کلیتہً مطمئن نہیں تھا لیکن اس نے اور اس کے نائب

ولیم ڈورپ فلڈ نے کسی نہ کسی حد تک لوگوں کی بیشتر غلط فہمیاں دُور کر دیں۔

۱۸۸۰ء کے اواخر میں صحت کی خرابی شلیمان کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔ ۱۸۹۰ء میں اسے آپریشن کے لیے جرمنی جانا پڑا۔ اس عرصہ میں ٹرائے کی مزید کھدائی کے انتظامات کیے گئے لیکن شلیمان جرمنی سے واپس آتے ہوئے اٹلی میں پھر بیمار پڑ گیا اور چھبیس ۲۶ دسمبر ۱۸۹۰ء کو یکایک انتقال کر گیا۔ شلیمان کا شمار آثار قدیمہ کے انتہائی محنتی ماہرین میں ہوتا ہے۔ اس کے طریقۂ کار پر ہمیشہ اختلافات کا اظہار کیا جاتا رہا لیکن اس نے بہر صورت ٹرائے کا شہر دریافت کر دکھایا اور یہی اس کی خواہش تھی۔

(ڈاکٹر اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)

فرڈیننڈ لاسالے

سیاست دان اور سوشلسٹ تحریک کا بانی (۱۸۲۵ء - ۱۸۶۴ء)

سن ۱۸۴۸ء یورپ میں پرانے نظام کے خلاف انقلابات اور بغاوتوں کا سال ہے۔ اسی سال جرمنی میں شاہی اقتدار ختم کرنے اور اس کی جگہ آزادی، انصاف اور مساوات پر مبنی ایک وحدانی جرمن ریاست قائم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن بادشاہوں اور شاہزادوں کو پھر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے موقع مل گیا۔ نتیجے کے طور پر کتنے ہی آزاد خیال لوگوں اور سوشلسٹوں کو جرمنی چھوڑنے یا اس سے دور رہنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان حالات میں ایک شخص نے ملک کے اندر رہ کر جرمن اشتمالیت کی قیادت کا بیڑہ اٹھایا جس کو حقیقتاً پہلی جرمن سوشلسٹ تحریک کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا نام فرڈیننڈ لاسالے تھا۔ لاسالے کا نام بادی النظر میں فرانسیسی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا خاندان یہودی تھا جو آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے نام کے ساتھ لفظ لوسالا استعمال کرتا تھا۔ لوسلا سلیشیا کے اس شہر کا نام تھا جہاں سے وہ خاندان جرمن آیا تھا۔ فرڈیننڈ نے اس لفظ کو لاسالے کا تلفظ دے دیا تاکہ اس سے فرانسیسیت ظاہر ہو۔ وجہ یہ تھی کہ اس دور میں انقلابی سرگرمیوں کے

نقطۂ نظر سے فرانس مسلمہ طور پر سارے یورپ کا قائد تھا۔ لاسالے ۱۸۲۵ء میں سلیشیا کے شہر بریسلا میں پیدا ہُوا۔ اس نے مقامی یونیورسٹی اور برلن یونیورسٹی میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۵ء میں جب وہ ۲۰ سال کا تھا تو اس کی ملاقات "کاؤنٹس صوفیہ فان ہائنزفلڈ" سے ہوئی جو اس وقت طلاق کے ایک انتہائی پیچیدہ مقدمہ میں اُلجھی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ بہت عجیب اور دلچسپ تھا۔ اس نے کسی خوش انجام ڈرامے کی طرح بڑے طویل اور پیچیدہ مدارج طے کیے۔ بات یہ تھی کہ طبقہ امراء کا ایک دولت مند ہر قسم کے درجاتی ہتھکنڈوں اور سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس خاتون کو اس کے حقوق سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ لاسالے نے اس معاملے کے سارے پہلوؤں کا تفصیلی مطالعہ کیے بغیر مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اسے اپنی قانونی مہارت پر اعتماد تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک خوش بیان مقرر بھی تھا۔ بہر حال دس سال کی مسلسل عدالتی کارروائیوں کے بعد اس نے مقدمہ جیت لیا۔ اس طویل عرصے میں وہ انقلابی کارروائیوں میں بھی مصروف رہا، لیکن اس نے کسی وقت بھی اپنی توجہ مقدمے کی طرف سے نہیں ہٹائی۔ اس نے یہ مقدمہ یکے بعد دیگرے ۳۶ عدالتوں میں لڑنا پڑا۔ کاؤنٹس نے اس کے کارنامے سے متاثر ہو کر اس کا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا اور اس کے سیاسی جہاد میں بھی اس کی مدد کرتی رہی۔

لاسالے ایک پیدائشی لیڈر تھا۔ وہ کارل مارکس کا بے حد

احترام کرتا مگر بنیادی طور پر اس سے اتفاق نہ رکھتا تھا کیونکہ نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے مارکس اس بات کے لیے تیار تھا کہ اگر ضرورت ہو تو پروشین ریاستوں کے حکمرانوں کے خلاف انقلابی بورژوائیوں (امرا و صنعت کاروں کا طبقہ) کی مدد کی جائے جس کے برعکس لاسالے ہر طرح بورژوائیوں کے مقابلے پر پروشین ریاستوں کی حمایت پر آمادہ تھا۔ لاسالے کی تصنیف "محصُولہ حقوق کا نظام" ایک اور اہم اختلاف کو ظاہر کرتی ہے جو اس کے اور مارکس کے مابین مابہ النزاع تھا۔ اس کتاب میں وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ وراثت کے مختلف نظام ان مختلف قومی عقائد و تصورات پر مبنی ہوتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد آدمی کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اس سلسلے میں مختلف اقوام کے عقاید میں جو فرق ہے اس کو وہ قومی جذبات کا تابع قرار دیتا ہے اور مارکس کی طرح طبقاتی تفریق کو اقتصادی عوامل پر محمول نہیں کرتا۔

وہ اس کا قائل ہے کہ معاشرے میں پائے جانے والے حالات کو بہرحال تبدیل ہونا چاہیے۔ اگر وہ اس کے برعکس کوئی خیال رکھتا تو اسے ہرگز سوشلسٹ نہ کہا جاتا۔ سوشلزم کے بارے اس کی تحریریں تشنہ اور منتشر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس اپنے نظریات کی مکمل تشریح اور انھیں یکجا کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔

بہرحال اس کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مزدور خود عظیم تنظیم کی شکل

میں ترتیب دیں۔ ان کا پہلا مطالبہ بالغوں کے لیے حق رائے دہی کا ہو۔ فرڈیننڈ کا اعتقاد تھا کہ اگر ایک بار محنت کشوں کو ووٹ کا حق مل گیا تو حکومت کا رویہ ان کے ساتھ بدل جائے گا اور بلاشبہ یہ خیال درست تھا۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اس کے بعد ہی حکومت پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے کہ وہ مزدوروں کی امداد باہمی کے منصوبوں کے لیے روپیہ فراہم کرے۔ اسی طرح محنت کشوں کو سرمایہ داروں کی نفع خوری سے نجات مل جائے گی۔

مارکس کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت طبقاتی دباؤ کا آلۂ کار ہے۔ اسے اس بات پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسے قوانین بنائے، جن سے مٹھی بھر افراد کے بجائے عام اکثریت کو فائدہ پہنچے۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت سے رعائتیں طلب کرنے کے بجائے محنت کشوں کو اس پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیے، البتہ جب تک اس جدوجہد میں کامیابی حاصل نہ ہو جائے، اس وقت تک مزدوروں کو حکومت سے اوقات کار کے تعین جیسی مراعات طلب کرتے رہنا چاہیے۔

انداز فکر کا یہ اختلاف دراصل تاریخ کے ارتقا کے بارے میں مارکس اور لاسالے کے مکمل نظریاتی اختلاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ لاسالے کا اعتقاد تھا کہ تاریخ کے ارتقا کا سبب نظریات کی ترقی ہے۔ سب سے پہلے خیال وجود میں آتا ہے، اس کے بعد تبدیلی یا ترقی

ہوتی ہے۔ مارکس اس کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اقتصادی حالات کو بنیادی محرک کی حیثیت حاصل ہے۔ پہلے اقتصادی ضرورت وجود میں آتی ہے، تب وہ خیال جو اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک اقتصادی صورت حال اور تقاضے واضح نہ ہوں، اس وقت تک کوئی ترقی ہو ہی نہیں سکتی۔ اور باتوں کے علاوہ بھی ان کے مابین بعض اختلافات تھے۔ مارکس کے خیالات بنیادی طور پر بین الاقوامیت کے حامل تھے، جس کے برعکس لاسالے ایک قوم پرست جرمن تھا۔ وہ محنت کش طبقے میں سیاسی قوت اس لیے پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ جرمنی کو متحد کرنے کے سلسلے میں کوئی موثر کردار ادا کر سکے۔

۱۸۶۲ء میں جب لاسالے نے لیزگ کی ایک کمیٹی کو مزدوروں کا قومی اجتماع بلانے کے لیے ایک کھلا ہوا خط لکھا تو مزدوروں کی پہلی تنظیم بنانے کا سوال پیدا ہُوا۔ اس خط میں اس نے زور دیا تھا کہ محنت کش طبقے کی ایک آزاد جماعت بنائی جائے اور جب تک ایسا نہیں کیا جاتا مزدوروں کو موجودہ نظام میں کسی بھلائی کی کوئی امید نہ رکھنی چاہیے۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں "یونیورسل جرمن ورکنگ مینز ایسوسی ایشن" کے نام سے جرمن میں پہلی متحدہ سوشلسٹ تحریک وجود میں آئی جس کا فوری مقصد تمام مزدوروں کے لیے بالغ رائے دہی کے حق کا حصُول تھا۔ لاسالے پانچ سال کے لیے اس تنظیم کا چیئرمین منتخب ہوا مگر وہ اپنی یہ مدّت ختم ہونے سے پہلے ہی زندگی کی مدّت پُوری

کر گیا۔ ہوا یہ کہ ۱۸۶۲ء میں اس کی ملاقات ایک خوب صورت نوجوان حسینہ ہلینہ فان ڈونگس سے ہوئی اور وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا حسینہ کی منگنی ہو چکی تھی تاہم اس نے لاسالے کے جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا لیکن لڑکی کے والدین کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انھوں نے حسینہ ہلینہ کو گھر میں قید کر دیا۔ دوران میں لاسالے اس کو جو خطوط لکھا کرتا' وہ اس تک پہنچنے نہ دیے جاتے۔ لاسالے کو جب اس کی اطلاع ملی تو اس نے ہلینہ کے عمر رسیدہ باپ کو دو بدو لڑ کر فیصلہ کر لینے کا چیلنج دیا۔ ہلینہ کے باپ نے اس کے لیے اپنی جانب سے ہلینہ کے منگیتر کو منتخب کیا۔ جنگ مبارزت ہوئی، جس میں لاسالے شدید طور پر زخمی ہُوا اور تین دن بعد ۳۱، اگست ۱۸۶۴ء کو مر گیا۔

اس کی موت جرمنی کے سوشلسٹ مقاصد پر ایک ضرب کاری تھی اور یوں بھی اس کی عمر ابھی چالیس سال نہ ہوئی تھی۔ بہرحال وہ ایک زبردست ازدحام کے جلو میں برلیسلا کے یہودی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں نازیوں کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے تک ٹریڈ یونینوں کے نمائندے ہر سال پہلی مئی کو اس کے مزار پر خراجِ عقیدت پیش کرنے جایا کرتے تھے۔

(جریمی لین)

شلیگن وائٹ برادرس

هرمن شلیگن وائٹ (۱۸۲۶ء - ۱۸۸۲ء) مہم جو اور
ایڈالف شلیگن وائٹ (۱۸۲۹ء - ۱۸۵۷ء) ماہرانِ
رابرٹ شلیگن وائٹ (۱۸۳۳ء - ۱۸۸۵ء) علم الارض

نہ جانے وہ کیا جذبہ ہوتا ہے جو لوگوں کو اچانک پُرسکون اور مطمئن زندگی ترک کر کے کسی خطرناک قسم کی مُہم سر کرنے پر مستعد کر دیتا ہے عظیم سیّاحوں اور دریافت کنندگان کو یقیناً کسی خاص جذبے ہی نے ان کارناموں پر اُبھارا ہوگا جو انھوں نے انجام دیے؛ اس سوال کا کوئی مکمل جواب شاید ممکن نہ ہو البتہ یہ بات پورے یقین کے ساتھ ہی کہی جا سکتی ہے کہ اگر لوگوں میں ایسے تخلیقی تجسّس کی کمی ہوتی تو آج دُنیا کے موجودہ نقشوں میں کتنے ہی علاقے سادے یا طبعی جزئیات کی علامتوں سے معرّا نظر آتے۔

جدید اٹلس جو حقیقتیں پیش کرتی ہے، ان کی دریافتوں کا سہرا ان ماہرین کے سر نہیں جو دفتروں کی چہار دیواری کے اندر رہ کر انھیں ترتیب دیتے ہیں، بلکہ یہ ان کثیر افراد کا کارنامہ ہے جن میں علمی صلاحیّت اور تجسّس دونوں ہی چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اِس قبیل کے

ممتاز ترین افراد میں "شلیگن وائٹ برادران" کے تین فرد بھی شامل ہیں جو میونخ کے ایک ماہر چشم کے فرزند تھے۔ ان کے ابتدائی نام ہرمن ایڈآلف اور رابرٹ تھے۔ وہ جرمن قوم کے اولین افراد میں سے تھے جنھوں نے کوہ ہمالیہ کا جائزہ لیا۔ ہرمن ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوا تھا ایڈالف ۱۸۲۹ء میں اور رابرٹ ۱۸۳۳ء میں بچپن ہی سے ان تینوں کو سائنس سے دلچسپی رہی۔ ارضی تفتیش اور طبعیات سے خاص طور پر انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ وہ ان پہاڑوں کو بھی سر کرنے کے بھی بے حد شوقین تھے جو ان کے پیدائشی شہر اور بویریا کے مرکزِ حکومت میونخ کے قریب واقع ہیں۔ انھوں نے پہلے پہل انھیں پہاڑوں میں زمین کی مقناطیسی حدود کی پیمائش کی۔ جب اس پیمائش کے نتائج شائع ہوئے تو ماہرین کی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔

ہرمن اور ایڈالف شلیگن وائٹ نے جو ابتدائی مقالے لکھے ہیں ان میں سے ایک ۱۸۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کا عنوان تھا "وادئ اوئٹز کے گلیشیر"۔ اس کے تین ہی سال بعد انھوں نے ایک مبسوط کتاب "کوہ ایلپس کے طبعی جغرافیہ کی جانچ" کے نام سے پیش کی۔ اس کتاب کا انتساب مشہور سائنس دان و سیاح الیگزینڈر فان ہمبولٹ کے نام پر کیا گیا جس سے انھوں نے ۱۸۴۹ء میں، جب وہ برلن میں زیرِ تعلیم تھے رابطہ پیدا کیا تھا۔ الیگزینڈر فان ہمبولٹ دونوں محقق بھائیوں کی صلاحیت سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ اس

نے شاہ بویریا کو ایک طویل خط لکھا جس میں ان کی اہم معلومات اور علمی کمال کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

شلیگن وائٹ برادران صرف علمی کمال اور اعلیٰ سائنسی معلومات ہی نہ رکھتے تھے بلکہ بڑے بہادر اور نہایت باہمّت بھی تھے۔ وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے ۲۳ اگست ۱۸۵۱ء کو اطالوی الپس کی ۴۵۰۰ میٹر بلند چوٹی مونٹے روسا کو سر کیا۔ اس کے بعد زگس پٹزے کی چوٹی سر کرنے کی مہم میں انھوں نے رابرٹ کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ یہاں دونوں بھائی اپنی اس وقت تک کی تفتیش کے خاکے مرتب کرتے رہے اور رابرٹ تنہا سلسلۂ الپس کے کوہ قیصر کی پیمائش کرتا رہا۔ اس کے بعد تینوں نے اپنی سائنسی تحقیقات اور کوہ پیمائی کے نتائج ایک نئے مقالے کی صورت میں شائع کیے جس کا عنوان تھا کوہ الپس کے "طبعی اور ارضی جغرافیہ کے نئے جائزے" اس مقالے کا انتساب شاہ پروشیا فریڈرک ولیم چہارم کے نام پر کیا تھا جو الیکزینڈر فان ہمبولٹ کے خط کے ذریعے ان سے واقف ہو چکا تھا اور ان کی زندگی کی سب سے بڑی مہم کے سلسلے میں ان کی مدد کر سکتا تھا۔ بالآخر اس مہم کے شوق نے انھیں ہندوستان کے کوہ ہمالیہ تک پہنچا دیا۔ تینوں بھائی ایک مدّت سے اس عظیم سلسلۂ کوہ کا جائزہ لینے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ خواب اس وقت حقیقت میں بدل گیا جب برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایسے

افراد کی ضرورت پڑی جو ہندوستان کے پُرکشش خطۂ ارض کی پیمائش کے لیے کیپٹن ولیم ایلیپٹ کے فرائض سنبھال سکتے۔

اس موقع پر شاہ پرشیا اور الیگزینڈر فان ہمبولٹ کے علاوہ پرشیا کے سفیر اور ممتاز محقق کرسچین فان بنسن نے بھی ان بھائیوں کی اعانت کی چنانچہ انھیں اس مہم پر روانہ ہونے کی اجازت مل گئی۔ تینوں بھائی ۲۰ ستمبر ۱۸۵۴ء کو ساؤتھمپٹن کی بندرگاہ سے روانہ ہوئے اور پھر ۲۶ اکتوبر کو بمبئی پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے مقامی افسران اور خصوصاً گورنر لارڈ الفنسٹن کی حمایت حاصل کرلی۔ گورنر نے ان کی تمام خواہشات اور ضروریات پر پوری توجہ دی اور انھیں ہر طرح کی سفارشات اور اجازت نامے عطا کر دیے جس سے ان کی ساری منزلیں آسان ہوگئیں۔

۲ دسمبر کو وہ بمبئی سے روانہ ہو کر جنوبی مدارس کی طرف روانہ ہوگئے۔ اثنائے راہ میں انھوں نے جغرافیائی طبیعاتی، نباتاتی اور معدنیاتی اعداد و شمار جمع کیے جو ان کی ہندوستان کی ڈائریوں میں اب تک دیکھے جا سکتے ہیں لیکن وہ زیادہ دن جنوب میں نہ رہے۔ رابرٹ نے جلد ہی ارماکاناتا کے پہاڑی سلسلوں کا رُخ کیا اور ہرمن اور ایڈالف دوسرے راستے سے ہمالیہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں وہ ہمالیائی ریاستوں بھوٹان اور نیپال کی حدود سے گزرے اور آخرکار شملہ میں جو وائسرائے ہند کا گرمائی مرکز تھا، ایک دوسرے سے

آ کر مل گئے۔ انھوں نے شملہ کو اس لیے اپنا مقامِ اجتماع قرار دیا تھا کہ دوبارہ روانہ ہونے سے قبل وہاں اپنے سفری جائزوں کو مربوط کر سکیں۔

پھر انھوں نے جولائی ۱۸۵۶ء میں شملہ کے بجائے لیہ میں ایک دوسرے سے ملاقات کی جو لدّاخ کا خاص شہر ہے۔ یہاں لدّاخ کے ایک پہاڑی شہزادے نے ہرمن شلیگن وائٹ کو علاقے کی ایک باتصویر تاریخی سرگزشت عنایت کی جسے لاماؤں نے برسہا برس کی کاوشوں سے مرتب کیا تھا۔ اس دستاویز کا مواد خاصا دلچسپ اور کارآمد تھا اور تفتیش کے لیے اگلے راستوں کی نشاندہی کرتا تھا۔

لدّاخ سے تینوں بھائی تبت پہنچنا چاہتے تھے چنانچہ ۱۸۵۷ء میں ہرمن اور رابرٹ کیون لن کے اس سلسلۂ کوہ کو کامیابی کے ساتھ عبور کر گئے جو تبت کو چین کے مغربی علاقے سے الگ کرتا ہے۔ اس کے بعد دونوں بھائی اپنے گھر جرمنی چلے گئے۔ تنہا ایڈالف کیون لن کے اس علاقہ میں تفتیش کرتا رہا جو اس وقت سرحد کے چینی اور ترک قبائل کی باہمی جنگوں کی وجہ سے بدامنی اور بے چینی کا گہوارہ بنا ہوا تھا اور جس کی پُرخطر راہیں پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہو گئی تھیں۔ آخر ایڈالف کا چھوٹا سا قافلہ کسی نہ کسی طرح سنکیانگ کے دارالحکومت کاشغر تک بخیر و عافیت پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اب انھیں یقین تھا کہ اس مقام پر وہ محفوظ رہ سکیں گے لیکن

جلد ہی ان کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا۔ مسلّح ترکوں نے ایڈ الف اور اس کے قافلے کو گھیر کر قید کر لیا۔ ایڈ الف اب بھی مایوس نہ ہُوا۔ اس نے ترک سپاہیوں سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے حکمران وُل خاں کے پاس لے لیں۔ سپاہیوں نے یہ درخواست مان لی۔ لیکن یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ ول خاں نے اس کی بات سننے سے انکار کر دیا اور اس کو قتل کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ ایڈالف کو جس جگہ قتل کیا گیا تھا' اس مقام پر آج تک اس کی ایک یادگار قائم ہے جس کی تعمیر ۱۸۰۸ء میں ہوئی تھی۔

ہرمن اور رابرٹ کو کچھ ہی عرصے بعد بالواسطہ اپنے بھائی کے المناک انجام کی خبر ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انھوں نے جنوبی جرمنی میں جیگرس برگ کا دلکش اور چھوٹا سا قلعہ خرید لیا تھا اور اپنی تفتیش اور سفر کی یادداشتوں اور جمع کردہ مواد کو ترتیب دینے میں مصروف تھے یہ عظیم مجموعہ آج بھی دیکھنے کے لائق ہے جو بڑے سائز کی ۱۰۶ جلدوں پر مشتمل ہے' جس میں ۷۵۰ خاکے اور آبی رنگ کے نقشے ہیں اور بعض وسیع المنظر نقشے تو چار میٹر لمبے ہیں۔

اس کے علاوہ قلعے کے کمروں میں ان کے جمع کیے ہوئے کتنے ہی پتھروں کے نمونے، معدنیات کے ٹکڑے، ڈھانچوں کے مختلف حصّے' طرح طرح کی جڑی بوٹیاں اور ہندوستان و تبت کی متعدد زبانوں کے مخطوطات محفوظ ہیں۔ ان نوادرات کے ساتھ تینوں بھائیوں کی شبیہوں

کے خاکے اور کارناموں کے سلسلے میں ان کو ملنے والے کثیر اعزازی تحفے بھی موجود ہیں۔ جب کوئی صاحب ذوق ان کمروں میں داخل ہوتا ہے کہ شاہ بویریا نے ان کو خطابات سے نوازا اور زار روس نے انھیں "دی اسٹائل آف پرنس" کے تمغے عطا کیے۔ مجموعی طور پر ہرمن کو تیرہ اور رابرٹ کو سترہ اعزازات ملے۔

دونوں بھائیوں نے سائنسی دُنیا کے معزز ترین افراد کی حیثیت سے انتقال کیا۔ ہرمن نے ۱۸۸۲ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا اور رابرٹ نے ۱۸۸۵ء میں۔ انھیں اگرچہ اپنی وسیع سائنسی معلومات کو مکمل طور پر بامِ عروج تک پہنچانے کی مہلت نہیں ملی۔ اور وہ اپنے اشاعتی مجلّے "ہندوستان سے متعلق ایک تحقیقاتی مشن کے نتائج" کو بھی پوری طرح مکمل نہ کر پائے پھر بھی ان کے نام اہم معلومات اور دریافتوں کی ان سرگزشتوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے جو بے جگری، جرأت اور گرانقدر خون سے تحریر کی گئی ہیں۔

(جلینٹ روبرٹ)

آگسٹ فریڈرخ ببل

(۱۸۴۰ء - ۱۹۱۳ء) سیاست دان

بسمارک نے ایک بار کہا تھا "ہم جرمن خدا سے ڈرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی کو خاطر میں نہیں لاتے خواہ وہ کوئی بھی ہو لیکن جرمن شاہی پارلیمنٹ میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس نے جلیل القدر ریشس چانسلر بسمارک کو دہلا کر رکھ دیا۔ اس شخص کا نام تھا آگسٹ ببل، جسامت وقامت کے لحاظ سے دُبلا پتلا پست قد اور پیشے کے لحاظ سے خرادی۔

ببل اولین سوشلسٹ نائبین میں سے تھا اور جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا بانیٔ اعلیٰ تھا وہ جرمن سوشلسٹ تحریک کا پہلا عظیم قائد بھی تھا، جو معاشرے کے ادنیٰ طبقے سے ابھر کر سامنے آیا تھا۔

ببل ۲۲، فروری ۱۸۴۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کی ولادت جن حالات میں ہُوئی، وہ اس کے مستقبل کے لیے کچھ امید افزا نہ تھے۔ اس سلسلے میں وہ خود بھی اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے:

"دُنیا کی وہ روشنی جس میں پیدا ہونے کے بعد میری آنکھ کھُلی، وہ تیل سے جلنے والے کانسی کے ایک چراغ کی مدہم روشنی تھی جو ایک فوجی بیرک کے مختصر سے کمرہ کی بھوری دیواروں کو روشن کرنے کی احمقانہ کوشش

کر رہی تھی۔ یہ کمرہ بیک وقت خوابگاہ، رہائش گاہ، باورچی خانہ اور سٹور سبھی کچھ تھا۔ اپنی ماں کے مطابق میری ولادت ایک تاریخی ساعت میں ہوئی اور میں رات کو اس وقت پیدا ہوا جب نو کے گھنٹہ پر چوٹ پڑی اور بگلر نے رات کا آخری بگل بجایا۔ فوجی روایات کے مطابق یہ وہ طے شدہ لمحہ ہوتا ہے جس میں سپاہیوں کو اپنے اپنے بستر پر پہنچ کر مکمل خاموشی اختیار کر لینی چاہیے۔"

واقعات کی الہامی تعبیریں پیش کرنے والے ہٹلر کی پیدائش کے ان اتفاقات کو بلاشبہ حکومت وقت اور عسکریت کے خلاف اس کی مخالفانہ جدوجہد کی علامت قرار دیں گے اور حقیقتاً یہ بات قطعی طور پر فوجی نظم وضبط کے خلاف بغاوت کا ایک رجحان پیش کرتی ہے کہ ایک پروشین غیر مختار فوجی افسر کا بیٹا عین اس وقت آواز بلند کرے جب سختی کے ساتھ خاموشی اور سکوت کا حکم دیا جا رہا ہو۔

پروشین غیر مختار افسروں کی زندگی ان دنوں بڑے تکلیف دہ حالات میں بسر ہوتی تھی۔ ریاست کے دیگر ملازمین کی طرح ان کی تنخواہیں بڑی قلیل ہوا کرتی تھیں اور آگسٹ ہٹلر کے مصائب میں تو مزید اضافہ یوں ہو گیا کہ زندگی کے ابتدائی ایّام ہی میں اسے یکے بعد دیگرے دو مربیوں کی سرپرستی سے محروم ہونا پڑا۔ اس کا حقیقی باپ اس وقت فوت ہوا جب وہ چار سال کا تھا۔ اور چونکہ اس کے باپ نے فوجی ملازمت کے پندرہ سال پورے نہ کیے تھے اس لیے دقت کے جابرانہ ضابطے

کے تحت اس کی ماں پنشن سے بھی محروم کر دی گئی۔ اس دور میں ایسے مستحقین کے لیے کسی دوسری قسم کی سرکاری امداد دینے کا دستور بھی نہ بنا تھا، لہٰذا اس کی ماں اپنے اور دو بچوں کی گزر اوقات کے لیے عقد ثانی پر مجبور ہو گئی۔ بدقسمتی سے اس کا نیا شوہر بھی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا اور دو ہی سال بعد وہ پھر بیوہ ہو گئی۔ اب اس کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ وہ آگسٹ ہبل کو فوجی یتیم خانے میں داخل کر دے اور وہاں اس کی پرورش پر جو کچھ خرچ ہو، اس کے معاوضے میں وہ نو سال تک لازمی فوجی خدمت انجام دے۔ چنانچہ ہبل کو یتیم خانے میں داخل کر دیا مگر بالغ ہونے پر چونکہ اس کی صحت فوج کے مطلوبہ معیار پر کسی طرح پوری نہ اتری اس لیے وہ فوج کی جبری خدمات انجام دینے سے بچ گیا۔

اسکول میں ہبل نے توجہ کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی۔ فوج سے نکلنے کے بعد اس نے ایک خرادی کی شاگردی اختیار کر لی اور جب اس کا استاد بھی مر گیا تو خود اس کی جگہ کام کرنے لگا۔ حتیٰ کہ دکان بند کر دی گئی۔ اب اس کی عمر سترہ سال کی تھی لہٰذا وہ دوسرے مقامات پر قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس سفر میں اس نے پورے جنوبی جرمنی کی خاک چھان ڈالی۔ آسٹریلیا اور سوئٹزرلینڈ کا دورہ بھی کر لیا اور کیتھولک سیاحوں کی ایک انجمن سے رابطہ قائم کر لیا جسے کیتھولک راہب آگسٹ کولپنگ نے قائم کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ

اس نے ملک کے اقتصادی حالات کا جائزہ بھی لینا شروع کیا جس کا ذکر وہ اپنی سوانح حیات میں کرتا ہے۔

گزشتہ صدی کے نصف میں جرمنی نے اقتصادی ترقی میں قابلِ قدر عروج حاصل کیا تھا پھر بھی وہ اب تک نچلے درجے کے بورژوائیوں اور چھوٹی ملکیت رکھنے والوں ہی کا ملک تھا اس لیے تین چوتھائی سے زیادہ مزدور چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ بڑی فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ فیکٹریوں کی مصنوعات نسبتاً سستی ضرور ہوتی تھیں مگر اتنی ہی گھٹیا بھی سمجھی جاتی تھیں۔ ہنرمند کاری گر فیکٹری کی ملازمت کو حقارت سے دیکھتے تھے۔ بڑی فیکٹریوں کے مزدوروں کی حالت بھی انتہائی خراب وخستہ تھی اور چھوٹی فیکٹریوں کے مزدور تو اپنے معاش کے بارے میں اتنے فکرمند تھے جیسے انھیں بڑی فیکٹریوں کی وسیع کارکردگی سے کوئی خطرہ لاحق ہو گیا ہو۔

ان حالات میں فرڈیننڈ لاسالے اور دیگر افراد نے ۲۲ مئی ۱۸۶۳ء کو "جنرل جرمن ورکرس ایسوسی ایشن" کے نام سے جو تنظیم قائم کی اس سے پراگندہ حال مزدوروں کی بڑی ہمت افزائی ہوئی۔ آگے چل کر اسی قسم کی ایک اور تنظیم لیپزگ میں "ورک مینز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن" کے نام سے ۱۸۶۵ء میں قائم ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن کا پہلا چیئرمین آگسٹ ببل تھا جس کی ملاقات اسی سال ولیم لائب کینچٹ سے ہوئی۔ ببل اس وقت پچیس سال کا ایک نوجوان تھا جب لائب کینچٹ نے

اسے مارکس اور اینجلز کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ رفتہ رفتہ مطالعے اور مباحثوں سے یہ حقیقت اس پر روشن ہوگئی کہ سماجی ترقی اور سیاسیات کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مزدوروں کو حکمران طبقے کی جانب سے بغیر جدوجہد کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے انھیں طبقاتی مفاد کے محدود مقاصد سے بلند ہو کر جدوجہد کرنا پڑے گی۔ مطالبات پر توجہ دلانے کے لیے چونکہ ایک سیاسی پارٹی کا وجود ناگزیر تھا لہٰذا اگست ۱۸۶۶ء میں "سیکسن پیپلز پارٹی" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ببل نے اس پارٹی کا پروگرام تحریر کیا جس میں مذہب اور وراثت کی بنیادوں پر حاصل ہونے والی ترجیحات کا خاتمہ مذہب و سیاست کی علیحدگی اور جرمنی کو ایک جمہوری نظام کے تحت متحد کرنے کا منصوبہ تھا۔

یہ اسی پارٹی ہی کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ۵ مارچ ۱۸۶۷ء کو بسمارک نے سوشلسٹوں کے ایک مطالبے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور شمالی جرمنی کی وفاقیہ میں مردوں کو ووٹ کے ذریعے اپنے نمائندے چننے کا حق مل گیا۔ انتخابات ہوئے پر ببل ریشستاغ کی ایک نشست جیت گیا اور اسی طرح پہلی مرتبہ سوشلسٹ نائبین کے مرتبے پر فائز ہوا۔ اپنے بارے میں اس نے ریشس کے دیگر اراکین کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھا اور ابتداً ہی سے حکومت کی پالیسیوں پر شدید حملے کر کے اپنا کردار واضح کر دیا۔

۱۸۶۹ء میں ببل نے جرمنی کی ساری مزدور سیاسی تنظیموں کو متحد کرکے "سوشل ڈیموکریٹک ورکس پارٹی" قائم کی اس پارٹی کے اغراض و مقاصد ان نکات پر مشتمل تھے۔

طبقاتی اقتدار کا خاتمہ، پورے جرمنی میں بیس سال سے زیادہ عمر کے مردوں کے لیے حق رائے دہی، ریاست سے چرچ کی علیحدگی، چرچ سے اسکولوں کی علیحدگی، لازمی پرائمری تعلیم، جملہ پبلک تعلیمی اداروں میں مفت تربیت، کھلے عدالتی طریقوں کا آغاز، اوقات کار کا باقاعدہ طے شدہ ہفتہ، عورتوں کے کام کا تعین اور بچوں کے کام کی موقوفی۔

آج ہم ان میں سے کتنے ہی نکات سے بالکل مانوس ہیں مگر ببل کو ان مقاصد کے حصول کے لیے پارٹی کی قوت کو اپنا ذریعہ بنانا پڑا تھا۔ ان دنوں اس قسم کے مطالبات کا جو ردِ عمل ہو سکتا تھا' اس کا اسے جلد ہی تجربہ ہو گیا۔ ۱۸۶۹ء میں اس نے اسپین میں اپنے ایک دوست کو خط لکھا جس میں اسے اپنے یہاں سوشلسٹ پارٹی قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ آخر اس کا یہی طور طریقہ قید خانے سے پہلی روشناسی کا بہانہ بن گیا اور حکومت کے خلاف ایک خطرناک اشتہار تقسیم کرنے کے الزام میں وہ جیل پہنچا دیا گیا پھر اسے سیاسی خطاکاری کی سزا میں چھپن ماہ کی قید کاٹنی پڑی لیکن ببل اس سے مطلق پریشان نہ ہوا۔ وہ لکھتا ہے:

"قید خانہ وہ تدبیر نہیں جس کے ذریعے مجھے یہ سکھایا جائے کہ ہمارے

متعفن معاشرتی حالات بہت اچھے ہیں۔ وہ معاشرہ قطعاً باقی رہنے کا مستحق نہیں جو تربیت کے لیے ایسے طریقے استعمال کرنا لازمی سمجھے۔"

۱۸۷۰ء میں بسمارک کے خفیہ احکامات کے مطابق بِبل ایکبار پھر گرفتار کر لیا گیا اور اس پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ایک بڑی بغاوت اور غدّاری کا ارادہ رکھتا ہے۔ حالانکہ تفتیش کنندہ ججوں کو اِس بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ حقیقت صرف اتنی تھی کہ بسمارک ان دنوں فرانس سے جنگ میں اُلجھا ہوا تھا اور ملک میں ضابطہ اور سکون چاہتا تھا۔ آخر کار ایک طویل مدّت کے بعد جسے عرصۂ "تحقیقات کہا گیا" ببل کو رہا کر دیا گیا مگر اس کے بعد اس نے اپنی گرفتاری کا ایک اور جواز مہیّا کر دیا۔ ریشستاغ کی ایک تقریر میں اس نے کُھل کر پیرس کی مصالحتی گفتگو کی حمایت کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے کا زیادہ دنوں انتظار نہ کرنا پڑا۔ ۱۸۷۲ء میں وہ اور لائب کنیچٹ ایک ہی حصار میں دو سال کے لیے نظر بند کر دیے گئے۔ ببل اس معاملے کے ختم ہونے سے پہلے لکھتا ہے:

"اگر ہم لوگ مجرم ہیں تو ہر وہ پارٹی مجرم ہے جو حکومت کی سرپرستی میں نہیں ہے۔"

قید میں اس نے پھر حصولِ تعلیم پر توجہ دی۔ لائب کنیچٹ نے اسے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں سکھائیں جس کے بعد اس نے پوری احتیاط

کے ساتھ مارکس اور اینجلز کی تصنیفات کا مطالعہ کیا۔ اقتصادیات اور تاریخ پڑھی اور ڈارون ہیگل اور لائبگ کے نظریات کی گہرائیوں پر غور و خوض کیا۔ نتیجے کے طور پر اس نے جرمن کسانوں کی جنگ پر ایک کتاب لکھی اور اپنی بعد کی ایک کثیر المطالعہ تصنیف "عورت اور سوشلزم" کا مواد تیار کیا۔ غرض اس مرتبہ کی قید نے ببل کو ایک بالغ نظر سوشلسٹ بنا دیا جو ہر طرح بسمارک کا ہم پلہ حریف تھا۔ قید کی سزا کے ساتھ عدالت نے اسے ریشستاغ کی رکنیت سے بھی محروم کر دیا تھا مگر عبوری انتخاب میں وہ پھر ایک بڑی اکثریت سے اپنی نشست جیت گیا۔

۱۸۷۵ء میں اس نے گوتھا میں "سوشل ڈیموکریٹک ورکس پارٹی" اور لاسالے کے حامیوں کو متحد کیا مگر اس متحدہ پارٹی کے پروگرام کو مارکس کی تائید حاصل نہ ہو سکی کیونکہ اس کے نزدیک اس کا منصوبہ غیر مبہم تھا پھر بھی اس نے وقت کے عملی تقاضوں کو پورا اور اسی کی وجہ سے ۱۸۷۷ء کے انتخابات میں سوشلسٹوں کے ووٹوں میں ایک تہائی کا اضافہ ہو گیا۔ اب بسمارک کو احساس ہوا کہ سوشلسٹوں کو انفرادی طور پر سزائیں دینا کتنا بے نتیجہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ صبر کے ساتھ موقع کا انتظار کرنے لگا۔ آخر ۱۸۷۸ء میں قیصر پر کیے جانے والے دو قاتلانہ حملوں کی بنا پر اسے ریشستاغ سے وہ سوشلسٹ دشمن قانون منظور کرانے کا موقع مل گیا جس کو اس نے ایک مُدّت

سے تیار کر رکھا تھا۔ سوشلسٹوں کو ان حملوں کی سازش کا مجرم گردانا گیا حالانکہ حقیقت میں کسی ایسی شہادت کا شائبہ تک موجود نہ تھا جس سے اس الزام کی صداقت ثابت ہو سکتی۔

یہ ایّام دوسرے تمام سوشلسٹوں کی طرح بیل کے لیے بھی بہت تکلیف دہ تھے۔ وہ جہاں بھی جاتا خفیہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوتی۔ آخر وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ پارٹی کے ارکان کا ایک دوسرے سے ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ ملاقاتیں اور مشورے صرف ایسے جنگل، جھاڑیوں پرانے کھنڈروں اور کھائیوں میں ہی ممکن تھے جو تعاقب کرنے والی نگاہوں سے اوجھل ہوتے، تاہم سوشلسٹوں کے ہمدردوں اور حامیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا جو اس حقیقت کا ثبوت تھا کہ سوشلسٹ دشمن قوانین اپنا مقصد حاصل کرنے میں عملی طور پر ناکام ہو گئے۔ ۱۸۹۰ء تک یہ قوانین جاری رہے اور پارٹی خفیہ طور پر کام کرنے پر مجبور رہی۔ اس کے بعد ارفرٹ میں سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کو از سرِ نو منظم کیا گیا۔

بیل نے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ان مباحثوں اور مذاکروں میں ایک اہم کردار ادا کیا جن کا موضوع یہ تھا کہ سوشلسٹوں کو بورژوائی سوسائٹی سے مصالحت کرنے کے لیے کس حد تک آگے بڑھنا چاہیے۔ اسی زمانے میں اس نے عسکری رجحان کے خلاف بھی ایک عظیم مہم چلائی جب کہ جارحانہ

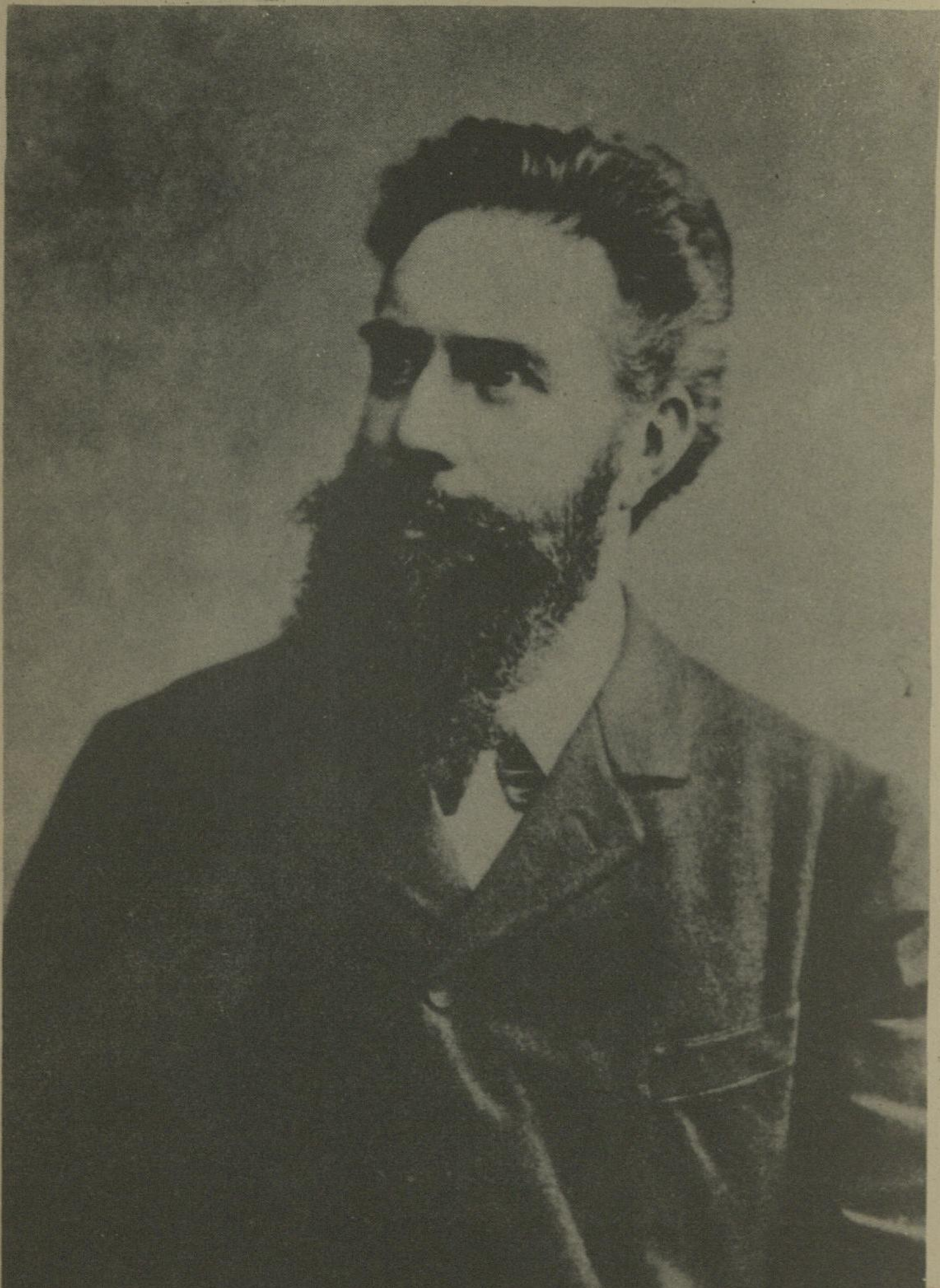
حب الوطنی یا قومی برتری کا تصوّر انتہائی دلکش انداز میں جرمنی اور سارے یورپ میں موجود تھا۔ آخر سوشل ڈیموکریٹک پارٹی ببل کی زندگی ہی میں ریشستاغ کی سب سے بڑی جمعیت بن گئی اور ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو جب اس نے انتقال کیا تو دنیا میں ہر مکتب فکر کے سوشلسٹوں نے اس کا سوگ منایا۔

(مائیکل اینڈرش)

ولہم کونراڈ رونٹجن

ایکس رے کا موجد (۱۸۴۳ء - ۱۹۲۳ء)

جنوری اور فروری ۱۸۹۶ء میں اخبار و جرائد ان حیرت انگیز خبروں سے بھرے رہتے کہ اب گوشت پوست کو کاٹے بغیر ہر آدمی کے اعضا کی ہڈیوں کے فوٹو لیے جا سکتے ہیں۔ اس نئی تکنیک کی دریافت کی وجہ سے ۵۲ سالہ ولہم کانراڈ رونٹجن کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا اس نے حال ہی میں بعض شعاعوں کی عجیب و غریب خاصیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ یہ بات واضح طور پر نہ سمجھ سکا تھا کہ یہ شعاعیں کس طرح عمل کرتی ہیں اس لیے اس نے اسے ایکس ریز کہا جو آج ساری دنیا میں اسی نام سے مشہور ہیں۔ صرف جرمنی میں انھیں اپنے دریافت کنندہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ انسان نے جس وقت سے اپنے جسم سے دلچسپی لینا شروع کی ہے اور اس کو جب سے یہ جاننے کی خواہش ہوئی ہے کہ وہ کس طرح کام کرتا ہے، اس وقت سے وہ اپنے کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہے۔ ایکس ریز نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے۔ اب ان کے ذریعے کسی بھی زندہ آدمی کی ہڈیوں کے پنجر اور اندرونی اعضا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ شعاعوں نے تشخیص کی سائنس کو بھی آگے بڑھایا



ولہم کونراڈ رونٹجن

ایکس رے کا موجد

ہے اور تپ دق جیسے امراض سے دو بدو جنگ کو ممکن بنا دیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دریافت کم و بیش ایک اتفاق کا نتیجہ تھی جس کو رونٹجن نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ایسی نلکیوں میں، جنھیں ممکن حد تک ہوا سے خالی کر دیا گیا تھا، بجلی کے کرنٹ خواص پر کچھ تجربات کر رہا تھا۔ کسی نامعلوم سبب کی بنا پر اس نے ایک ہوا سے خالی نلکی کو سیاہ کاغذ سے ڈھک دیا اور روشنی بند کر دی اس کے بعد عین اس لمحے جب وہ اس نلکی میں بجلی کا ایک کرنٹ گزار رہا تھا، اسے اپنی میز پر کوئی دمکتی ہوئی چیز نظر آئی۔ یہ ایک تختہ تھا جس پر بیریم پلاٹنو سائنائڈ چڑھا ہوا تھا۔ وہ غور سے اس تختے کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے دیکھا کہ دمک اب تک اسی طرح موجود ہے۔ تختہ نلکی سے دو میٹر دور تھا۔ پھر جب اس نے تختے کو حرکت دینا چاہی تو فطری طور پر اس کا ہاتھ تختے اور نلکی میں موجود شعاعوں کے منبع کے درمیان آ گیا اور فی الفور اس کو اپنے ہاتھ کا خاکہ تختے پر نظر آنے لگا۔ بلاشبہ یہ بڑی دلچسپ بات تھی مگر قبل اس کے کہ وہ اس دریافت کے عملی استعمال کے امکانات پر توجہ دیتا، اس کا ذہن شعاعوں کی نادر خصوصیات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی طرف منعطف ہو گیا اور وہ ہمہ تن ان شعاعوں کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔ ۲۲۔ جنوری ۱۸۹۶ء کو ورزبرگ یونیورسٹی میں اس نے ان شعاعوں پر پہلا کھلا لیکچر دیا۔ اس موقع پر علم تشریح الابدان کے ایک معمر ماہر "روڈولف کولی کر" نے اسے

اپنے ہاتھ کا ایکس رے کرنے کی اجازت دے دی. چنانچہ پلیٹ تیار کی گئی اور لیکچر کے خاتمے کے بعد جب یہ پلیٹ دیکھی گئی تو ہر طرف ایک کھلبلی سی مچ گئی اور پھر تو دنیا کے ہر حصے سے خطوط آنے لگے جن میں اعتراف کیا گیا کہ ایسا عجوبہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا مگر اب یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت تھی۔ لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ جب برقی رو ہوا سے خالی نلکی سے گزاری جاتی تو اس کے سامنے رکھی ہوئی فوٹوگرافک پلیٹوں پر تصویر اُتر آتی تھی جو خوب اچھی طرح ڈھکی چھپی ہوتی تھیں۔

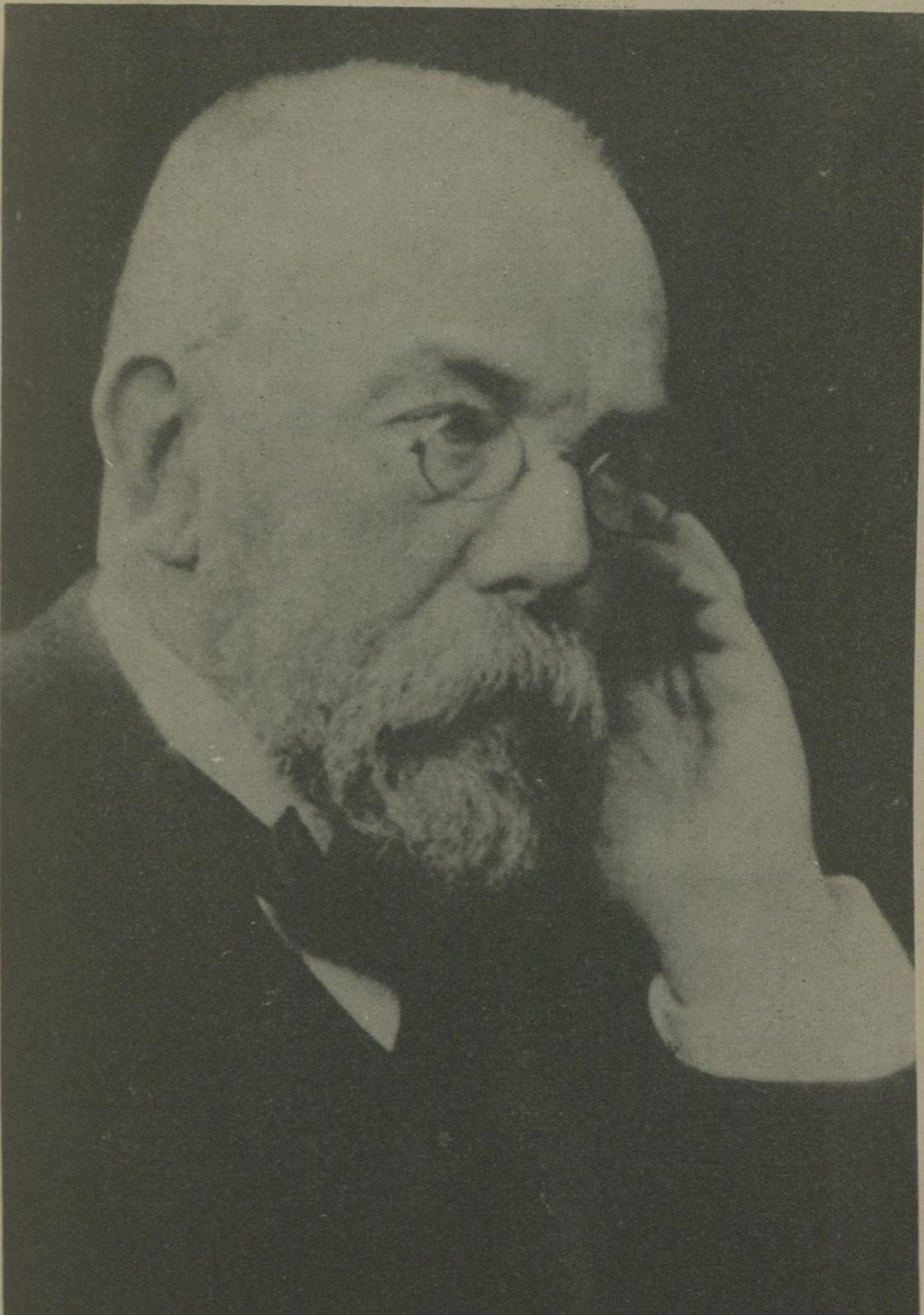
بہر حال رونٹجن وہ پہلا آدمی تھا جس نے اس تکنیک کو اپنایا۔ وہ صرف مشاہدہ کرنے ہی کی اعلیٰ صلاحیت کا مالک نہیں تھا بلکہ صحیح نتائج مرتب کرنے کی اہلیت بھی رکھتا تھا۔ یہی اس کا راز تھا۔ فی الحقیقت وہ انتہائی دقیقہ رس اور کسی قسم کی قیاسی اصول سازی کو کھلم کھُلاّ مشتبہ قرار دیتا تھا۔

رونٹجن نے جس طرح ایکس ریز کو' بغیر یہ سمجھے ہوئے کہ وہ کس طرح عمل کرتی ہیں، محض اتفاق سے دریافت کر لیا تھا' اس طرح اس کا علمی زندگی میں داخل ہونا بھی کلی طور پر ایک اتفاق ہی کا نتیجہ تھا ہوا یہ کہ اسکول کے آخری امتحان میں وہ کسی وجہ سے ناکام رہا۔ چنانچہ اس کو جرمنی کی کسی یونیورسٹی میں داخلہ نہ مل سکا۔ اس صورتِ حال سے مایوس ہو کر وہ زیورچ (سوئٹزرلینڈ) چلا گیا جہاں پولی ٹکنیک کے طلبہ کو اپنی

اہلیت ثابت کرنے کے لیے کسی کاغذی سند کی ضرورت پیش نہ آتی تھی چنانچہ وہاں اس کو داخلہ مل گیا اور وہ مکنیکل انجینئرنگ سیکھنے لگا۔ مکنیکل انجینئرنگ کا ڈپلوما حاصل کرنے کے ایک سال بعد اِس نے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کے بعد طبعیات کے ایک ماہر پروفیسر کنڈٹ سے ملا جس نے اسے اپنا نائب بنا لیا اور اپنے ساتھ ورزبرگ کی یونیورسٹی لے گیا جہاں اس نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا مگر یونیورسٹی کے کارپردازوں نے اسے تعلیم دینے کی اجازت نہ دی۔ آخر کار وہ اسٹارس برگ کی نئی یونیورسٹی میں چلا گیا جہاں کی منتظمہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتی تھی کہ کس نے اپنے سکول کا آخری امتحان پاس کیا ہے، کس نے نہیں؟ اس یونی ورسٹی کے زینے طے کر کے رونٹجن جرمن یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کا اہل ثابت ہوگیا ——— چنانچہ اسے ورزبرگ یونیورسٹی میں پروفیسر کا عہدہ مل گیا۔ اس کے بعد وہ میونخ یونیورسٹی چلا گیا جہاں آخر وقت تک اپنے منصب پر فائز رہا۔ اسے ایکس رے پر کام کرنے کے صلے میں متعدد اعزازات بھی دیے گئے جنھیں اس نے اپنی ذات کے لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ اس کے جواب میں وہ لکھتا ہے: "جرمن پروفیسروں کی اس اعلیٰ روایت کو قائم رکھنے کے لیے کہ دریافتیں اور ایجادات ہر فرد کی ملکیت ہیں، انھیں مختص کر کے اور اجارہ داری قائم کر کے ذاتی ملکیت نہ بنانا چاہیے"۔

اس نظریے کے تحت اس نے وہ خطاب قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اس سلسلے میں اسے پیش کیا گیا تھا اور پھر جب وہ دن کہ ۱۹۰۱ء میں طبیعیات کے سلسلے میں پہلا نوبل پرائز دیا گیا تو اس کی ساری رقم اس نے محتاج بچوں میں تقسیم کر دی۔ رونٹجن دس فروری ۱۹۲۲ء کو لینپ کے چھوٹے سے شہر میں فوت ہوا جہاں ۱۸۴۳ء میں وہ پیدا ہوا تھا۔ اس کا مکان رونٹجن کے عجائب گھر کی حیثیت سے آج بھی مرجع خلائق ہے۔

(جرمی لین)



رابرٹ کوخ
ماہرِ امراض

رابرٹ کوخ

(۱۸۴۳ء - ۱۹۱۰ء) ماہر امراض

۱۸۸۲ء میں رابرٹ کوخ نے دعوےٰ کیا کہ اس نے اس مادّے کو شناخت کر لیا ہے جو تپ دق کا سبب بنتا ہے۔ اسی دریافت پر اس کی شہرت کی بنیادیں رکھی ہوئی ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اس کی واحد دریافت ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا نام پہلے ہی سے اس تحقیقی کارنامے کی بدولت مشہور ہو چکا تھا جو اس نے مویشیوں کی ایک خطرناک وبائی بیماری انیتھراکس (پھیپھڑی) کے سلسلے میں انجام دیا تھا اور جس نے طبی تحقیقات کے مرحلوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔

رابرٹ کوخ ۱۸۴۳ء میں کلاستھال میں پیدا ہوا۔ گوٹنجن یونیورسٹی میں طبی تعلیم مکمّل کی اور صوبۂ پومن کے ایک چھوٹے سے شہر وولیٹن میں ڈاکٹری کرنے لگا۔ فرائض کی انجام دہی کے بعد اسے اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ جرثوموں کی تحقیقات کرتا رہے۔ ۱۸۷۳ء میں اس نے انیتھراکس کے مطالعے کا آغاز کیا اور جلد ہی اس جرثومہ کو شناخت کر لیا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ مرض پیدا

کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کا اگلا قدم تحیّر خیز تھا ــــــــ خصوصی لوازمات کے ساتھ اس نے اہتمام کیا کہ ان جرثوموں کو جسم سے باہر پرورش کیا جائے اور اس میں کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ جرثومے جب تندرست جانور کے جسم میں داخل کر دیے جائیں وہ اینتھراکس کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ ایسا کرنے میں اس نے مرض کے اسباب وعلل کا بھی یقین کر لیا اور تحقیقات کی ایک نئی بنیاد رکھ دی۔ ۱۸۷۶ء میں اس نے اپنے تحقیقاتی نتائج کا اعلان کیا۔

دوسرے سال اس نے تحقیقات کا دوسرا حصہ پیش کیا جو جرثوموں کے مطالعے، انھیں محفوظ رکھنے اور ان کی فوٹوگرافی کے طریق کار سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ اس نے رنگوں کے ذریعے باریک جرثوموں کو رنگنے اور انھیں واضح طور پر شناخت کرنے کے نئے طریقوں کا بھی انکشاف کیا پھر زخموں کی زہریلی نوعیت پر بھی تفصیلی تفتیش کی۔

اس طرح رابرٹ کوخ کی شہرت روز افزوں ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بااثر دوستوں اور مدّاحوں کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ چنانچہ ۱۸۸۰ء میں اسے برلن کی امپیریل ہیلتھ اتھارٹی میں ایک آسامی پیش کی گئی جہاں زندگی میں پہلی بار کئی مددگار دیے گئے۔ ابتدا میں اسے نئے حالات سے خود کو ہم آہنگ کرنا مشکل نظر آیا لیکن آگے چل کر اسے معلوم ہو گیا کہ کس ٹولی کی سربراہی کس طرح کرنی چاہیے اسی طرح اس کے نائبین بھی یہ سیکھ گئے کہ ایک واضح منزل کی طرف

صحت و توانائی کے ساتھ گامزن ہونے سے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس کا ایک نائب لکھتا ہے:

"میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا۔ ان دنوں تقریباً ہر روز بیکٹیریا (جرثومات) کے نئے نئے عجائبات روشنی میں آتے تھے۔"

جرثوموں کے خالص مجموعوں کو تیار کرنے کے سلسلے میں کوخ کی تکنیک بہتر سے بہتر ہوتی گئی۔ ۱۸۸۱ء کے موسم خزاں میں اس نے اپنی تحقیقات کے اس حصّے کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں اس کا نام زبان زد خلائق ہو گیا۔ یہ تحقیق اس مادے کی شناخت کے متعلق تھی جو تپ دق پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اسے ۲۷۰ تجربات کرنا پڑے مگر آخر وہ کامیاب ہو گیا۔ ۲۴ مارچ ۱۸۸۲ء کو برلن سوسائٹی برائے امراضِ سینہ کی مشہور عمارت کا ایک کمرہ اہم لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر رابرٹ کوخ نے تقریباً اسّی سائنس دانوں کے سامنے جرثوموں کی پرورش کرنے کی خاص تکنیک کی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ جرثوموں کی پرورش کرنا اور انھیں دیکھنا کس قدر مشکل مسئلہ تھا اور اس تکنیک تک وہ کس طرح پہنچا۔ اس نے بیان کیا کہ اس نے رنگریز سے رنگ کی ایک پڑیا اُدھار لی۔ اس میں الکلی ملائی تاکہ وہ جرثوموں کے اندر جذب ہو کر انھیں رنگ دار بنا دے۔ یہ بیان کرنے کے بعد اس نے حاضرین کو دعوت دی کہ وہ اس خوردبین میں بچشمِ خود ملاحظہ کریں، اندر ایک ملی میٹر کے ۳، ۴ ہزارویں حصے جتنی ایک لمبی چیز دکھی گئی

اس سے ثابت ہو گیا کہ تپ دق کوئی موروثی مرض نہیں جیسا کہ اس وقت تک سمجھا جاتا رہا تھا، بلکہ متعدی نوعیت کا ہے اور اس کا بھی اسی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے جس طرح دیگر امراض کا۔

ایک شخص جو اس لیکچر کے موقع پر موجود تھا، لکھتا ہے:

"کسی دوسرے لیکچر نے مجھ پر کبھی اتنے تاثرات مرتب نہیں کیے میں نہیں جانتا کہ مجھے کس بات پر زیادہ متحیر ہونا چاہیئے، نئی سائنٹفک دنیا پر جو میرے سامنے اُبھرتی جا رہی تھی یا اس آدمی پر جس نے ادویات کے میدان میں عظیم دریافتیں کی تھیں؟ کون ہے جس نے اپنے نتائج ظاہر کرنے سے پہلے اس وقت تک انتظار کیا ہو جب تک کہ اس کی مکمل تفصیلات حاصل نہ ہو گئی ہوں یہ صرف رابرٹ کوخ تھا۔"

رابرٹ کوخ کا وہ لیکچر بلاشبہ مثالی سمجھا گیا لیکن ہر شخص اس سے پوری طرح مطمئن نہ تھا۔ یہ کیفیت کوخ کی دریافت کے عالمگیر اعتراف سے کچھ عرصہ پہلے تک قائم رہی لیکن جہاں تک کوخ کا تعلق ہے اسے اپنے درست ہونے پر کبھی شبہ نہیں ہوا۔

اس کامیابی کے بعد بھی اس نے آرام نہیں کیا۔ دوسرے ہی سال مصر میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ وہاں کی حکومت نے جرمن اور فرانس کے ڈاکٹروں سے مدد کی اپیل کی۔ چنانچہ کوخ سے جرمنی کی ٹیم کی قیادت کرنے کو کہا گیا۔ نتیجے میں وہ اگست ۱۸۸۳ء میں اسکندریہ جا پہنچا اور ان

جرثوموں کی دریافت کی تدبیر کرنے لگا جو مرض پیدا کرتے ہیں۔ اسس عرصے میں دبا کا زور ختم ہو چکا لیکن اس نے گھر واپس آنے کے بجائے اپنی تحقیقات جاری رکھنے کے لیے ہندوستان جانے کی اجازت طلب کی اور کلکتہ میڈیکل کالج میں ہیضے کے خالص جرثوموں کی شناخت و پرورش کر کے ان کا مطالعہ کرنے لگا اور اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ طبعی طور پر صحت مند افراد بھی ان جراثیم کے حامل ہو سکتے ہیں۔

کوخ کی عظیم کامیابیوں نے حکومت جرمنی کو اس بات پر آمادہ کر دیا کہ وہ اس کے لیے پروفیسری کی پرسکون آسامی مہیّا کرے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں اس کا تقرر برلن یونیورسٹی میں حفظانِ صحت کے پروفیسر کی حیثیت سے ہو گیا۔ وہ اس منصب پر بڑے استقلال سے کام کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ۱۸۹۱ء میں اسے ادارۂ امراضِ متعدی کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا گیا۔ اس نئی اسامی نے اس کے لیے یہ بات ممکن بنا دی کہ وہ تپ دق کے مرض اور اس کے علاج کے بارے میں اپنی تحقیقات جاری رکھ سکے۔ اہلِ علم اس بات سے باخبر تھے کہ وہ تجربات کر رہا ہے چنانچہ اگست ۱۸۹۰ء میں جب برلن میں دسویں بین الاقوامی میڈیکل کانگریس منعقد ہوئی تو ہر شخص اس کی جانب سے کسی انکشاف کا منتظر تھا۔ کوخ بھی اپنے بیان کے بارے میں ہر طرح محتاط تھا۔ اس نے صرف یہ اعلان کیا کہ وہ ایک ایسا جوہر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے جو جرثوموں کو پھیلنے سے روکنے کی سکت رکھتا ہے اسے

اس بات کا یقین نہیں تھا کہ اس کے علاوہ بھی وہ کچھ اور معلوم کر سکا ہے۔ بہر حال اخبارات نے لکھا کہ اس نے تپ دق کا ایک علاج دریافت کر لیا ہے جس کا بڑا ردِ عمل ہوا اور لوگ مرض سے نجات پانے کی امید میں جوق در جوق برلن پہنچنے لگے اور یقیناً وہ مایوسی بھی بڑی وحشتناک تھی جب یہ پتا چلا کہ نیا جوہر جسے بعد میں ٹیوبر کولین کہا گیا، امراض کو ختم نہیں کر سکتا۔ تشخیص کرنے کے سلسلے میں تو وہ بلاشبہ بہت کار آمد ثابت ہوا اور بہت سی زندگیوں کو بچانے میں معاون ہوا لیکن اس سے زیادہ اس کی کوئی افادیت نہ تھی۔ مجموعی طور پر یہ سارا قصہ انتہائی مایوس کن رہا۔ خاص طور پر کوخ کے لیے جو یہ یقین رکھتا تھا کہ وہ ایک اہم اور صحیح منزل کی سمت گامزن ہو چکا ہے۔

۱۸۹۲ء میں اسے ہیضہ پر تحقیق کرنے کا ایک اور موقع ملا۔ جب ہیمبرگ میں یہ وبا پھیل گئی تھی۔ اس بار اس کی تراکیب بہت موثر ثابت ہوئیں اور یہ اسی کی کاوش کا ثمر تھا کہ حکام وبا کو شہر کے متاثرہ دائرہ میں ہی محدود رکھنے پر قادر ہو گئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۸۹۶ء میں رابرٹ کوخ کو جنوبی افریقہ میں کیپ کالونی کی جانب سے مدعو کیا گیا کہ وہاں پہنچ کر وہ مویشیوں کی وبائی بیماری انڈرپٹ کے اسباب و علل معلوم کرے۔ یہ بیماری سارے افریقہ میں مویشیوں کے ریوڑوں کے لیے ایک سنگین خطرہ بنی ہوئی تھی چنانچہ وہ اس دعوت کے مطابق سال رواں کے اختتام میں کیپ کالونی پہنچ گیا۔ کوخ مرض

کے جرثوموں کو مائیکروسکوپ کے ذریعے دیکھنے یا انھیں علیحدہ پیدا کر کے پرورش کرنے کی کوششوں میں تو ناکام رہا لیکن متاثر جانوروں سے مرض کے مادّے کو حاصل کر کے اس سے ایک ایسی انسدادی دوا تیار کرنے میں ضرور کامیاب ہو گیا جو تندرست جانوروں کو وبا کی لپیٹ میں آنے سے محفوظ رکھ سکتی۔ نتیجے میں جنوبی افریقہ کے ۵، فیصد مویشی اس موذی مرض کی گرفت میں آنے سے بچا لیے گئے۔

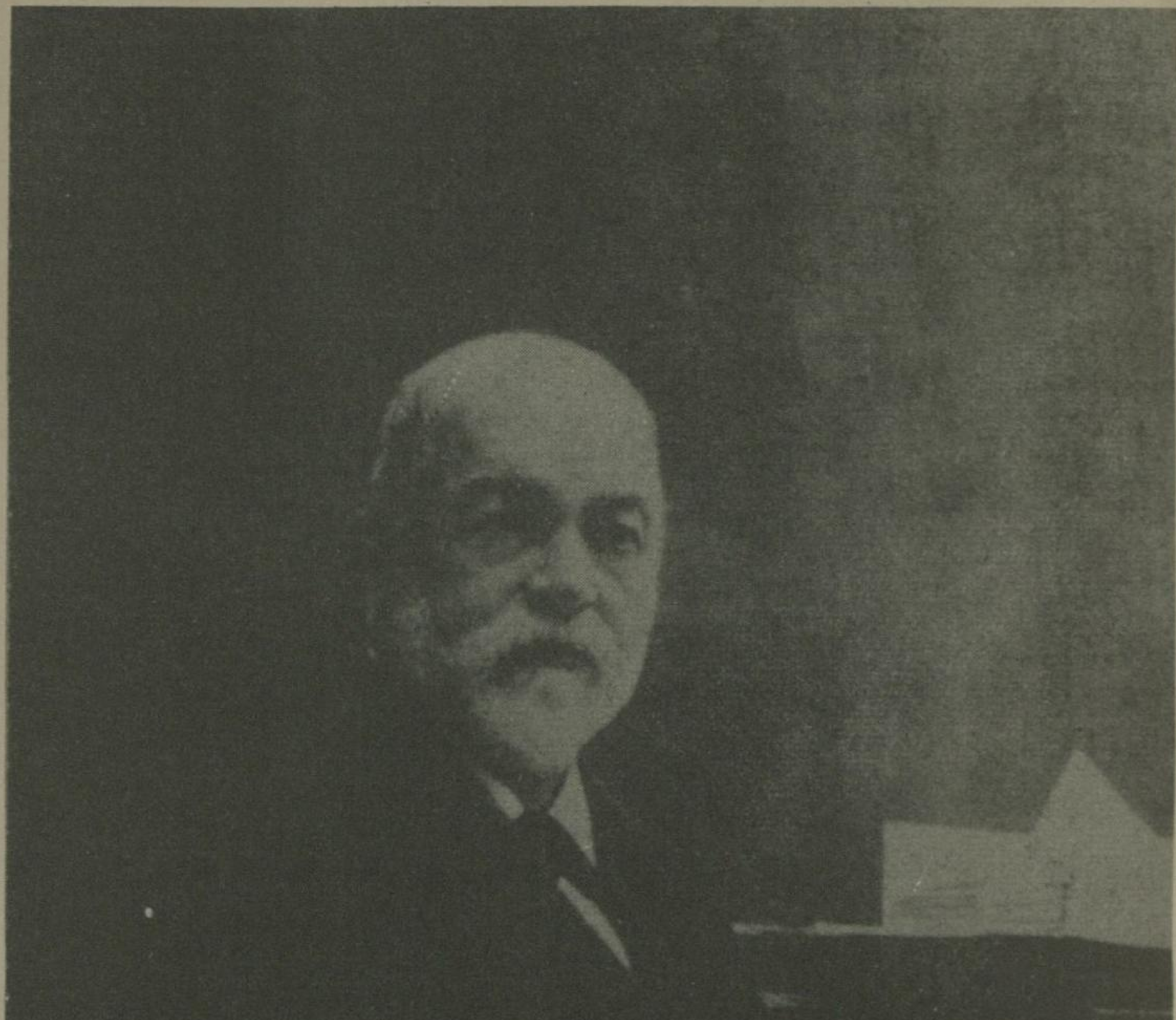
ایک دوسرا مرض، جس پر رابرٹ کوخ نے تحقیق کی۔ ملیریا تھا جو ان دنوں یورپ میں عام تھا۔ کوخ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس مرض کے حاملِ جراثیم مچھروں کو کلی طور پر ختم تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ کم کیا جا سکتا ہے، پھر اس نے تجویز کیا کہ صحت مند انسانوں کے خُون میں ملیریائی جراثیم کے جو اجزا پہنچ چکے ہیں، انھیں خارج کرنے کے لیے ایک بڑی مہم چلائی جائے۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے دور کی معیاری دوا کونین سے نہ صرف ان افراد کو نجات دلانے کا کام لیا جو مرض میں مبتلا ہو چکے تھے بلکہ ان افراد کی حفاظت بھی کی جنھیں کسی بھی وقت جراثیم اپنا شکار بنا سکتے تھے۔ پھر اس نے افریقہ جا کر وہاں کی ایک خاص ڈبانیند کی بیماری پر بھی تحقیق کی۔

رابرٹ کوخ نے ہمیشہ اس بات پر بڑا زور دیا ہے کہ کسی وبائی مرض کی انسدادی تدابیر اور اس کے موثر علاج دونوں پر پوری توجہ دینی چاہیے چنانچہ ۱۹۰۰ء میں جرمنی میں ایک نیا قانون پاس کیا گیا جس میں

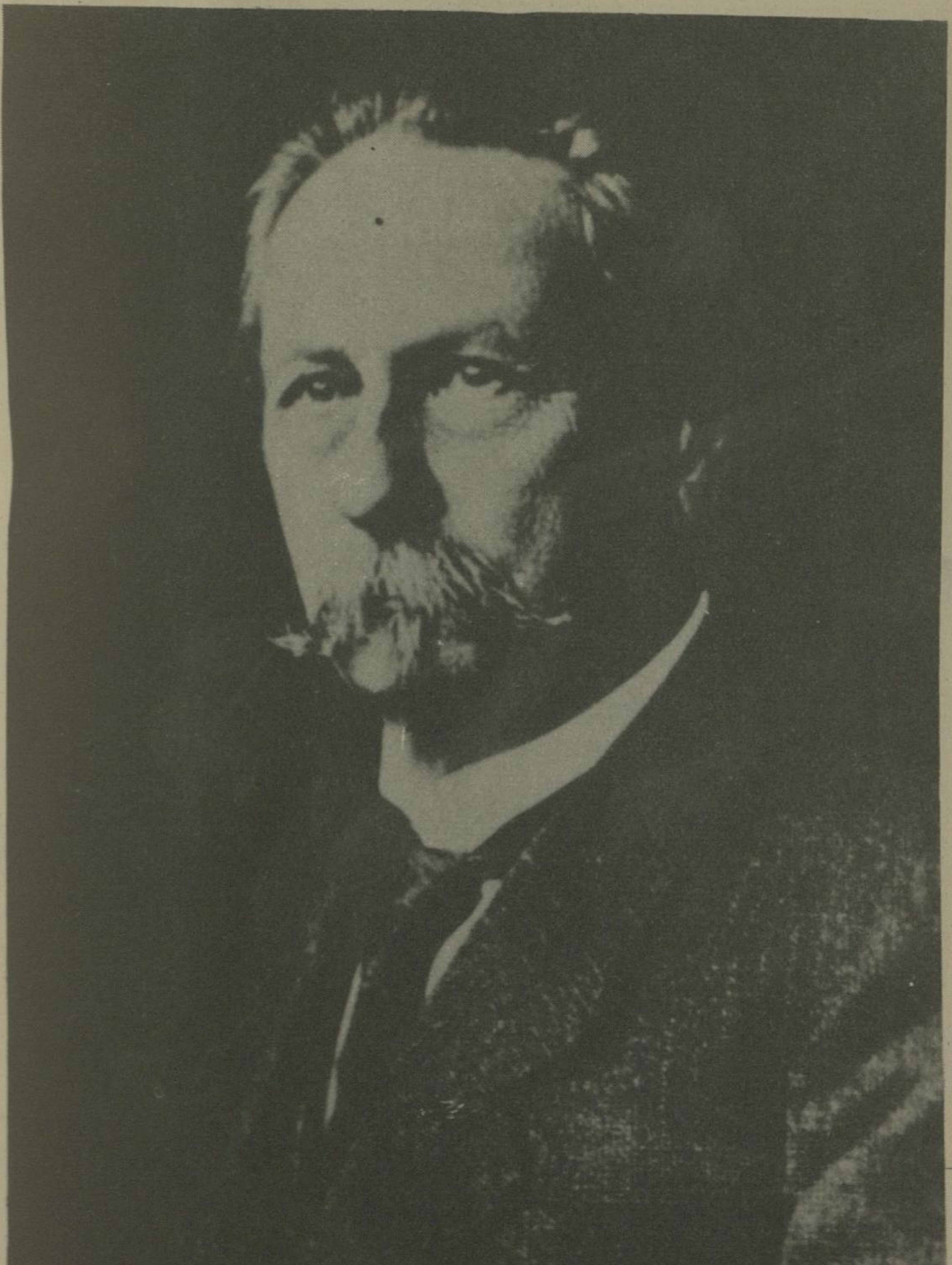
صراحت کی گئی کہ وبائی امراض کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے کیا کیا کرنا چاہیے؟ اس قانون کی ترتیب میں کوخ کا بڑا حصّہ تھا، اس سے اس کی تدبیری صلاحیت جھلکتی ہے۔

۱۹۰۴ء میں وہ سرکاری طور پر ریٹائر ہو گیا لیکن ذاتی طور پر اس کے بعد بھی پہلے ہی کی طرح کام کرتا رہا۔ ۱۹۰۵ء میں اسے ادویات کا نوبل پرائز دیا گیا۔ اب اسے عالمی طور پر اس اعزاز کا مستحق تصور کیا گیا تھا، تاہم وہ تپ دق کا شافی علاج دریافت نہ کر سکا حالانکہ اس کی اسے بڑی آرزو تھی۔ تاہم اس نے بعض فیصلہ کن اقدامات کیے جن سے مرض کے مادّے کی شناخت اور صحیح تحقیقات کے ان طریقوں کی رہنمائی ہوئی جو آج بھی معیاری حیثیت رکھتے ہیں۔ اس عظیم ماہر امراض کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہو گیا۔

(جرمی لین)



گوٹلیب ڈیملر
موٹر کار کا موجد



کارل بنیز
موٹر کار کا موجد

کارل بینز اور گوٹلیب ڈیملر

موٹر کار

کے موجد

(۱۸۴۴ء - ۱۹۲۷ء اور ۱۸۳۴ء - ۱۹۰۰ء)

کارل بینز اور گوٹلیب ڈیملر دونوں موٹر سازی کی انجینئرنگ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بینز ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور ڈیملر ۱۸۳۴ء میں۔ دونوں صحیح معنی میں ہمعصر تھے لیکن وہ کبھی ایک دُوسرے سے نہیں ملے۔

کارل بینز نے سب سے پہلا انجن اس وقت دیکھا جب ۱۸۶۱ء میں اسے ایک فرانسیسی لینوائر گیس انجن کا معائنہ کرنے کا موقع ملا اور پہلا تجربہ ۱۸۷۷ء میں کیا۔ ان ایّام میں اس نے گھوڑے کی طاقت والے گیس انجن میں کچھ جدّتیں کیں۔ ۱۸۸۰ء تک وہ انجن تسلّی بخش طریقے پر کام کرتا رہا۔ چنانچہ اس کامیابی کی روشنی میں بڑے پیمانہ پر اقامتی انجن تیار کرنے کے لیے "مین ہیم گیس موٹر فیکٹری" کے نام کا ایک ادارہ بنایا گیا مگر بینز جلد ہی اس ادارے سے علیحدگی پر مجبور ہو گیا کیونکہ اسے نصب شدہ انجنوں کے علاوہ دوسرے

انجنوں کے لیے تجربہ کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا تھا۔

۱۸۸۴ء میں اس نے "بنیز اینڈ سائی" کے نام سے ایک نئی کمپنی بنائی جس کے تحت قائم ہونے والے کارخانے کی مصنوعات جلد ہی اچھی طرح فروخت ہونے لگیں۔ اس کامیابی کا مطلب یہ تھا کہ اب بنیز اطمینان کے ساتھ کار بنانے پر اپنی توجہ مرکوز کر سکتا تھا یہی وہ خواہش تھی جسے پورا کرنے کی اسے ایک مدّت سے آرزو تھی۔

اس نے جو کار بنائی تھی اس میں صرف تین پہیّے تھے۔ اس لیے نتیجہ کچھ اطمینان بخش نہ رہا۔ پھر بھی یہ بات ذہن نشین رہے کہ بنیز نے انجن سازی کی بعض نئی راہیں کھولی تھیں اور اس کی ایجاد کردہ کار چار ایسی خصوصیات کی حامل تھی جو آج کے دور میں بھی اپنائی جاتی ہیں۔ اس میں پانی کے ذریعے ٹھنڈا ہونے والا انجن تھا، برقی اگنیشن کا انتظام تھا، ڈفرنشیل گیرنگ کا نظام اور مشینی طور پر کام کرنے والے انلٹ والوز تھے۔ ۱۸۸۵ء میں سب سے پہلے اس کار کا امتحان لیا گیا اور اسی سال اس نے شاہراہِ عام پر ۱۲ کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ایک ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا مگر چلتے ہی چلتے وہ ٹوٹ گئی اور اسے دھکے دے کر گھر لانا پڑا ـــــ لیکن انجام کا منڈلاتی ہوئی پریشانیوں کا نزول کم ہونا شروع ہو گیا۔

بنیز کار نے پہلے پہل اخبارات کی جو توجہ حاصل کی وہ خوش آئند تھی مگر بعد میں اس پر اعتراضات اور ناپسندیدگی کی بھرمار ہو گئی۔ گھوڑے اسے قریب دیکھ کر بھڑک اٹھتے تھے، اس لیے حکام نے اس پر پابندی لگادی، اس کے باوجود اس کار نے ۱۸۸۶ء کی میونخ نمائش میں سونے کا تمغہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد بھی اس کے عام استعمال کی اجازت نہیں دی گئی۔ صرف بنیز کو یہ رعایت تھی کہ وہ مقامی سڑکوں پر اسے چلا سکتا تھا مگر اس شرط کے ساتھ کہ راہ گیروں کے قریب آنے سے قبل ہی وہ ہاتھ کی گھنٹی بجا کر انھیں چوکنّا کر دیا کرے۔

کارل بنیز پہلا آدمی تھا جس نے سلسلہ وار کاریں تیار کیں.... ۱۸۸۹ء میں اس نے ۲۰۰۰ ماڈل فروخت کیے۔ ۱۸۹۹ء میں اس کے کارخانہ کی موٹروں کی پیداوار ۵۷۰ تک پہنچ گئی مگر ۱۹۰۳ء میں یہ پیداوار بدبختی کی حد تک گر گئی۔ بنیز کی کاروں کی مقبولیت کے زوال کا واحد ذمہ دار گوٹلیب ڈیملر تھا، جس کی رائے تھی کہ لوگ اس سے کچھ زیادہ رفتار چاہتے ہیں جتنی بنیز کی کار مہیا کرتی ہے

گوٹلیب ڈیملر نے ایک انجینئر کی طرح تربیت پائی تھی، اور ۱۸۷۲ء میں کولون کی مشہور فرم "اوٹو اینڈ لینگن" میں بحیثیت ٹیکنیکل ڈائریکٹر مامور ہونے سے قبل ہی خاصی عزت و شہرت رکھتا تھا۔

ڈیملر کو اس بات کا احساس تھا کہ اس دور کے انجنوں کی رفتار بڑی سست ہے اور جب وہ کسی پاور یونٹ کی حیثیت سے کسی گاڑی میں نصب کر دیے جائیں تو ان میں تیز چلنے کی گنجائش نہیں۔ اس سلسلے میں اس کے ذہن میں ایک بہتر تصور موجود تھا ـــــــ ایک تیز رو اور ہلکے وزن کی موٹر کا تصور جو متعدد مقاصد میں استعمال کیے جانے کے لیے موزوں ہو۔ اس خیال کو بہتر شکل میں لانے کے لیے اسے آزادی کی ضرورت تھی، مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ شیطان کے قدم بہ قدم کام کرنے پر بھی آمادہ تھا۔ آخر مالکان سے حجت و تکرار کر کے اس نے کارخانے میں تیار ہونے والے انجنوں کا معیار کچھ بہتر بنایا اور جب اس طرح ان کی فروخت میں اضافہ ہو گیا تو اپنے تصور میں بسے ہوئے انجن کو وجود میں لانے کے تجربات کرنے لگا لیکن نہ مالکان ہی اس کے اس شوق کو برداشت کر سکے اور نہ وہ خود اس سے دست بردار ہونے پر آمادہ ہو سکا۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ ۱۸۸۲ء میں اسے فرم سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

اس ملازمت کے بعد وہ جنوبی جرمنی کے شہر کینٹاٹ چلا گیا اور اطمینان کے ساتھ تجربات میں مشغول ہو گیا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا

کہ تیز رفتار انجن کے لیے سب سے اہم مسئلہ آتش گیری (IGNETION) کا ہے ـــــ ۱۸۸۳ء میں اس نے ایک چیز تیار کی جس کی کارکردگی خاصی تھی اور جس کو اس کا نیا انجن کہا جا سکتا تھا۔ اس انجن کا تکنیکی معیار کچھ زیادہ بلند نہ تھا بلکہ کسی حد تک خام تھا۔ پھر بھی وہ تھا کام کا۔ ڈیملر نے اسے اپنی پرانی فرم کو پیش کیا لیکن اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈیملر اس سے مایوس نہیں ہوا اور اس نے اپنے طور پر کام جاری رکھا۔

اس کا خیال یہ تھا کہ اس انجن کو کسی طرح اس قابل بنایا جائے کہ وہ نقل و حمل کی گاڑیوں میں استعمال ہو سکے۔ چنانچہ موٹر بائیسکل بنا کر اس نے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا۔ یہ دنیا کی پہلی موٹر سائیکل تھی، جو بہت بوجھل تھی۔ تاہم اس بات کی یقینی شہادت موجود ہے کہ ڈیملر کا بیٹا پال ۱۰ رنومبر ۱۸۸۵ء کو اس پر سوار ہو کر کینٹاٹ سے انٹرٹرک ہیم تک گیا اور وہاں سے واپس آیا۔ مجموعی طور پر اس نے اس پر ۳ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس کے بعد ڈیملر نے اپنی اس ایجاد کو پیٹینٹ کرا لیا مگر اسے مزید ترقی دینے پر اس نے کوئی توجہ نہ کی جس کا احساس آگے چل کر ہوا اور اس نے کہا۔ ”اسے اس بات پر تاسف ہے کہ موٹر بائیسکل سستی قسم کی سواری کی نمائندگی نہیں کرتی۔“

اب اس کی توجہ موٹر بوٹ بنانے کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ اپنے نائب ولیم مے باخ کے ساتھ مل کر اس کے بنانے کی فکر کرنے لگا۔ لیکن جلد ہی اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور اس کے بجائے دنیا کی پہلی چار پہیوں والی موٹر کار بنانے کا کام شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک سواری گاڑی (وکٹوریہ) کو اپنانے کا فیصلہ کیا اور بڑے استقلال سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر یہ اطمینان کیا کہ گاڑی ۱½ ہارس پاور کے اس عمودی انجن کا جو اس کے عقب میں لگایا گیا تھا، لڈ وزن باآسانی برداشت کر سکے گی یا نہیں۔ اس مقصد کے لیے گاڑی میں کتنی ہی تبدیلیاں کی گئیں۔ بہر حال نتیجہ کامیاب رہا اور اس کے ذریعے متعدد سفر بحسن و خوبی طے کیے گئے لیکن چونکہ حکام اب تک اس قسم کی نئی خطرناک ایجادات کے سخت مخالفت تھے اس لیے ڈیملر نے اپنا ایک انجن ایک ٹرام میں لگا دیا جو شہر کے اندر چلتی تھی اس تجربے کی افادیت نے حکام کو مجبور کر دیا کہ وہ اس کی گاڑیوں پر سے عاید کردہ پابندیاں اٹھالیں اور انھیں شاہراہ عام پر چلانے کی اجازت دے دیں۔ ۱۸۸۸ء کے موسم بہار میں پہلی موٹر ٹیکسی کرائے پر چلنا شروع ہوئی جس کا اڈہ اسٹنگارٹ اسٹیشن تھا اور جس کی رفتار ۱۱ میل فی گھنٹہ تھی۔

اسی سال ڈیملر نے ہمبرگ میں ایک اور آزمائش کی اور ایک کشتی میں اپنا ایک انجن نصب کر دیا۔ یہ آزمائش انتہائی کامیاب رہی — ۱۸۹۰ء میں متعدد ایسی کشتیاں باقاعدہ کام کرتے نظر آنے لگیں اور امریکہ جیسے دور دراز ملک تک جا پہنچیں حتیٰ کہ اوٹو فان بسمارک نے بھی اس سے ایک تیز رفتار لانچ خریدی جس سے ان کی فروخت میں کافی اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد وہ دور بھی آ گیا جب ڈیملر کی پہلی کامیاب موٹر منظرِ عام پر آ گئی جس سے اس کی بے پناہ شہرت و ترقی کے راستے کشادہ ہو گئے۔ وہ دو نشستی اور چار پہیوں والی مشین تھی اور ساری کی ساری فولاد کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا انجن اس کے پچھلے حصے میں نصب تھا جو پانی کی جیکٹ سے ٹھنڈا ہوتا تھا۔ انگریزی حرف وی (V) کی طرح کے دو سلنڈر اس میں لگے ہوئے تھے۔

اب ڈیملر کے انجنوں کی فروخت خاصی ترقی کر گئی، مگر جہاں تک گاڑیوں کا تعلق تھا اس میں بنیز بہت آگے تھا۔ وہ اس دور میں دنیا کی سب سے بڑی کار فیکٹری کا مالک تھا جس کے ایجنٹ دنیا کے متعدد ممالک میں موجود تھے۔

ڈیملر ایک مدّت دراز تک اپنی تیز رفتار کاروں کو مزید ترقی دینے سے انکار کرتا رہا اور کہتا رہا کہ چار ہارس پاور کا انجن بہت کافی ہے۔ چھ کی ضرورت نہیں۔ لیکن بنیز سے مقابلے کے لیے اسے اپنا یہ

یہ خیال بدلنا پڑا۔ چنانچہ ۱۸۹۸ء اور ۱۸۹۹ء کے دوران جب ڈیملر کی صحت خراب ہو چکی تھی، وہ ولیم میباخ کے ساتھ مل کر ایک زیادہ تیز رفتار موٹر کے نمونے پر کام کرنے لگا۔ یہ مشقت اس کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوئی لیکن آخر کار ۱۹۰۰ء کی مشہور مرسیڈیز کار تیار ہو گئی جس نے اس صنعت کے دوسرے تمام کارناموں کو ماند کر دیا۔ ڈیملر اپنی یہ کامیابی دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہ سکا۔ مارچ ۱۹۰۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

۱۹۰۰ء کی مرسیڈیز کا نمونہ دراصل ڈیملر کے بیٹے پال کا ڈیزائن تھا جس میں میباخ نے بھی کام کیا تھا۔ اس کار کا انجن اپنے زمانے میں سب سے زیادہ طاقتور تھا اور اس کی طاقت ۲۵ گھوڑوں کی طاقت کے برابر تھی۔ ۱۹۰۱ء میں اس نے شہر نائس میں اپنے دوسرے مظاہرے کے موقع پر اوسطاً ۳۵ میل فی گھنٹہ سے کچھ زائد رفتار سے ۲۷۹ میل کا سفر طے کیا۔ اس میں وہ انقلاب آفریں چھتے جیسا ریڈی ایٹر نصب تھا جس نے تیز رفتار اور طاقت ور انجن کو ٹھنڈا رکھ کر اس سلسلے کی اہم ترین دشواری کا حل پیدا کر دیا تھا۔ آگے چل کر وسیع پیمانے پر اس کے ڈیزائن کی خصوصیات کی نقل کی گئی —— ۱۹۰۰ء میں بنیز کی کاروں کی فروخت ۶۰۳ تھی لیکن ۱۹۰۳ء میں گر کر ۱۷۲ رہ گئی۔ اس کا اہم سبب یہی ریڈی ایٹر تھا۔

اب بنیز کی فرم میں تبدیلیاں ہونا لازمی تھیں۔ تاہم بنیز نے نئے انتظامات

کی تکمیل ہونے تک خاموشی اختیار کیے رہا۔ اس کے بعد پھر میدان میں آ گیا۔ ۱۹۲۶ء میں ڈیملر اور بنیز دونوں کی فرموں کا الحاق ہو گیا۔ اس کے تین سال بعد ۱۹۲۹ء میں کارل بنیز کا انتقال ہو گیا۔

(والٹر اے۔ فرانک)

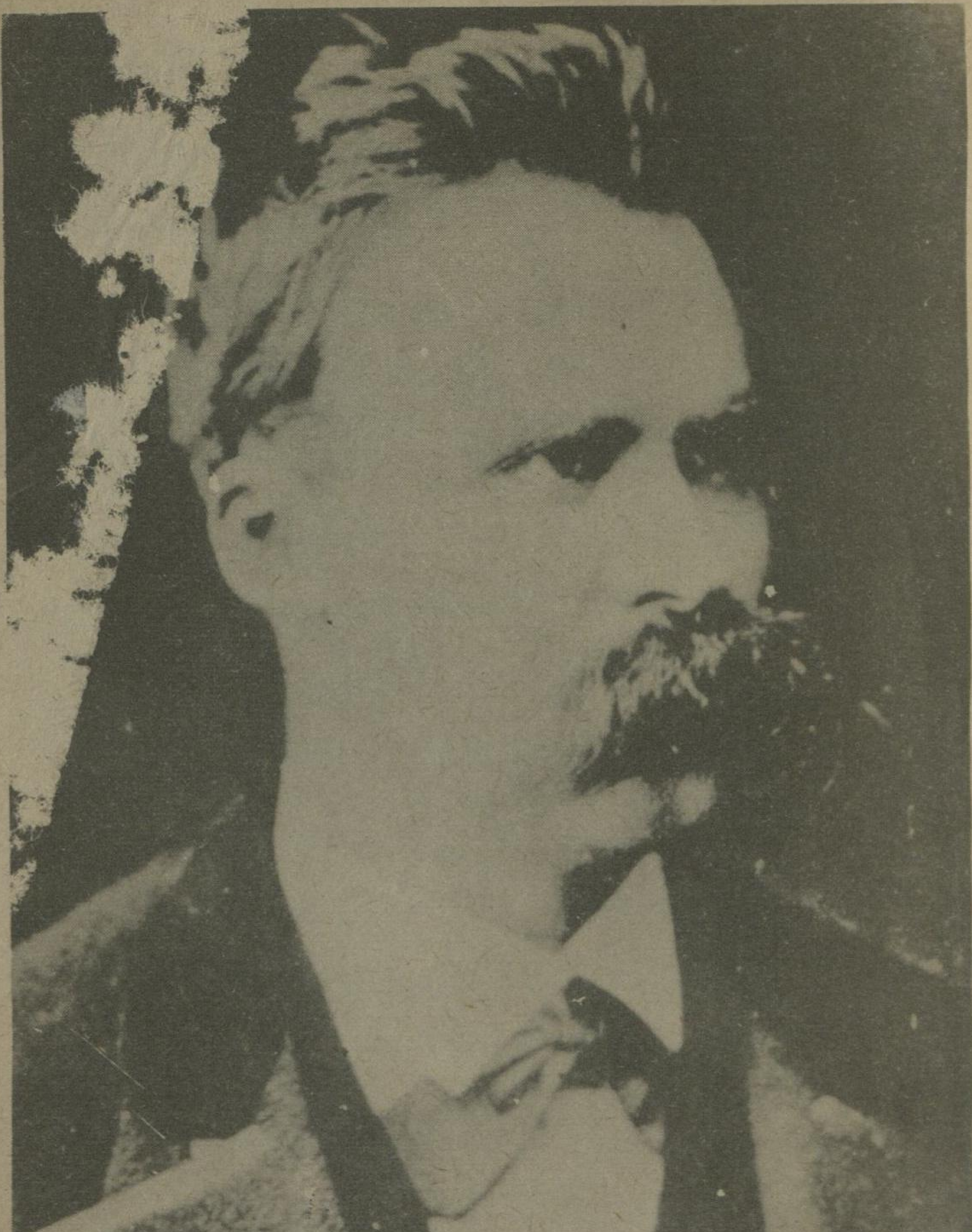
فریڈرک نیٹشے

(۱۸۴۴ء - ۱۹۰۰ء) عظیم جرمن فلسفی

جرمن فلاسفر فریڈرک نیٹشے ہمارے دَور کے ان افراد میں سے ہے جنھیں نہ صحیح طور پر سمجھا گیا اور نہ پیش ہی کیا گیا ہے۔ اس کی تحریروں نے بیسویں صدی کی یوروپی سیاست اور افکار پر فیصلہ کن اثر ڈالا ہے ____ ایسا اثر کہ اگر وہ زندہ ہوتا اور اس کے انداز کو دیکھتا تو کبھی پسند نہ کرتا۔

نیٹشے ۱۵ر اکتوبر ۱۸۴۴ء کو سیکسن کے پروشیائی صوبہ کے شہر روکن میں پیدا ہوا۔ وہ ایک پروٹسٹنٹ پادری کا بیٹا تھا۔ بون اور لیپزگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ۱۸۶۹ء میں سوئٹزرلینڈ کی بیل یونیورسٹی میں لسانیات ادب عالیہ کے پروفیسر کے عہدے پر مامور ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں جب فرانس اور پروشیا کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو وہ یونیورسٹی چھوڑ کر طبی اردلی کی حیثیت سے فوج میں داخل ہو گیا لیکن وہاں جلد ہی اس کی صحت بری طرح بگڑ گئی اور اسے یونیورسٹی واپس جانا پڑا۔

نیٹشے ابتدا میں جرمنی کے مشہور موسیقار رچرڈ ویگنر کا زبردست



فریڈرک نیٹشے

عظیم جرمن فلسفی

مداح تھا جو اپنی غنائی تمثیلوں میں جرمن کے دیو مالائی ماضی کا احیاء کر رہا تھا۔ موسیقار ویگنر نیٹشے سے اس طرح پیش آتا جیسے کہ کوئی مرشد اپنے نوجوان اور ذہین ارادت مندوں سے پیش آتا ہے۔ نیٹشے نے اپنی ابتدائی تحریروں میں ویگنر کی بڑی تعریف کی ہے اور اس پر اس کی بے انتہا پسندیدگی حاصل کی لیکن ویگنر اپنے اس نوجوان اور جذباتی دوست کی آزاد خیالی پر اکثر تاؤ کھاتا اور آخر یہی بات دونوں کے درمیان اختلافات کی خلیج بڑھانے کا سبب بن گئی۔ اس دور کا کوئی بھی جرمن دانشور اپنی قوم کی سیاست اور مذہب و اخلاق پر اتنی شدید اور بے لاگ تنقیدیں نہ کرتا تھا جتنی کہ نیٹشے نے کی اور ویگنر اس کے برعکس روز بروز زیادہ جرمن پرست اور قومی برتری کے نظریے کا موید ہوتا جا رہا تھا۔ وقت کی ترقی کے ساتھ دونوں کے متضاد رجحانات شدت اختیار کرتے رہے حتیٰ کہ ویگنر نے بیرتھ کو اپنے فن کا مستقل مرکز بنا لیا اور وہاں ایک خاص تھیٹر تعمیر کر لیا۔ ۱۸۸۲ء میں ویگنر نے اپنی غنائی تمثیل پارسی فال ایک نائٹ قسم کے ہیرو کے ساتھ جو عیسائیت کے تصورات کا فدائی تھا، پہلی بار پیش کی تو نیٹشے نے اسے مذہب کی جھوٹی عقیدت اور حماقت قرار دیا۔

۱۸۷۹ء میں نیٹشے اپنی گرتی ہوئی صحت کے باعث بیل یونیورسٹی سے استعفیٰ دینے پر مجبور ہو گیا اور اس نے اگلے دس سال سوئٹزر لینڈ کے ایک گاؤں میں تن تنہا اور عجز و انکسار کے ساتھ بسر کیے۔ ان ایام

میں اس کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ صرف اس کے مضامین اور تحریروں کی آمدنی تھی۔ اب وہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ اس کی زندگی سختیوں اور بے نتیجہ مشقتوں کی نذر ہو رہی تھی اور فکری و تحریری کاوشیں عوام و خواص کی جانب سے بہر طور نظر انداز کی جا رہی تھیں۔ پھر بھی اس کی دو کتابیں بہت معروف ہیں جو اس کی خصوصی یاد کو تازہ کرتی ہیں"۔ تب زرتشت نے کہا" اور" اچھائی و برائی سے دور"۔

اس دور میں نیٹشے کو بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے اس کی بینائی کمزور ہو گئی۔ احساسات پژمردگی کا شکار ہو گئے اور جسم کی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ ۱۸۸۹ء میں وہ ذہنی اور جسمانی دونوں طرح مکمل طور پر مفلوج ہو گیا اور اس کے بعد پھر کبھی تندرست نہ ہو سکا۔ آخر کار ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو موضع ویمر میں فوت ہو گیا۔ اس کی بیماری کی نوعیت کا صحیح انکشاف کبھی نہ ہو سکا۔ البتہ علامات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ آتشک کا مریض تھا یا سنگین اعصابی بیماری میں مبتلا تھا۔ صرف دو عورتوں نے اس کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پہلی عورت "ادیبہ لوانیڈریاس سلومی" تھی جو مشہور شاعرہ "رینز ماریا رلکے" کی ساتھی رہ چکی تھی اور مشہور ماہر نفسیات "سگمن فرائڈ" کی پہلی مترجم بھی تھی۔ دوسری عورت جو اس کے قریب رہی، وہ اس کی بہن الزبتھ تھی۔ اس نے اپنی نفرت یا حسد کے سبب نیٹشے اور سلومی کے ان تعلقات میں رخنہ پیدا کر دیا جو شاید ان کی زندگیوں کو خوش گوار بنا سکے۔ نیٹشے کے

مرنے کے بعد اس کی بہن نے بعض انتہائی اہم مسودات اور خطوط کے تحریف شدہ ایڈیشن شائع کیے اور ان پر اپنے ٹیوٹانی عیسائی عقاید اور سامی دشمن کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی۔

دیمر میں اس نے نیٹشے کی ایک یادگار بھی بنائی اور جب جرمن میں نازیوں کا اقتدار ہوا تو وہ ہٹلر کو اس یادگار کی زیارت کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس کے بعد نیٹشے کی تحریروں کے سلسلے میں اس کی تفسیرات بڑے التزام سے شائع کی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا بھائی فی الحقیقت جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے یا تو توڑ مروڑ کر پیش کر دیا گیا یا مسودے سے خارج ہی کر دیا گیا تاکہ اس سے وہی مقاصد حاصل ہو سکیں جو "نیشنل سوشلسٹوں" (نازیوں) کے سیاسی خواہشات کے مطابق تھے۔

نیٹشے انسان کی فطری روش کے سلسلے میں اپنے مشاہدات کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ انسان کی بنیادی خواہش طاقت کی چاہ ہوتی ہے۔ ہر باہمت آدمی یہی چاہتا ہے کہ اسے ایسا اعلیٰ اور برتری کے لحاظ سے طاقت ور مرتبہ میسر آجائے کہ وہ قدرت کاملہ کا ہم پلّہ ہو جائے یا اس کے لگ بھگ ہو سکے اور جب وہ یہ مقام حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے تو اپنے ہی ہم جنسوں پر کامل اقتدار حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس کی ساری جانفشانی جس مقام کے حصول کے لیے ہوتی ہے وہ ایک مافوق البشر مقام ہے۔

مگر لوگ جو ایسی بلند ہمتی نہیں رکھتے وہ اندھی کلیسائیت قبول کرنے کی حد تک گر جاتے ہیں، عقاید کے مخالف خیالات سے خوف کھاتے ہیں اور ایسے طرزِ زندگی سے گھبراہٹ محسوس کرتے ہیں جو ان کے روایتی اور مسلمہ اصولوں سے میل نہ کھاتی ہو۔ نیٹشے متنبہ کرتا ہے کہ انسانیت اس درجے پر آتی دکھائی دے رہی ہے جس میں صحیح قسم کے اہلِ طلب یا باحوصلہ لوگوں کی تعداد جو مافوق البشر کی سطح تک آتے ہوں، بہت ہی کم رہ جائے گی اور اس کے برعکس بے حوصلہ لوگ گنتی میں زیادہ ہو جائیں گے۔ زمین پر روحانی کمال حاصل کرنے میں ناکام ہونے والے اپنی خواہش اقتدار کا رُخ اپنے ہم جنسوں کی طرف موڑ دیں گے اور ان پر حکم چلانے کی آرزو کریں گے۔

نیٹشے عیسائیت کے اس نظریہ کا مخالف تھا کہ اس دنیا میں تو صبر، توکل اور عجز کو اختیار کیا جائے اور آسمانی دنیا کے بارے میں یقین کر لیا جائے کہ مرنے کے بعد وہاں اس کا نیک اجر ملے گا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ اگر صحیح کوششیں کی جائیں تو آدمی اپنی جنّت خود زمین پر حاصل کر سکتا ہے وہ بھی جیتے جی، موت کے بعد نہیں۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ زندگی حادثاتِ پیہم کے ان چکروں کا نتیجہ ہے جو مدت مدید سے جاری و ساری ہے اس لیے اس کو کائنات کسی استدلالی مقصد کے زیر انتظام نہیں دکھائی دیتی۔ بس یہ سمجھیے کہ ازلی تکرار کا ایک مبہم یا بے معنی کھیل ہے جو ہوتا آیا ہے۔

اس بنا پر نیٹشے ہر با فوق البشر چیز کو اتفاقات و حادثات کی تمام نیرنگیوں سے بلند تر ہو کر درویشانہ متحمل مزاجی کے ساتھ دیکھتا ہے، اکثریت کی گونگی کلیسائیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ برتر فہم کا مالک ہے اور زندگی و کائنات کی فطری گہرائیوں پر نظر رکھتا ہے۔

نیٹشے کسی ایسے معیاری ضابطۂ اخلاق پر یقین نہیں رکھتا جو ہر جگہ نافذ کیا جا سکے۔ وہ کہتا ہے کہ تجربات اور فہم کی بنیاد پر مختلف لوگ بلکہ مختلف افراد ذاتی معیار اخلاق رکھتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں وہ لکھتا ہے:
"یہ بات لابدی ہے کہ ایک انسان اپنی تسکین خاطر خود اپنی ذات سے کرتا ہے جو اپنے آپ سے غیر مطمئن ہو جاتا ہے، وہ ہر وقت اس ناکامی کا انتقام لینے پر تُلا رہتا ہے"

نیشنل سوشلسٹوں (نازیوں) نے نیٹشے کے مفہوم کو سراسر غلط سمجھتے ہوئے اس کے فوق البشر کو اپنے خود ساختہ جرمن فوق البشر تصور کا جامہ پہنا دیا جو کرۂ ارض کے مفروضہ کمتر لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ نیٹشے کے اس مسخ شدہ نظریے کی تشہیر نے اسے ناحق بدنام کیا اور وہ لوگ خاص طور پر غلط فہمی کا شکار ہوئے جن کی رسائی اس کی غیر تحریف شدہ تحریروں تک نہیں تھی۔

(گنتھر سیڈوگ)

پال ارلخ

(۱۸۵۴ء - ۱۹۱۵ء)   معالج اور دوا ساز

علاقہ سلیشیا کا چھوٹا سا شہر اسٹرہیلن، جو آج کل پولینڈ میں شامل ہے، جرمن کے اعلیٰ اور نوبل پرائز یافتہ ڈاکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر پال ارلخ کا مقام پیدائش ہے جو ۱۴، مارچ ۱۸۵۴ء کو ایک اقبال مند یہودی تاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ زمانہ طلب علمی سے اسے کیمیائی تجربات اور خاص طور پر رنگ سے تعلق رکھنے والے عناصر سے گہری دلچسپی تھی لیکن وہ اجر جو پہلے سائنٹفک تجربہ کے مظاہرہ پر اسے دیا گیا، بہر حال بڑا تکلیف دہ تھا۔ اس نے اپنی بہن کی چند پسندیدہ فاختاؤں کو چمک دار نیلے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس پر اس کی خاصی پٹائی ہوئی لیکن اس کے بعد اس کے تجربات پر اچھے خاصے انعام دیے گئے جو اس کی امیدوں کے لیے سنگ میل ثابت ہوئے۔

لیپزگ یونیورسٹی میں ڈاکٹری کی تعلیم کے سال دوم میں ارلخ نے جانوروں کے داخلی مادوں کے خورد بینی تجربے کے سلسلے میں کیمیائی رنگوں کے استعمال کی ایک نئی ترکیب ایجاد کی جو علوم تشخیص و تجزیہ کے میدان میں ایک انتہائی اہم اور ہمت افزا اقدام تھا۔ اس

ت اس کی عمر صرف ۲۲ سال تھی۔ دو سال بعد وہ ادویات کا فارغ التحصیل ڈاکٹر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کیمیا سے بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھی جس کا اس نے بڑے ذوق کے ساتھ مطالعہ کیا تھا۔ اس کا تحقیقی مقالہ "تجزیاتی رنگ آمیزی کے نظریات و عمل میں اضافے" اس کے تقریباً ان سارے افکار کا حامل ہے جنھوں نے اس کے بعد کی ۳۷ سال کی تحقیقاتی سرگرمیوں کا تعیّن کیا۔ ارلخ کی تحقیقاتی تصنیفات، جو آج چار ضخیم جلدوں اور کثیر خطوط پر مشتمل ہیں - اس کی محیر العقول کارکردگی اور حیرت انگیز انہماک کی دلچسپ شہادت پیش کرتی ہیں۔ عالمی شہرت حاصل کرنے کے بعد بھی وہ روزانہ ایسی تجربہ گاہوں اور کمروں میں وہ مسلسل بیس گھنٹوں تک کام کرتا رہا جن کا دقیانوسی ساز و سامان ان عظیم نتائج کے معیار سے بالکل گرا ہوا تھا جو اس نے حاصل کیے۔

پال ارلخ اعزاز حاصل کرنے کے فوراً بعد چارٹے میں سینئر فزیشن کی حیثیت سے مقرر کر دیا گیا جو اس زمانے میں برلن کا سب سے زیادہ شہرت یافتہ اسپتال تھا۔ یہاں اس کو اپنا سارا وقت عملی تحقیقات پر صرف کرنے کا موقع ملا۔ ۱۸۸۲ء میں اس کا رابطہ تپدق کے جرثومے کے عظیم دریافت کنندہ رابرٹ کوخ سے ہُوا جسے اس نے جرثوموں کو رنگنے کی خود اختراعی ترکیب بتائی۔ رابرٹ کوخ اس سے بے حد متاثر ہوا۔ آگے چل کر ارلخ بدقسمتی سے تپ دق

کے خطرناک جراثیم پر تجربہ کرتے ہوئے خود ان کا شکار ہو گیا۔ اس مرض میں مبتلا ہو جانے کے باعث اس نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مصر چلا گیا جہاں وہ صحت یاب ہو گیا اور ایک پرائیویٹ سائنس دان کی حیثیت سے اس نے اپنی تحقیقاتی کارگزاریاں جاری رکھنے کے لیے پھر برلن لوٹ آیا۔

۱۸۹۶ء میں رابرٹ کوخ نے اس سے متعدی امراض کے ادارۂ کوخ میں شامل ہونے کی درخواست کی۔ ارلخ نے یہ پیش کش قبول کر لی اور سیرم کے علاج کے میدان میں ایک دوسرے عظیم جرمن فزیشن ایمیل بہرنگ کے مقابلے پر کام شروع کر دیا۔ بہرنگ ان دنوں مذکورہ ادارہ میں سٹاف سرجن کی حیثیت سے مامور تھا اور دونوں سیرم کے ذریعے خناق کا بہتر طریق علاج معلوم کرنے میں کوشاں تھے۔ خون کا جو سیرم وہ استعمال کرتے، وہ ان جانوروں سے حاصل کیا جاتا جنھیں پہلے خناق کے زہر یا مادہ کے ٹیکے لگائے جا چکے ہوتے۔ ارلخ کا خیال تھا کہ مریض کے جسم میں زہر دشمن قوت ابھارنے کے لیے اسے بتدریج زہر کے ٹیکے لگائے جانا چاہئیں۔ آخر اس کا یہ خیال درست ثابت ہوا بہرنگ کا نظریہ یہ تھا کہ مریض کی قوت مدافعت کی سطح ان جانوروں کی صحت و قوت پر منحصر ہے جن کے جسموں سے سیرم حاصل کیا جاتا ہے۔ ان متصادم نظریوں کے باوجود بہرنگ اور ارلخ آپس میں گہرے دوست بنے رہے اور بعد کی تحقیقات میں ایک نئے

دوسرے سے پورا پورا تعاون کیا۔ ۱۸۹۸ء میں ارلخ فرینکفرٹ چلا گیا جہاں وہ تجرباتی علاج کے نئے ادارے کا نگران مقرر ہو گیا۔ ۱۹۰۶ء میں وہ ملحقہ "جارج سپیئر ہاؤس فار کیموتھراپی" کا بھی ڈائریکٹر بن گیا۔ ۱۹۰۸ء میں ادویات کا نوبل پرائز اس کو اور ارلخ کو مشترکہ طور پر دیا گیا۔ بہر حال پال ارلخ کیمیائی علاج کے بانی کی حیثیت سے عالمی شہرت رکھتا ہے۔ نوبل انعام حاصل کرنے کے ایک سال بعد اس نے آتشک کے دہشت ناک مرض کی دوا دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس دوا کا نام تھا "سلورسان" جسے اس نے اور ایک جاپانی فزیشن حتا نے مل کر ترتیب دیا تھا جو اب تک کروڑوں افراد کے علاج میں استعمال ہو چکی ہے۔ ارلخ اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے بغیر کسی مداخلت کے پرسکون ماحول میں کام کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ بے شمار اعزاز جو اس کی شہرت کا سبب تھے، اس کے لیے وبال بن گئے۔ وہ اپنے مداحوں کی مبالغہ آرائی اور مخالفوں کی عیب جوئی کی کھینچ تان میں پھنس کر رہ گیا اور اس ہنگامہ خیز ٹکراؤ کی وجہ سے اس کے انتقال کے برسوں بعد تک اس کی کامیابیوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا دشوار ہو گیا۔ خود اس کی زندگی میں اس پر سلورسان کے سلسلے میں حق ایجاد کی خلاف ورزی کے مقدمات قائم کیے گئے اور کہا گیا کہ سنکھیا کا جزو شامل ہونے کی وجہ سے دو خطرناک ثانوی اثرات پیدا کرتی ہے۔ بہر حال نیو سلورسان میں، جسے ارلخ نے سلورسان کی دریافت کے بعد جلد

ہی تیار کر لیا گیا تھا، دوا کی کارکردگی کو کمزور کیے بغیر سنکھیا کی مقدار کم کر دی گئی آخر ۱۹۲۵ء میں یعنی اس کی وفات کے دس سال بعد پیرس میں منعقدہ مخالف جنسی امراض بین الاقوامی یونین نے اس امر کی تصدیق کی کہ بہت سے ممالک میں سلورسان استعمال میں لائی گئی اور آتشک کے مریضوں کی تعداد واضح طور پر کم ہو گئی۔

پال ارلخ نے پہلی جنگِ عظیم کے دوران ۲۰ر اگست 1915ء میں فرینکفرٹ کے نزدیک "ہمبرگ ورڈر ہوہے" کے مقام پر انتقال کیا اُسے اپنے مزار تک ایسے تابوت میں لے جایا گیا جو سدابہار پھولوں اور پتّوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ لندن کے مشہور اخبار ٹائمز نے واقعی اُسے انتہائی حسین اور اثر انگیز الوداعی الفاظ پیش کیے —— حالانکہ اس زمانے میں انگلستان جرمنی سے برسرِ پیکار تھا، یہ اخبار اس کی تعزیت میں لکھتا ہے:

"اس نے علم انسانی کے لیے نئی نئی راہیں کشادہ کی ہیں جن کے لیے اس موقع پر ساری دُنیا اس کی مقروض ہے۔"

(ہرمن۔ ایم۔ اسٹیز)

ایمل فان بیرنگ

(۱۸۵۴ء - ۱۹۱۷ء)

خناق کا معالج

ایمل فان بہرنگ پہلا شخص تھا جسے ۱۹۰۱ء میں ادویات کا نوبل پرائز ملا۔ یہ انعام اسے اس کی ان تحقیقات کے صلے میں دیا گیا تھا جو اس نے خناق کے علاج کے سلسلے میں کی تھیں۔ اس کے باوجود یہ صرف ایک امر اتفاقی تھا کہ وہ اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر بن گیا۔

ایمل فان بہرنگ ۱۵ مارچ ۱۸۵۸ء کو مشرقی جرمنی کے قصبہ ہنیس ڈورف میں پیدا ہوا۔ ایام گرما میں ایک بار فوج نے بہرنگ کے قصبہ کے اطراف تزویری پڑاؤ ڈالا اور رواج کے مطابق فوج کے سارے چھوٹے بڑے افسران بستی کے گھروں میں مہمان ہوئے۔ جو شخص بہرنگ کے گھر ٹھہرا وہ ایک سینیئر اسٹاف ڈاکٹر تھا۔ ایک دن اس نے بہرنگ کے باپ سے اس کے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں بات کی اور اسے مشورہ دیا کہ بہرنگ کو ڈاکٹر بنانا چاہیے اس نے یہ بھی کہا کہ فوج اس کو تربیت دے سکتی ہے۔ بہرنگ کے باپ نے اس مشورہ پر غور کیا اور ڈاکٹر سے کہنے لگا کہ کیا بہرنگ نے خود اس کی خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ ادویات کی تعلیم حاصل کرے۔

ڈاکٹر نے جواب دیا کہ ہاں وہ تیار ہے۔ اس کے بعد جب ڈاکٹر نے پیش کش کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنا اثر استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہائی اسکول کے بعض اخراجات بھی برداشت کرنے کو تیار ہے تو اس کا باپ راضی ہو گیا۔

۱۸۶۶ء میں ایمل فان بہرنگ کو ہوہنس ٹین ہائی سکول میں بھیج دیا گیا جو مشرقی پروشیا میں واقع ہے۔ بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے اس نے وہاں کی تعلیم مکمل کر لی جس کے بعد میں وہ آرمی ڈاکٹر کی تعلیم مکمّل کرنے کی غرض سے برلن کے قیصر ولیم میڈیکل اکیڈمی میں داخل ہو گیا۔

۱۸۷۸ء میں وہ فارغ التحصیل ہو گیا اور مختلف مقامات پر متعدد رجمنٹوں میں ڈاکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کے بعد اسے مشرقی جرمنی کے ایک چھوٹے سے قصبے میں تعینات کر دیا گیا جہاں اسے خناق کی وبا کا تجربہ ہوا۔ اس موقع پر اسے احساس ہوا کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اس مرض کے سامنے وہ بالکل بے بس ہے۔ احساس و تجربہ بلاشبہ ان محرکات میں سے ایک ہے جنھوں نے اسے اس موذی مرض کا علاج دریافت کرنے پر اکسایا۔ ۱۸۸۷ء میں وہ بون کا اسٹاف ڈاکٹر مقرر ہوا جہاں اس نے وہ سائنٹفک مقالہ لکھا جس نے اس کے مستقبل کی تعمیر پر عظیم اثرات ڈالے۔ اس مقالے کا عنوان تھا "چوہوں کے اینتھراکس محفوظ ہو جانے کے اسباب پر"۔ اس مقالے نے تپ دق کے جرثومے کے دریافت کنندہ رابرٹ کوخ کو اس کی طرف متوجہ کر دیا چنانچہ اس

نے بہرنگ کو اپنے نائب کی حیثیت سے کام کرنے کی پیش کش کی جبکہ بہرنگ کی عمر ۳۵ سال تھی۔

اب یہ حقیقت مسلم ہو چکی تھی کہ بیماریاں جرثوموں سے پیدا ہوتی ہیں جو ہر جگہ پائے جا سکتے ہیں۔ متعلقہ مرض کے جرثوموں کی ہلکی خوراکیں مریض میں مزید حملوں سے بچاؤ کی اہلیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اس طرح مریض کم از کم ایک معینہ مدّت تک کے لیے ضرور محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس میدان کے ممتاز معالج رابرٹ کوخ اور فرانسیسی لوئیس پیسچوا رہے ہیں۔ ایمل فان بہرنگ انہیں کے نظریات پر عمل کرتے ہوئے ایک قدم آگے بڑھایا اور خناق پر قابو حاصل کر لیا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے جو جو منزلیں طے کی گئیں وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

۱۸۸۳ء میں جرمن سائنس دان ایڈون کلیبس نے تجویز کیا کہ خناق ایسے جرثومے سے پیدا ہوتا ہے جسے شناخت کرنے میں وہ ناکام رہا ہے دوسرے سال ایک اور جرمن سائنس دان فریڈرک لوئفلر نے اسے دریافت کر لیا اور وقتی طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ جرثومہ ان حالات کا براہ راست ذمہ دار ہوتا ہے جو مریض کو ہلاک کر دیتے ہیں لیکن اس خیال نے سائنس دانوں کو ایک اور اہم مسئلے سے دوچار کر دیا۔ وہ یہ کہ جسم کے دوسرے حصّے کے اعضا اس سے کس طرح متاثر ہو سکتے ہیں جبکہ جرثومے صرف حلق کے محدود حصے ہی میں قابل گرفت رہتے ہیں جہاں وہ ہوا کی نالی میں ایک جھلّی بنا لیتے ہیں۔ یہ جھلّی سانس لینا دشوار کر دیتی ہے اور مریض اکثر دم گھٹنے

سے مر جاتا ہے۔ ان حالات میں غور طلب یہ تھا کہ جرثومے دل اور پھیپھڑوں پر کس طرح حملہ کرتے ہیں؟

۱۸۸۷ء میں فریڈرک لوئفلر نے بغیر کسی ثبوت کے یہ نظریہ قائم کیا کہ جرثوموں میں کسی قسم کا زہر ہوتا ہے جو خون میں شامل ہو جاتا ہے اور اس طرح مریض کو نقصان پہنچاتا ہے۔ آخر ۱۸۸۸ء میں ایک فرانسیسی پیرے روکس اور ایک سوئز الیگزینڈر یرسین نے زہر کو شناخت کر لیا۔ یہی وہ منزل ہے جس میں ایمل فان بہرنگ داخل ہوتا ہے۔

چوہوں کے اینتھراکس کی وبا سے محفوظ رہنے کے سلسلے میں اس کے اپنے مشاہدات اور جبڑوں کے جُڑ جانے کے مرض کی تحقیقات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز خون میں موجود رہتی ہے جو جرثوموں کے اثرات کو بے عمل بنا دیتی ہے مگر سوال یہ تھا کہ اس چیز کو شناخت کیسے کیا جائے؟

بہرنگ نے فرضی مادہ کے عمل کی کیفیات معلوم کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے سات چوہوں کو خناق میں مبتلا کیا۔ اس کے عمل کا طریقہ اس حقیقت کے مقابلے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ چوہے پھر بھی زندہ رہے کیونکہ ان کے خون میں وہ مادہ موجود تھا جس نے مرض کے زہر کو غیر نقصان دہ بنا کر چوہوں کو بچا لیا تھا۔ مزید تجربات نے اسے اس مادہ کی نوعیت کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں جسے اس نے

اینٹی ٹوکسن کا نام دیا یعنی "دشمن زہر۔ اب اس کو یہ فکر ہوئی کہ کوئی ایسا طریقہ معلوم کیا جائے جس سے یہ مادہ بڑی مقدار میں پیدا کیا جا سکے اس سلسلے میں چوہوں کو ذریعہ بنانا بیکار تھا کیونکہ ان کے جسم میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ اتنی مقدار میں خون دے سکتے چنانچہ بہرنگ گھوڑوں پر تجربے کرنے لگا اور خاصی تجرباتی کاوشوں کے بعد اس نے ایک بہترین طریقہ دریافت کر لیا۔

پہلے اس نے خناق کے زہر کی ایک ہلکی مقدار گھوڑوں کے جسم میں انجکشن لگا کر داخل کی۔ نتیجے میں گھوڑے کی مدافعی قوت فی الفور اس سے بر سر پیکار ہو گئی اور خون میں "دشمن زہر" مادہ پیدا کرنے لگی جو اس کی زندگی کو بچا سکتی۔ ایک ہفتہ سے زیادہ مدّت تک بتدریج زہر کی خوراکیں گھوڑے کے جسم کے اندر داخل کرتے رہنے سے اس کے جسمانی نظام میں زائد سے زائد مقدار میں دشمن زہر مادہ پیدا ہوتا رہا جس کے بعد بہرنگ نے سلسلہ ختم کر کے گھوڑے کے جسم سے کچھ خون نکال لیا اور یہ نکالا ہوا خون سیرم میں تبدیل کر لیا۔

جب یہ دونوں مسائل حل ہو گئے تو بہرنگ اپنے سیرم کو لوگوں پر استعمال کرنے کے لیے بالکل تیاّر تھا جس کو اس نے صرف علمی دلچسپی کی خاطر نہیں بنایا تھا بلکہ اس نظریے سے بنایا تھا کہ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اسے مریضوں کے علاج میں استعمال کر کے اپنے فرائض کو پورا کر سکے۔ دسمبر ۱۸۹۱ء میں اس نے اس خون کو برلن اسپتال کے بچّوں

کے وارڈ میں استعمال کرنے کی اجازت حاصل کر لی مگر اسے صرف ان مریضوں پر تجربہ کرنے کی اجازت دی گئی جن کی حالت مایوس کن قرار دی جا چکی تھی۔ چھہتّر بچے اپنے بستروں پر سسک رہے تھے بھرنگ نے ان میں سے انسٹھ بچوں کو صحت یاب کر کے ان کے سرپرستوں کے پاس بھیج دیا مگر سارے بچے بچ نہ سکے۔ یہ حقیقت اس بات کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ علاج امکانی طور پر جلد سے جلد شروع کیا جانا چاہیے تھا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بہترین طریقہ اب تک دریافت نہیں کیا جا سکا تھا۔

بھرنگ ان ایّام میں پیرس کے ممتاز ڈاکٹر پیرے روکس سے ہر طرح تعاون کرتا رہا تھا چنانچہ ۱۸۹۴ء میں روکس نے اپنے اسپتال کے بچّوں میں یہ سیرم استعمال کیا جس سے اسپتال کے انتہائی شدید مریضوں کی شرح اموات ۵۱ فیصد سے گھٹ کر ۲۴ فیصد تک آگئی اور اس کے بعد گرتی چلی گئی۔ اسی سال روکس نے بوڈاپسٹ کی بین الاقوامی ادویاتی کانگرس میں اپنی کامیابی کا اعلان کیا جس کے فوراً ہی بعد اسے فرانس میں اس علاج کا موجد قرار دے دیا گیا حالانکہ وہ ہمیشہ پر زور الفاظ میں اس حقیقت کا اظہار کرتا رہا کہ یہ کارنامہ بھرنگ کا ہے۔ آخر دونوں ہی افراد کو جرمن اور فرانس کی حکومتوں کی جانب سے اعزازات دیے گئے۔ دونوں ممالک کے لوگ سیرم بنانے اور اسے علاج کے لیے تقسیم کرنے کی خاطر چندہ کر کے رقمیں جمع کرنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے چہار جانب بہرنگ کی شہرت ہوگئی مگر طنز یہ جرائد میں وہ ان لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بھی بنتا رہا جو اس کے علاج کی اثر انگیزی پر اعتقاد نہ رکھتے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں ہالے یونیورسٹی کے شعبہ جراثومات میں اس کا تقرر ہو گیا جس کے دوسرے سال اسے ماربرگ یونیورسٹی کی پروفیسری مل گئی جہاں وہ آخر وقت تک خدمت انجام دیتا رہا۔ ۱۹۰۱ء میں اسے نائٹ بنا دیا گیا اور اسے اپنے خاندانی نام کے ساتھ لفظ فان استعمال کرنے کا مستحق قرار دے دیا گیا۔ اسی سال جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اسے ادویات کا نوبل انعام بھی حاصل ہوا۔ کوخ کی طرح اس نے بھی تپ دق کا علاج دریافت کرنے کی کوشش کی لیکن بودو ویکسین کے علاوہ جو مویشیوں میں عارضی تحفظ پیدا کرنے کی افادیت رکھتی تھی اور جس سے شروع میں بڑی امیدیں وابستہ کی گئی تھیں، وہ دیرپا معیار کی کوئی دوا بنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

۱۸ اپریل ۱۹۱۳ء کو جرمنی میں ویزبیڈن کے مقام پر داخلی ادویات کی کانگریس منعقد ہوئی جس میں اس نے ایک اہم اعلان کیا کہ اس نے ایک ایسا انجکشن تیار کر لیا ہے جو خناق میں دیرپا تحفظ پیدا کر سکتا ہے۔

اس کے بعد سے اس کے انجکشن کو زہر کے مضر اثرات دُور کر کے زیادہ سے زیادہ بہتر بنایا جاتا رہا کیونکہ مریض کے جسم میں مطلوبہ دفاعی ردّعمل پیدا کرنا بھی خطرناک تھا۔ بہر حال دنیا کے بیشتر حصوں میں حفظ ما تقدم کی تدابیر صد فیصد کامیاب رہیں۔ جس سے خناق کی دہشت انگیزی ماند پڑ گئی۔

ایمل فان بہرنگ نے کیا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جرمنی میں ۱۴۷۳ افراد خناق میں مبتلا ہوئے جن میں سے کل ۵۵ کی موت واقع ہوئی جبکہ ۱۸۹۰ء میں چالیس ہزار افراد اس موذی مرض سے موت کا شکار ہوئے تھے۔ ۱۹۱۷ء میں ایمل فان بہرنگ نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

(جیریمی لین)

ہنرخ ہرٹز

(۱۸۵۷ء - ۱۸۹۴ء) برقاطیسی لہروں کا محقق

آج مواصلاتی سیارے مدار پر بھیجے جا رہے ہیں۔ بازار ٹرانسسٹروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلیویژن جیسی چیزیں دنیا میں عام ہو چکی ہیں۔ یہ سب کچھ دراصل انسانی ترقی کی علامت ہے اور اس کا سہرا جس نے اس ترقی کو ممکن بنانے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ جواں سال ہنرخ ہرٹز تھا جس نے پہلی بار برقاطیسی لہروں کے وجود کا مظاہرہ کیا۔

اس کے اس کارنامے سے پہلے اس میدان میں خاصی پیش قدمی کی جا چکی تھی۔ مثال کے طور پر "جیمز کلارسک میکسول" نے کیمبرج میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ برقاطیسی لہریں وجود رکھتی ہیں۔ اس نے اپنے اس نظریے کو حسابی طور پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ صرف ہرٹز ہی تھا جس نے فیصلہ کن قدم اٹھا کر قدم اٹھا کر اس بات کا اعلان کیا کہ برقاطیسی لہریں یقیناً موجود ہیں اور ایک متعینہ نظام سے کام کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ان لہروں کے استعمال پر بھی قابو پالیا۔

ہنرخ ہرٹز ۱۸۵۷ء میں ہیمبرگ میں پیدا ہوا جہاں اس کا باپ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اسکول کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی وہ طبعی سائنس اور ٹکنالوجی کے سلسلے میں قابلِ ذکر صلاحیت کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ وہ ایک غیر معمولی قوتِ حافظہ کا مالک تھا اور صرف سائنس ہی سے دلچسپی نہ رکھتا بلکہ فنونِ عالیہ کے مطالعے سے بھی اسے شغف تھا اور فرصت کے اوقات سنسکرت اور عربی جیسی زبانیں بھی سیکھتا تھا۔ ۱۸۷۵ء میں جب وہ سکول سے فارغ التحصیل ہوا تو یہ طے نہ کر سکا کہ اسے کیا بننا چاہیئے۔ کیونکہ اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ایک سائنس دان بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آخر اس نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسے انجینئرنگ سے بھی برابر کی دلچسپی تھی کہ اس میں وہ اپنا مستقبل بنا سکے گا۔ انجینئرنگ کی تکمیل کے بعد وہ فرینکفرٹ چلا گیا جہاں اس نے دریائے مین پر تعمیر ہونے والے ایک پُل پر معاون کی حیثیت سے کام کیا۔ لیکن اس کام نے اسے پوری طرح مطمئن نہیں کیا چنانچہ آخر میں اس نے میونخ یونیورسٹی کے شعبۂ طبیعی سائنس میں داخلہ لے لیا۔ اکتوبر ۱۸۷۸ء میں وہ برلن آ گیا خاص طور پر اس لیے کہ وہ عظیم ماہر طبیعات ہرمن ہیلموٹز کے زیر ہدایت کام کر سکے جس کی تحقیقات "مبدار الحرکت کی استقامت" کے سلسلے میں ۱۸۵۰ء سے پہلے ہی سائنس کی عظیم پیشقدمیوں میں شمار ہوتی تھیں۔

ہرٹز جب برلن یونیورسٹی پہنچا تو اس نے تختۂ سیاہ پر ایک نوٹس لکھا ہوا دیکھا جس میں ایک ایسے انعام کی تفصیلات درج تھیں جو متحرک برقی رو کی بے اختیاری پر کام کے سلسلے میں مقرر کیا گیا تھا اس نوٹس کو دیکھتے ہی اس نے اپنی سی کرنے اور انعام جیتنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیلمہولٹز نے اس کے عزم و عمل سے دلچسپی لی اور جب ہرٹز نے انعام جیت لیا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ہرٹز پر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے اپنے ایک خط میں بعض مربیوں کو جن سے اس کے انتہائی قریبی تعلقات تھے لکھا کہ اُس نے محض انعام ہی نہیں جیتا ہے بلکہ اس جیت پر اس کے سربراہ نے جس پرجوش انداز میں اس کی ستائش کی ہے، اس سے اپنی کامیابی اس کی نگاہ میں دُگنی ہو گئی ہے۔

مارچ ۱۸۸۰ء میں مقناطیسی خطے میں چکر لگانے والے دھات کے ذرّوں کی رفتار پر تحقیقات کے نتیجے میں اسے امتیازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ اسی سال وہ ہیلموٹز کا نائب بھی مقرر ہو گیا۔

تین سال بعد نظریاتی طبیعیات کی تعلیم دینے کے لیے وہ کیل یونیورسٹی چلا گیا ——— جہاں اس نے موسمیات کا مطالعہ کیا اور ساتھ ہی ساتھ برقی حرکیات پر بھی تحقیق کا آغاز کیا۔ یہ تحقیق اس کی موت تک برابر جاری رہی۔

ہرٹز کیل یونیورسٹی میں رہنے کو زیادہ پسند نہ کرتا تھا کیونکہ وہاں معلّمی کے فرائض ادا کرنے کے بعد اس کے پاس کسی تحقیقاتی کام کے لیے

بہت کم وقت بچتا تھا۔ اسی سبب سے اس نے ۱۸۸۵ء کے موسم بہار میں بڑی خوشی کے ساتھ کارلسروہی پولی ٹکنیک میں ایک اسامی قبول کرلی۔ یہیں اس نے بڑے انہماک سے برقاطیسی لہروں کے مطالعے کا وہ کام شروع کیا جس نے اس کے نام کو شہرت دی۔

اس کا تجرباتی سازوسامان سادہ ترین قسم کا تھا۔ آج کل کے لحاظ سے اسے ناقص کہا جا سکتا ہے لیکن وہ انھی چیزوں کی مدد سے لہروں کو ایک کمرہ سے تقریباً ۱۵ میٹر کے فاصلے تک بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اعلان کیا کہ لہریں روشنی کی رفتار سے سفر کرتی ہیں، جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا تھا۔ ہرٹز ان لہروں کو اپنی مرضی سے حرکت میں لا سکتا تھا۔ تجربات نے اسے اس بات کا بھی موقع فراہم کیا کہ وہ لہر کی پیمائش کر سکے۔

بادی النظر میں یہ معمولی دریافت تھی مگر اس سے ایک مدّت کے بعد میکس پلانک نے کہا کہ اس سے نہ صرف میکسول کا حسابی دعویٰ سچ ثابت ہوگیا۔ بلکہ تجرباتی اور نظریاتی طبعیات کے ایک نئے دور کا آغاز بھی ہوگیا۔ خود ہرٹز نے کہا۔" اب ہم ان ہزاروں مقامات پر بھی رو کا وجود ثابت کر سکتے ہیں جہاں اس کے موجد ہونے کے بارے میں پہلے ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ اب ہم ہر شعلے اور ہر ذرّے میں برقی عمل دیکھتے ہیں، نیز ایسی چیزیں بھی جو چمکدار نہ ہوں۔

اس کامیاب تجربے کے بعد ہی اس نے اپنی توجہ روشنی اور

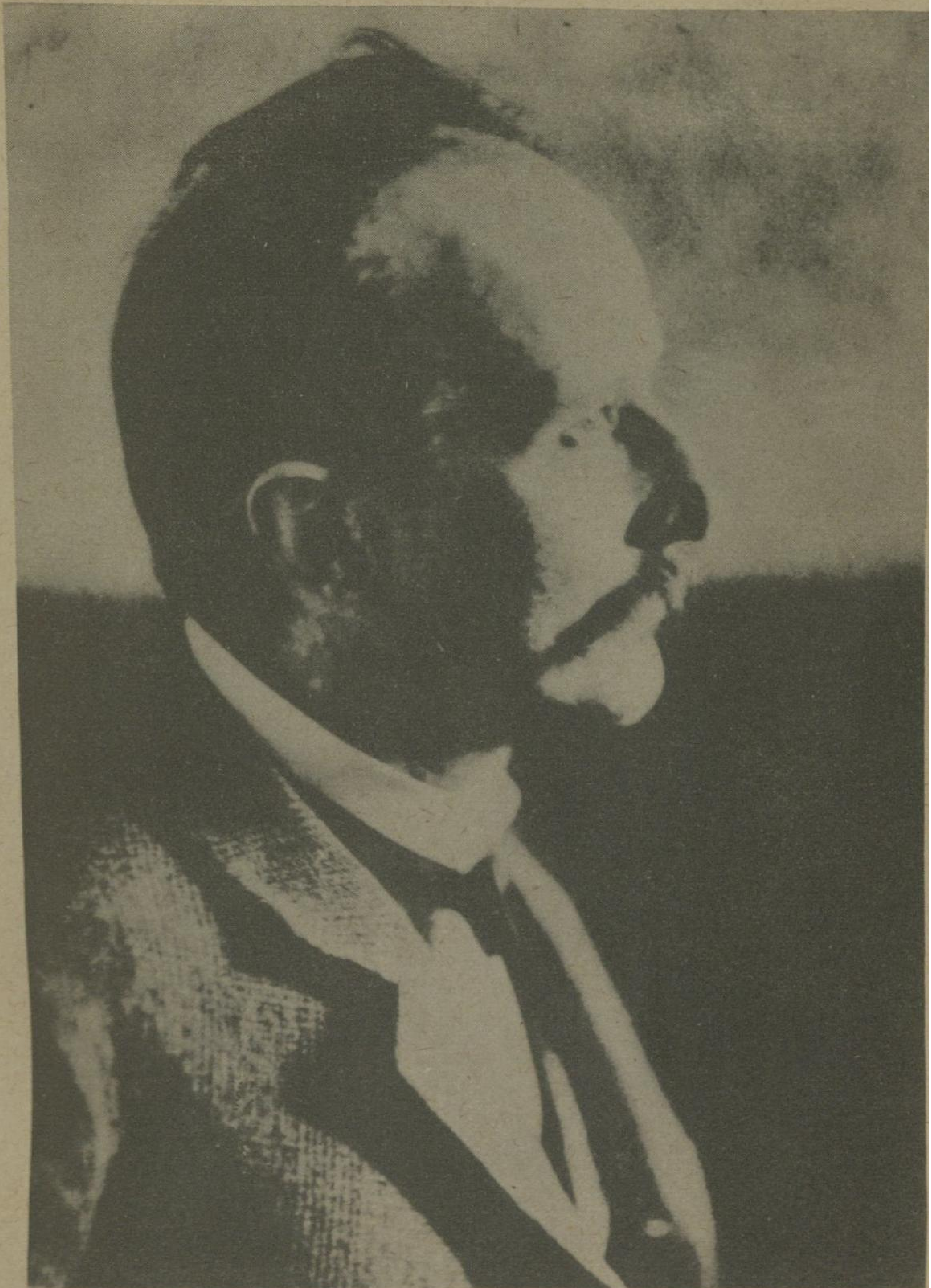
منفی شعاعوں کے تعلق کی جانب منعطف کردی۔ یہ بات ان دنوں قطعی طور پر ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ منفی شعاعیں دریافت کرنے میں اس سے ذرا سی چوک ہو گئی ورنہ ان کی دریافت بھی اسی کا کارنامہ ہوتی۔ اس کی موت کے دو ہی سال بعد رونگٹن نے اعلان کیا کہ اس نے انھیں دریافت کر لیا ہے۔ ہرٹز کا کام یقیناً آگے چل کر میکس پلانک اور البرٹ آئنسٹائن کی موجودہ صدی کی دریافتوں کو ممکن بنانے میں معاون ثابت ہوا۔

اس کی دریافت سے وائرلیس کی ایجاد تک کا درمیانی وقفہ پہلے کے مقابلے میں مختصر تر تھا۔ بہرحال ہرٹز بعد میں میکانکی الجھنوں میں پھنس کر رہ گیا اور اپنی دریافت پر ابتدائی تجربات دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا۔ ۱۸۹۲ء میں اس کی صحت، جو اب تک بہت شاندار رہی تھی، تیزی سے گرنے لگی، ڈاکٹروں نے اسے بون یونیورسٹی کی پروفیسری کی مصروفیات ترک کر کے آرام کا مشورہ دیا جس پر وہ ۱۸۸۹ء سے فائز تھا۔ اسی سلسلے میں اس کا ایک آپریشن بھی کیا گیا لیکن اس کا سارا جسم کسی زہریلے مادّے "ورم" کا شکار ہو چکا تھا آخر وہ ۳۷ سال کی عمر میں یکم جنوری ۱۸۹۴ء کو فوت ہو گیا۔

اسی سال ایک اطالوی سائنس دان مارکونی نے قلیل تر فاصلے کا پہلا تجربہ کیا۔ دوسرے سال وہ اس فاصلے کو تقریباً ڈیڑھ میل تک بڑھانے میں کامیاب ہو گیا اور بالآخر ۱۸۹۷ء میں وہ ایک اشاراتی سگنل

برطانیہ کی ۹ میل چوڑی خلیج برسٹل کے اس پار ترسیل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کارلسروہی پولی ٹیکنیک کے سربراہ نے ہنرخ ہرٹز کی صد سالہ برسی کے موقع پر کہا ہے۔" یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس نے (ہنرخ ہرٹز) ان محیر العقول ترقیوں کا تصور نہ کیا ہو جو اس کی دریافت برقاطیسی لہروں کو پیش کرنے کے سبب معرض وجود میں آئی ہیں۔ بہرحال ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان میں اس کا گرانقدر حصہ ہے"! ہرٹز کا نام وائرلیس کے میزانون پر ایک فاصلے کی حیثیت سے بھی زندہ ہے۔ میگا سائیکل کے ایک حصے کے لیے میگا ہرٹز کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔

(گنتھر بونٹے)



میکس پلانک
برقیاتی مقداروں کے نظریے کا بانی

میکس پلانک

(۱۸۵۸ء - ۱۹۴۷ء)   برقیاتی مقداروں کے نظریے کا بانی

میکس پلانک ایٹمی عہد کے اسلاف میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا برقیاتی مقداروں کا نظریہ ۱۹۰۰ء میں منظرِ عام پر آیا اور اس نادر قوّت کے لیے ایک نسخہ مہیا کرنے کا موجب ہوا جو توانائی کے اخراج کے دوران، خاص طور سے تخلیق حرارت کی شکل میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ یہ نظریہ ماضی کے سابقہ نظریوں سے نمایاں طور پر مختلف تھا۔ اس سے پیشتر یہ سمجھا جاتا تھا کہ توانائی لہروں کی صورت میں حرکت میں پیدا ہوتی ہے یعنی سابقہ نظریہ کے مطابق توانائی کی حرکت میں کوئی کمی یا زیادتی پرسکون روانی کی طرح عمل میں نہیں آتی۔

یہ خیال کہ توانائی قلیل ترین اقدار میں منقسم ہوتی ہے، صوری طور پر پیش کرنا ذرا مشکل ہے اس لیے اس نظریے کو صرف حسابی طریقے پر ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ ایک بٹا دس کھرب سنکھ کی قیمت کا ہوتا ہے۔ غیر سائنس دانوں کے لیے اس مقدار کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

میکس پلانک کا توانائی کے اخراج (EMISSION OF ENERGY)

کا نظریہ ہی عہد حاضر کی ایٹمی تحقیقات کی کلید ہے۔ اس نظریۂ مقدار کی اشاعت کے پانچ سال بعد آئنسٹائن نے اسے روشنی کے اخراج کے نظریے پر منطبق کیا۔ ۱۹۱۳ء میں ڈنمارک کے شہرت یافتہ سائنسدان اور ایٹمی تحقیق کنندہ نائلس بوہر نے پلانکس کے کام کی بنیاد ہی پر جوہر کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ اسی طرح ۱۹۲۶ء میں میکس بورن اور ورنر ہیزنبرگ کی کامیابیاں بھی اسی کے خیال کی رہین منت ہیں۔ غرض کہ پلانکس کے انکشافات سے ساری دنیا کے سائنس دانوں کے لیے نئی زمینیں مسخر کرنے کے دروازے کھل گئے۔

میکس پلانک نے خاصی طویل زندگی پائی۔ ۱۸۵۸ء میں وہ شمالی جرمنی کے شہر کیل میں پیدا ہوا تھا اور ایک قانون کے پروفیسر کا بیٹا تھا وہ پورے نوّے (۹۰) سال بعد گوٹنجن میں ۱۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو فوت ہوا اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک پوری سرگرمی سائنسی تحقیقات میں مصروف رہا۔

میکس پلانک نے امتداد زمانہ کے بہت سے ادوار دیکھے اور ذاتی طور پر ان ادوار کے تغیرات سے متاثر بھی ہوا۔ اس کا ایک بیٹا پہلی جنگِ عظیم میں مارا گیا۔ نیشنل سوشلسٹوں (نازیوں) کے مخالف کی حیثیت سے وہ ان پروفیسروں کا حامی تھا جنھیں نازیوں نے اپنی متعصبانہ تادیبی کارروائیوں کا نشانہ بنایا تھا اور جس کے نتیجے میں اس کا دوسرا بیٹا دوسری جنگِ عظیم کے آخری دنوں میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا کیونکہ اس نے اس

سازش میں حصہ لیا تھا جو ۲۰ جولائی ۴۴ ۱۹ء کو ہٹلر کے قتل کے لیے کی گئی تھی۔ نازی حکومت نے میکس پلانک کو پیش کش کی تھی کہ اگر وہ ہٹلر کے محضر وفاداری پر دستخط کر دے تو اس کے بیٹے کی جاں بخشی کی جا سکتی ہے لیکن اس نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ پیش کش ٹھکرا دی۔

میکس پلانک نے انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں کے دوران اپنے مستقبل کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔ ایک عرصہ تک وہ دو پیشوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے تذبذب میں رہا جن میں ایک موسیقار کا پیشہ تھا، دوسرا طبیعی سائنس دان کا۔ آخر اس نے سائنس دان بننے کا فیصلہ کیا پھر بھی موسیقی کی محبت کو خیر باد نہیں کہا اور در اصل ان دونوں میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔ کتنے ہی لوگوں کے نزدیک موسیقی اس حساب کے سوا کوئی حقیقت بھی نہیں رکھتی جو لہجے اور لے کی صورت میں آواز کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔ میکس پلانک بھی حسابی طبیعی سائنسوں سے متاثر تھا جنھیں موجودہ اصطلاح میں نظریاتی طبیعیات کہا جاتا ہے۔

اس نے میونخ اور برلن میں جی آد کیسرخ ہوف اور فان ہلموٹز کی شاگردی میں یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۷۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور اس عہد میں کام کا آغاز کیا۔ جب علم طبیعیات مکمل طور پر تجرباتی بن چکا تھا۔ چونکہ اس کا رجحان حسابی اور نظریاتی طبیعیات کے میدان کی طرف تھا اس لیے ایسے ماحول میں اس کا غلط فہمیوں کے

کتنے ہی چکروں سے دوچار ہونا لازمی تھا۔ پھر بھی اس نے اپنا راستہ چھوڑ کر کسی اور طرف مڑنے سے انکار کر دیا۔ جس زمانے میں وہ ماحول پر حاوی رجحانات کے خلاف جد وجہد میں لگا ہوا تھا، خوش قسمتی سے اسی زمانے میں اسے کیرخ ہوف کے جانشین کی حیثیت سے برلن یونیورسٹی میں پروفیسری کا عہدہ مل گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۳۰ سال تھی۔ اس سے پیشتر ۸۵۔۱۸۸۰ء تک وہ میونخ میں اور اس کے بعد ۱۸۸۹ء تک کیل میں نظریاتی طبیعیات کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے بھی کام کر چکا تھا۔ بہرحال یہ برلن ہی تھا جہاں اس نے اپنی زندگی کے سائنسی کارناموں کو جمع کرنے کا آغاز کیا اور اپنے انقلاب آفریں نظریۂ مقدار کو جنم دیا برلن ہی سے اس کی دریافت سائنسی دنیا میں مشتہر کی گئی اور میکس پلانک اس سے بہتر پلیٹ فارم کی توقع بھی نہ کر سکتا تھا۔

جرمنی کا دارالحکومت برلن اس وقت مختلف میدانوں میں سائنسی تحقیقات کے مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور کتنی ہی عالمی شہرت یافتہ انجمنوں کا گہوارہ تھا۔

۱۹۱۲ء میں میکس پلانک کو پرشین اکیڈمی آف سائنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسی سلسلے میں اس نے امریکہ اور فرانس کا دورہ کیا اور وہاں کے سائنس دانوں سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ۱۹۱۸ء میں اسے نوبل پرائز دیا گیا۔ اسی وقت اس کے نظریۂ مقدار کی سائنسی صداقت بین الاقوامی طور پر تسلیم کی جانے لگی اور دنیا کے سارے ترقی یافتہ ممالک کے محققین اور

سائنسی ادارے جوہر کی پوشیدہ حقیقتوں کا سراغ لگانے میں مصروف ہو گئے۔

۱۹۲۶ء میں اسے شاہی سوسائٹی لندن کا غیر ملکی ممبر منتخب کیا گیا اور ۱۹۲۸ء میں اس کو اسی ادارے کا کوپلے میڈل دیا گیا۔

اس عرصے میں اس نے اپنے اس دور کے تمام عظیم سائنس دانوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ مادام کیورے، رتھر فورڈ، بوہر، مارکونی، فرمی ایڈنگٹن اور ہان سے خاص طور پر اس کے قریبی تعلقات تھے۔ یہ حقیقت اس وقت تک کسی طرح واضح نہ تھی کہ جوہر کے رازوں کا انکشاف جادو کے صندوق کا ڈھکنا کھول دینے کے مترادف ہوگا۔ سائنس دان دلائل پر سختی کے ساتھ اعتقاد رکھتے ہیں۔ میکس پلانک بھی اسی کا قائل تھا۔ جب وہ برلن یونیورسٹی کا سربراہ تھا تو اس نے اپنی ایک تقریر میں اسی رجحان کا اظہار کیا تھا:

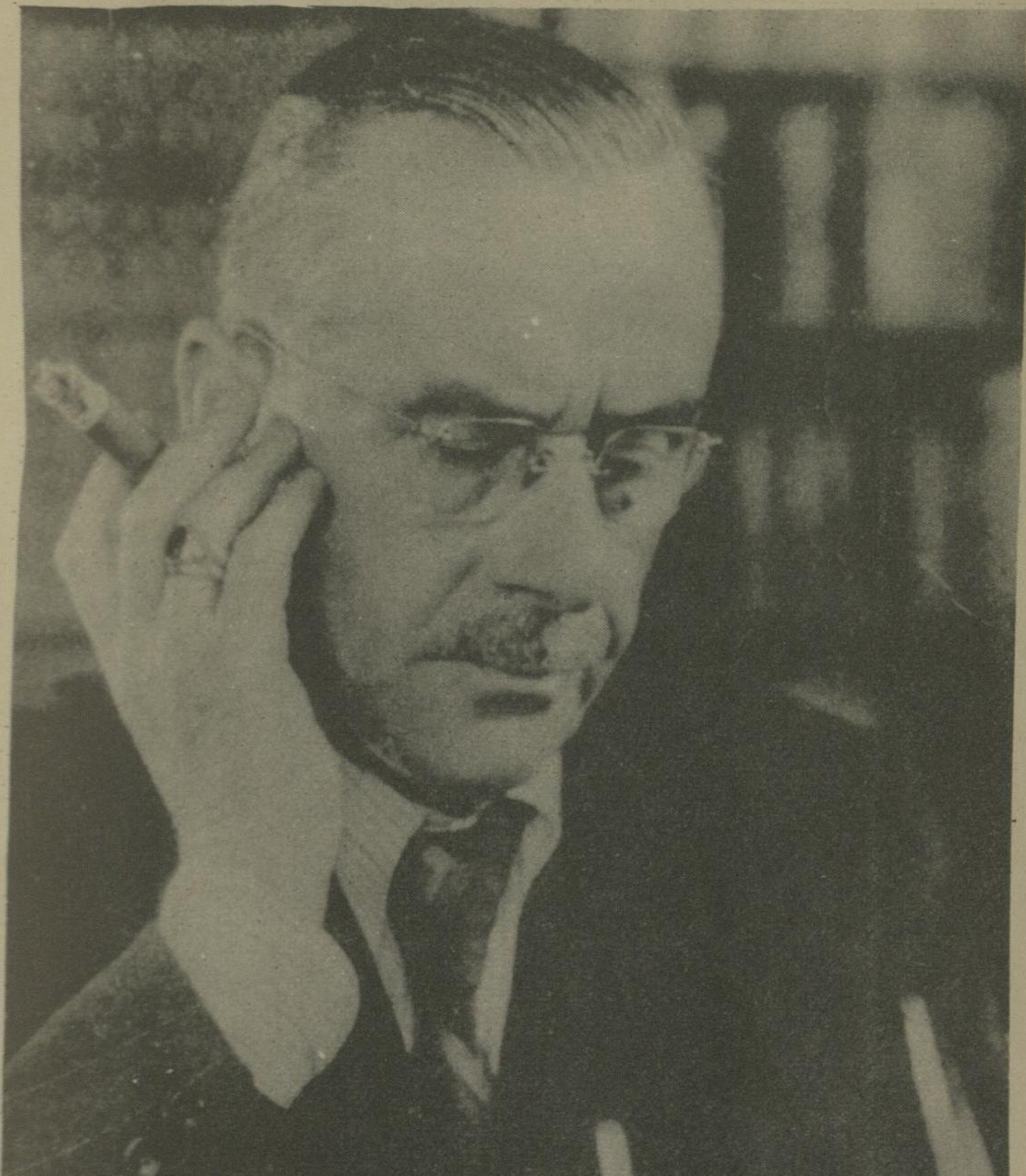
"حق آگہی اور وفاداری۔ یہ ہیں وہ اصول جنھوں نے ہماری یونیورسٹی کو اس عظمت تک پہنچایا ہے —— انھیں ہمیشہ ہمیشہ طلبا اور اساتذہ کی رہنمائی کے مینار پر روشن رہنا چاہیے —— بصیرت نگاہ، جسے تحقیقاتی کارکن وقتی طور پر نظر انداز یا مسترد کر دیتے ہیں، مستقبل میں اسے خریدنے کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

میکس پلانک کو اس کے بعد جو دوسرا منصب دیا گیا وہ قیصر ولیم سوسائٹی برائے ترقی سائنس کی صدارت کا تھا۔ ۱۹۳۰-۳۵ء کے

دوران اس نے اس ادارے کے ذریعے جرمنی میں سائنس پر بڑے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں اور اس کے بعد ہی ۷۹ سال کی عمر میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گیا۔

قیصر ولیم سوسائٹی کا نام کافی عرصے سے تبدیل ہو چکا ہے۔ اب اسے میکس پلانک سوسائٹی کہا جاتا ہے اور یہ جرمنی کا سب سے بڑا سائنسی ادارہ ہے جس میں بکثرت خصوصی ذیلی ادارے شامل ہیں۔ اس کا تعارف نامکمل رہ جائے گا اگر اس کے رجحان کا ذکر نہ کیا جائے جب کہ خود اس نے اپنے الفاظ میں اسرار کائنات کے پردے اٹھائے ہیں۔ وہ لکھتا ہے "طبیعی سائنس دان اپنی تحقیقات کے دوران نظام کائنات کے غیبی رازوں کے زیادہ سے زیادہ قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر سائنس اور مذہب دونوں اپنی نجات یا اثباتی جواز کے لیے خدا پر عقیدہ کی ضرورت محسوس کریں تو خدا ان میں سے ایک کی فکر کے شروع میں موجود ہوگا اور دوسرے کی فکر کے آخر میں۔ ایک کے لیے وہ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے تو دوسرے کے نزدیک ایسے تاج کی جو ہر طرح کی فکری کاوش کے زیب سر ہے"

(ڈاکٹر۔ اے۔ ڈبلیو۔ پوسٹ)



ٹامس مان

ادیب اور ناول نگار

ٹامس مان

ادیب اور ناول نگار (۱۸۷۵ء-۱۹۵۵ء)

"اس کی آنکھیں نیلی یا بھوری نیلی تھیں۔ لیکن جب وہ اپنے اندر کی حقیقت سے باخبر ہوگیا تو وہ سیاہ اور تابناک ہوگئیں جیسے کوئی چیز ان کی گہرائیوں میں جل رہی ہو اور شعلوں کی صورت باہر لپک پڑنے کے لیے بے تاب ہو۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو اس کے نقاد دوست اور معاشرتی علوم کے ماہر تھیوڈورے اڈونوزنے ایک بار ٹامس مان کے بارے میں لکھے تھے ——— ٹامس مان ۱۸۷۵ء میں بحیرۂ بالٹک کے ساحلی علاقہ لیوبک کے قصبہ ہینا قدیم میں پیدا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں وہ بالکل جنوبی جرمن ہی کا قدیم النسل باشندہ لگتا تھا، بڑا متین اور محتاط لیکن فی الواقعہ یہ محض دکھاوا تھا اور پوری توجہ کے ساتھ اپنایا ہوا ایک نمائشی انداز تھا جس کا مقصد فطرت کے اس پہلو کو چھپانا تھا جو اسے اپنی برازیلی ماں سے وراثت میں ملا تھا اور ان دونوں پہلوؤں کا رنگ اس کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ٹامس مان کا باپ ایک تاجر تھا جس کا خاندان انیسویں صدی کے

اواخر میں متوسط طبقہ کے خوش حال اور معزز و مستحکم گھرانے کی روایات کے مطابق زندگی گزار رہا تھا۔ ٹامس مان کا باپ قومیت پرستی کے اس رجحان کے ناقدین میں سے تھا جو ان دنوں جرمنی میں زیرِ بحث اور زیرِ عمل تھا لیکن جب ٹامس مان کے باپ کا انتقال ہوگیا تو اس کے گھرانے کا استحکام جاتا رہا۔ فرم ختم ہوگئی اور اہلِ خاندان میونخ منتقل ہوگئے جہاں فن کارانہ طبع کو زیادہ ثمر آور زمینیں ملیں چنانچہ ٹامس مان نے خود کہا ہے "لیوبک جرمنی کا بہت دور دراز گوشہ تھا۔"

میونخ میں اس نے ایک عرصے تک ٹیکنیکل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ایک جریدے میں لکھتا رہا جو اس کا بھائی ہینرخ نکالتا تھا۔ اس کے بعد دو سال کے لیے وہ اس کے ساتھ اٹلی چلا گیا جہاں اس نے اپنا ناول "بڈن بروکس" لکھتا رہا جو اس وقت بھی جاری رہا جب وہ "سمپلی زسی مس" میں کام کرنے کے لیے اٹلی سے واپس ہوا۔ یہ جریدہ جرمنی کے مزاحیہ جرائد میں بہت مقبول اور ولولہ انگیز تھا جس کے قارئین نے جلد ہی اس کے قلم کی چبھن کا اندازہ کیا۔ "بڈن بروکس" ۱۹۰۱ء میں منظرِ عام پر آیا جو لیوبک کے ایک خاندان کی تین نسلوں کے تدریجی زوال کی کہانی ہے۔ مان نے اس بات کو پوشیدہ نہیں رکھا کہ اس کی بنیاد خود اس کا اپنا خاندان تھا۔ یہ ناول ایک اعلیٰ طنزیہ تخلیق ہے۔ کرداروں میں سے صرف ایک، جو زندہ رہنے کی خواہش رکھتا ہے، فراست کے لحاظ سے قطعی غیر دلچسپ اور خوابوں میں گم رہنے والا کردار ہے، جس کے روپ میں مان کسی حد تک خود اپنے

آپ کو پیش کرتا ہے اور جو موسیقی، اور مصوری کا گرویدہ ہو کر ایک طرح کے ذہنی احساس برتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ زوال کا وہ درجہ ہے جو ہر طرح کی اختراعی صلاحیت کو کچل دیتا ہے۔

اس طرح ایک سرد مزاج شمالی تاجر کے ذہن اور ایک فن کار کے رجحانات کا تضاد سامنے آجاتا ہے۔ مان کو ساری زندگی اسی رجحان سے دلچسپی رہی کیونکہ وہ اس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ ایک فن کار تھا جو متوسط طبقے کی خود اعتمادی بحال کرنے کی تمنا رکھتا تھا۔ مان اپنے ایک افسانے ٹونیو کروجر میں لکھتا ہے۔ "میں کبھی یہ بات سمجھنے کے قابل نہ ہو سکوں گا کہ کس طرح ایک آدمی جاگیردار اور اعلیٰ طبقے کے لوگوں کو نمونۂ کمال ہونے کا اعزاز دے سکتا ہے۔" آگے چل کر وہ مزید لکھتا ہے "وہ فن کار نہیں ہے جس کا حتمی اور گہرا تصور دقیقہ سنجی کا احاطہ کرتا ہے، وہ منحرف المرکز اور شیطان صفت ہے۔ جو رہن سہن کی سادگی، بے غرض دوستی، عبادت، میل ملاقات اور انسانی خوشی کی تمنّا کا احساس نہیں رکھتا، بلاشبہ ان خاص موضوعات میں سے ایک موضوع ہے جس پر مان نے کام کیا ہے۔

مان نے اپنی ایک دوسری کتاب "وینس میں موت" میں ایک دوسرا موضوع پیش کیا ہے، وہ ہے ایک قسم کی یکسانیت کی تلاش —— گستاف فان ایشن باخ نامی ایک ادیب ہے جو اس بات کو مشکل سے مشکل تر پاتا ہے کہ اس جنگ میں کامیابی حاصل کرلے جو بڑھتی ہوئی تکان

نے اس کے خلاف چھیڑ رکھی ہے، وہ نہیں چاہتا کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے اس میں اس کی ماندگی کی جھلک آجائے۔ وینس کے دوران قیام جہاں وہ آرام کی تلاش میں گیا تھا، اسے ایک پولستانی لڑکے سے محبت ہو جاتی ہے جو وہاں چھٹیاں گزارنے آیا ہوا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس لڑکے کے جسم اور رُوح میں ادیب کو وہ مطلوبہ یکسانیت محسوس ہوتی ہے جس کی اسے مدّت سے جستجو تھی۔ انجام کار اس نے خود کو اس لڑکے کے عشق میں اتنا محو کر دیا کہ وہ اپنے اندر یہ جرأت پیدا کرنے میں ناکام رہا کہ وہ شہر کو چھوڑ دے جو ایک پر اسرار وبائی بیماری کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہو کر مر جاتا ہے مگر وہ تنہا رہتا ہے کیونکہ اس نے خود اپنے وجود میں یکسانیت نہیں پائی تھی بلکہ ایک دوسرے کے جسم میں پائی تھی۔ مضمون بہت اعلیٰ ہے لیکن ٹامس مان اپنی طنز سے اس کے بارے میں شبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی آخر کی دو سطریں ملاحظہ ہوں۔ "بے چارہ ادیب"، اپنے کمرہ میں لے جایا گیا اور باعزّت طور پر دہشت زدہ دنیا کو اسی دن اس کی موت کی خبر مل گئی۔"

یہی طنز یہ انداز اس وقت بھی سامنے آتا ہے جب وہ اپنی یہودی بیوی کاٹجا کا ذکر کرتا ہے جس سے اس نے ۱۹۰۵ء میں شادی کی تھی۔ وہ لکھتا ہے "میرے پاس ایک انتہائی خوب صورت اور جوان بیوی ہے۔ اگر میری بات کا یقین کیا جا سکے تو وہ عورتوں میں شہزادی ہے۔ اس کا باپ ایک شاہی یونیورسٹی کا پروفیسر ہے جس نے میری بیوی کی خاطر میری

طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس کیے بغیر اسکول کا آخری امتحان دے لیا۔ مان نے اپنے اسکول کا آخری امتحان پاس نہیں کیا تھا۔ شادی کے بعد اس کی بیوی کاٹجا نے پبلشروں سے معاملہ کرنے کا کام خود سنبھال لیا تھا اور شوہر کو فرصت کے اوقات فراہم کر دیے تھے جس کی اسے لکھنے کے لیے ضرورت تھی۔ مالی طور پر اس کا باپ بھی ان کی مدد کرتا تھا تاکہ وہ صرف اسی آمدنی پر گزر کرنے کے لیے مجبور نہ رہیں جو لکھنے سے ہوتی تھی۔ بہر حال پہلی جنگِ عظیم کے آغاز تک ٹامس مان ایک انتہائی کامیاب اہلِ قلم بن چکا تھا حالانکہ نقّاد ابھی اس کی قابلیت پر پورے طور پر متفق نہ تھے۔

پہلی جنگِ عظیم نے مان کو بڑی شدید ذہنی کش مکش میں مبتلا کر دیا۔ وہ ایک روایت پرست شخص تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی طرح بھی قومی اندازِ فکر سے آزاد نہ تھا۔ جنگ کو اس نے عوامی قرار دیا تھا اور اپنے اس اعتقاد کا بھی کھل کر مظاہرہ کیا کہ آئندہ چل کر امن ہونا بھی ہے تو جرمنی کو اس جنگ میں فتح ضرور حاصل ہونی چاہیئے اس بات نے اسے جرمنی اور فرانس کے ان دانشوروں میں مطعون کرا دیا جو جنگ کو پاگل پن سمجھتے تھے۔ ایک اندازہ یہ بھی ہو رہا تھا کہ جنگ جمہوریت کو اپنے ساتھ لے کر آئے گی جو اسے پسند نہ تھی اور جنگ کے بعد واقعی اس نے اس فوجی حکومت کے قیام کو خوش آمدید کہا جو میونخ میں اس کم عمر ری پبلک آف بویریا کے خاتمہ پر وجود میں آئی تھی جس کا اعلان جنگ کے اختتام

کے دوران ۱۹۱۸ء میں کیا گیا تھا۔ بہرحال آگے چل کر اس فکر میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں۔ ۲۰-۱۹۱۸ء کے دوران اس کے لکھے ہوئے مضامین جرمنی کی سیاسی منظر کشی کرتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں اس کا عظیم ناول "دی میجک ماؤنٹنس" شائع ہوا جو اس دور کا جائزہ تھا۔

کہانی کی دائرۂ عمل سوئٹزرلینڈ کا ایک سینٹوریم ہے جو بیمار یوروپ کی علامت ہے اور جہاں مریض دنیا کے حالات اور فلسفوں پر تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ ایک مریض ایک واضح جمہوریت کی وکالت کرتا ہے، دوسرا انسانیت کی تیسرا حکومتِ مجاز کے حق میں کچھ کہتا ہے۔ ہر چیز سوالیہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ کوئی چیز حتمی نہیں ہے لیکن آخر میں کسی بات کا کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دیا گیا اور دیا بھی نہ جا سکتا تھا۔

۱۹۲۹ء میں ٹامس مان کو ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس کے بارے میں عام احساس تھا کہ وہ اس کا مستحق ہے۔ اسی سال ماہِ نومبر میں "نیشنل سوشلسٹوں" کے ایک اخبار "دولکشر بیوباشری" نے اسے دوسرے درجے کا ادیب اور جمہوریت کا مصنف قرار دیا۔

۱۹۳۳ء میں جب "نیشنل سوشلسٹ" جرمنی میں برسرِ اقتدار آئی تو ٹامس مان سے کہا گیا کہ کیا وہ اس بات پر آمادہ ہے کہ بدلے ہوئے حالات کے تحت خود کو "پروشین اکیڈمی آف آرٹس" کا تابع بنا لے جس کا وہ خود بھی ایک رکن تھا۔ مان کی طرف سے کوئی اثباتی جواب بدیہی طور پر اسے عملی سیاست سے خارج کر دیتا۔ لہٰذا اس نے جواب میں یہی کہہ دینا

مناسب سمجھا کہ آئندہ اسے ایسی باتوں سے کوئی سروکار نہ رہے گا۔
اس موقع پر وہ ملک سے باہر تھا اس لیے وہیں ٹھہر گیا۔ اب وہ ان بے شمار لوگوں میں سے ایک تھا جنھوں نے نازیت کے ساتھ تعاون کو پسند نہ کیا تھا اور جلا وطنی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ٹامس مان نے نازیت کے لیے ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے: "نیشنل سوشلزم کی طرف سے ایک طرزِ حیات ہونے کا دعویٰ قطعاً مہمل ہے، یہ صرف ایک آلہ ہے اس اقتصادی اور سماجی نظام کے قائم رکھنے کا جسے سوشلزم سے خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔" ٹامس مان نے محسوس کر لیا تھا کہ لوگ نازیوں کی پیروی کریں گے کیونکہ ہٹلر نے انھیں کام فراہم کر دیا تھا۔ چنانچہ اس نے موقع پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور لوگوں کو متنبہ کیا کہ وقتی فائدہ کی خواہش صرف جرمنی ہی کو نہیں بلکہ سارے یورپ کے مستقبل کو خطرے میں ڈال دے گی۔

اپنے اس دور میں وہ ایک عرصے تک سوئٹزرلینڈ میں رہا پھر امریکہ چلا گیا جہاں دیگر مشاغل کے ساتھ ساتھ پرنسٹن یونیورسٹی میں پروفیسر بھی ہو گیا۔ جنگ کے زمانے میں وہ جرمنی کے لیے ریڈیو سے نشریات بھی کرتا رہا تاکہ قوم کو صحیح صورتِ حال معلوم ہوتی رہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے عملی تجربات بھی بیان کرتا جو اس نے اپنے انتہا پسندانہ نیشنلزم کے مختلف مدارج طے کرنے میں حاصل کیے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد بھی وہ امریکہ میں ہی ٹھہرا رہا۔ اس دور کی سیاست اگرچہ امریکہ ہی

کے زیرِ قیادت چل رہی تھی مگر مان نے اس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔

ٹامس مان نے بڑی کثرت سے افسانے، ذرا مختصر ناولیں لکھی ہیں جن میں سے ایک تصرف کردہ ترجمہ بھی ہے۔ "ہندوستان کے مختلف پیشواؤں کی داستانیں" ۱۹۴۰ء میں طبع ہوا تھا۔

اس کا آخری عظیم ناول "ڈاکٹر فاسٹس" ۱۹۴۷ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں اس نے موسیقی سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ اس کا خاص کردار "ایڈرین لیور کہن" ایک موسیقار ہے۔ کتاب معلومات سے پُر اور جرمنی کی تاریخی تحریکات کا جائزہ ہے اور ایک قسم کا مجموعہ بھی جس میں وہ ساری باتیں آگئی ہیں جو مان نے اپنی دوسری تحریروں یا ان کے علاوہ بھی کہیں بیان کی ہیں۔

اس کے بعد کی کتاب "ٹرکٹر فیلکس کُرل کے اعترافات" ہے جس کے بارے میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ مان نے اس سے زیادہ ہلکی پھلکی اور تفریحی کتاب کسی نے نہیں لکھی۔ اس کتاب پر وہ کئی برس تک کام کرتا رہا۔ اس میں پہلی جنگِ عظیم سے قبل کے جرمنی کے تابناک طنزیہ مناظر شامل ہیں۔

ٹامس مان پھر کبھی جرمنی میں مستقل قیام کے لیے واپس نہیں آیا۔ وہ جب یورپ پلٹا تو اس نے زیورچ میں رہائش اختیار کر لی اور جب وہ جرمنی آیا بھی تو جرمنی اس کے نزدیک سرد اعصابی جنگ کی ریشہ دوانیوں کا نشانہ بن چکا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں اس نے فرینکفرٹ میں گوئٹے کے یومِ پیدائش

کی دو سو سالہ تقریب کے موقع پر تقریر کی۔ گوئٹے سے اس کو ہمیشہ بڑی عقیدت رہی تھی۔ اس موقع پر اس نے جرمنی کی حالت کا جو مشاہدہ کیا تھا، اس سے متاثر ہو کر ایک ناول "چارلوٹے ویمر میں" لکھا ہے جس میں "چارلوٹے" کی گوئٹے کی تقریب میں آمد کا ذکر ہے۔ اس کتاب کا اندازِ تحریر وقت کے رواج کے مطابق ہے اور تقریباً ویسا ہی جیسا اس نے بعض دوسری کتابوں مثلاً "یوسف اور اس کے بھائی" میں اختیار کیا ہے۔ یہ اس کی آخری کتاب ہے جو بائبل کی کہانی کا ایک نیا رُوپ ہے اور جسے بائبل ہی کی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی تھی اسے اس بات کی علامت سمجھا گیا کہ جرمنی کے بعض اچھے پہلوؤں کے لیے اس کا اعتقاد ابھی کم نہیں ہُوا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

(برگائٹ ڈسلام)

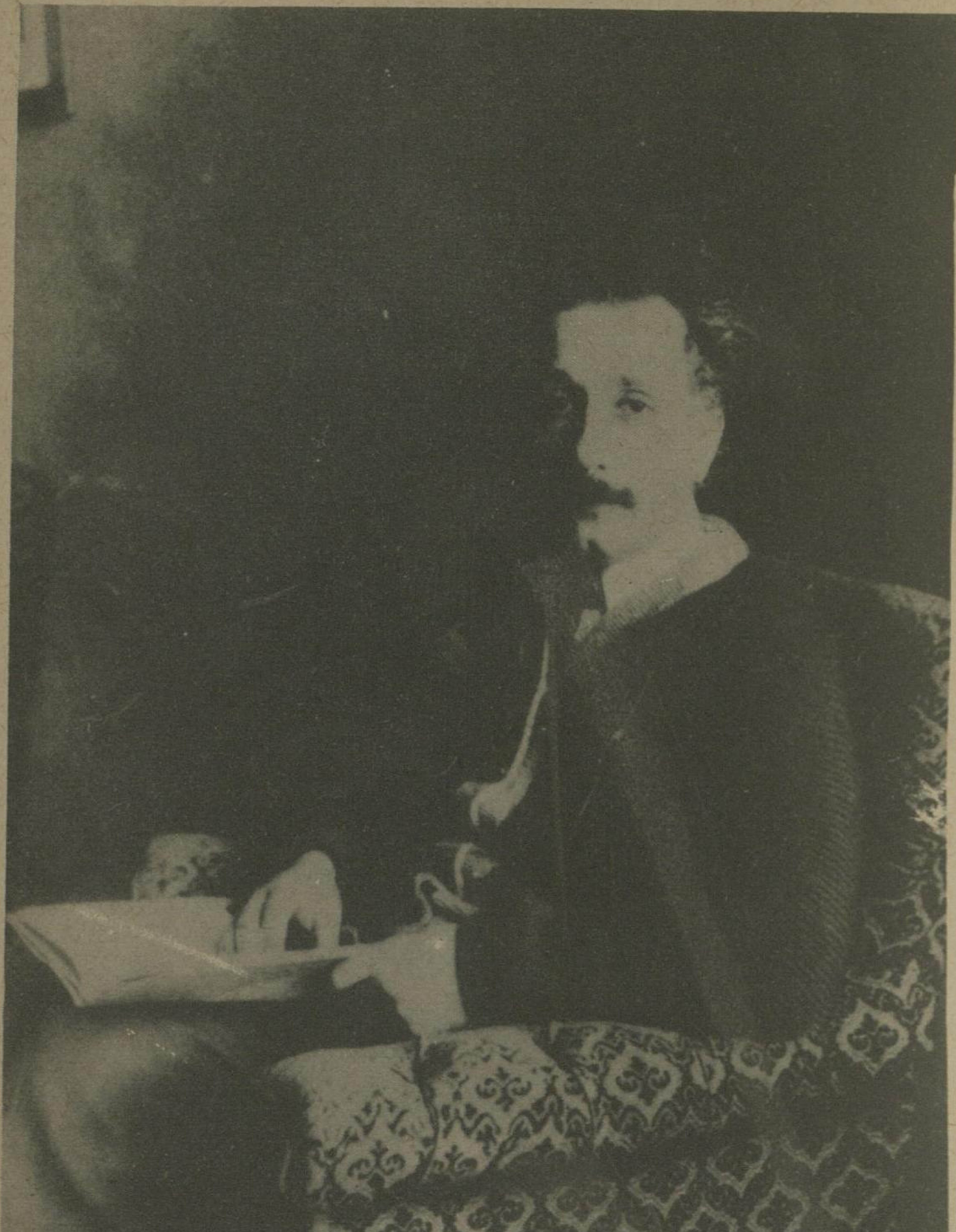
البرٹ آئن سٹائن

نظریۂ اضافیت کا بانی (۱۸۷۹ء - ۱۹۵۵ء)

گزشتہ ایک صدی کے دوران انسان نے جو دریافتیں اور ایجادات کی ہیں اُن کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ۱۹۳۲ء میں البرٹ آئنسٹائن نے تحریر کیا:

"اگر ہماری تنظیمی ترقیاں بھی مشینی ترقیوں کے قدم بہ قدم چلتیں تو آج ہم سب چین کی بنسری بجارہے ہوتے، لیکن ہوا یہ کہ محنت شاقہ سے حاصل کیے ہوئے نتائج کچھ اس طرح نئی نسل کے ہاتھ میں آگئے جیسے کسی تین سالہ بچے نے کوئی دھاردار استرا پکڑ رکھا ہو۔ تکنیکی ترقی کا اندوہناک پہلو یہ ہے کہ اسے انسانی زندگی اور تخلیقات کو تباہ کرنے کا ذریعہ بنانے پر زیادہ زور دیا جارہا ہے۔

تکنیکی ترقی کا اہم کارنامہ یورانیم کے جوہر کو توڑنا تھا جو ۱۹۳۹ء میں عمل میں آیا۔ آئنسٹائن نے اس موقع پر ذاتی طور سے کہا تھا کہ یہ دریافت انسان کو بس اتنا نقصان پہنچا سکتی ہے جتنا کہ ماچس کی ترقی سے ممکن ہو۔ لیکن اسی سال جنگ کے شروع ہو جانے کے باعث یہ خیال خلافِ قیاس تصور کیا جانے لگا اور یقین کرلیا گیا کہ جرمنی میں "نیشنل سوشلسٹ" پورے



البرٹ آئن سٹائن
نظریۂ اضافیت کا بانی

طرح جوہری بم بنانے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آئنسٹائن نے صدر روزویلٹ سے سفارش کی کہ اس قسم کے ہتھیاروں پر تحقیقات کا کام تیز تر کر دیا جائے کیونکہ اگر صرف نیشنل سوشلسٹوں کی حکومت ایسا بم بنانے میں کامیاب ہو گئی تو ساری دنیا ان کی یرغمال بن کر رہ جائے گی۔ اس نے اس بات کا بھی اندیشہ ظاہر کیا کہ ایسا بم بنانے سے بنی نوع انسان کو زبردست تباہی کا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ آئنسٹائن نے اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کی کہ وہ صلح جوئی پر اعتقاد رکھتا ہے اور میدانِ جنگ کی ہلاکت کو قتل عمد سے مختلف نہیں سمجھتا۔

بعد ازاں جب امریکہ نے ایٹم بم تیار کر لیا اور جرمنی نازی اس منزل تک نہ پہنچ سکے تو آئنسٹائن نے امریکی صدر سے اپیل کی کہ یہ مہلک ہتھیار جاپانیوں کے خلاف بھی استعمال نہ کیا جائے لیکن اس کی بات نہ سنی گئی اور در حقیقت یہ بات قابل یقین قرار دی جاتی ہے کہ صدر ٹرومین کو اس کے خط پر توجہ دینے سے جان بوجھ کر روک دیا گیا تھا۔

البرٹ آئنسٹائن ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کو جنوبی جرمنی کے قصبہ اُلم میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ بچپن میں وہ کُند ذہن تھا اور کسی اعلیٰ صلاحیت کا کوئی جوہر اس میں پایا نہ جاتا۔ بچپن کا زمانہ میونخ اور میلان میں گزرا۔ ۱۹۰۰ء میں اس نے فیڈرل انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی، زیورچ سے گریجویشن کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں اس کو

سوئٹزرلینڈ کے دارالحکومت برن کے دفتر پیٹنٹ (ایجادات اور اختراعات کے محکمۂ رجسٹریشن) میں معائنہ کنندہ کی حیثیت سے ایک آسامی مل گئی۔ اسی زمانے میں اس نے اپنے ڈاکٹری کے مقالے کا کام شروع کیا اور ۱۹۰۵ء میں زیورچ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی پھر اپنے نظریۂ اضافیت کی تدوین کرنے میں لگ گیا تھوڑے وقفے سے اس نے فوٹو الیکٹرک اثرات کی توضیح کی اور ایٹمی ذرّات کی حرکات کا مطالعہ کیا۔ ان کاموں نے اس کے ماحول کو خاصا متاثر کیا چنانچہ اسے زیورچ یونیورسٹی میں ایک عہدے کی پیش کش کی گئی۔ دوسرے سال وہ جرمنی یونیورسٹی پراگ چلا گیا جہاں سے دو سال بعد نظریاتی طبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ زیورچ آگیا۔ ۱۹۱۳ء میں اس نے برلن میں نظریاتی طبیعیات کے قیصر ولیم انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر کا منصب قبول کرلیا۔ دوسرے سال اس نے دوبارہ جرمنی کی شہریت حاصل کرکے اپنے فرائض سنبھال لیے، کیونکہ سوئٹزرلینڈ کی شہریت حاصل کرنے کے بعد وہ اس سے محروم کردیا گیا تھا۔ تین سال بعد اس نے عمومی نظریے کی تکمیل کی اور اپنے خصوصی نظریۂ اضافیت کو آخری شکل دی۔ اس کے بعد نظریۂ یکسانیت مکان پر کام کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں اس نے اعلان کیا کہ اسے اس کے اجزائے ترکیبی کی کلید مل گئی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس کا ریاضیاتی تجزیہ سامنے آیا۔ اس سے پیشتر وہ ۱۹۲۱ء میں طبیعیات کا نوبل پرائز حاصل کرچکا تھا

۱۹۳۳ء میں نیشنل سوشلسٹوں کے اقتدار میں آنے تک وہ برلن ہی میں مقیم رہا پھر اس خوف سے بھاگ نکلا کہ کہیں یہودی ہونے کے سبب اسے نیشنل سوشلسٹوں کے مظالم برداشت نہ کرنا پڑیں۔ اس کے بعد اس نے پرنسٹن کے ادارہ ایڈوانسڈ اسٹڈی میں ملازمت قبول کر لی اور ۱۹۴۵ء تک وہیں مقیم رہا۔ ۱۹۳۴ء میں وہ پھر جرمن شہریت سے محروم کر دیا گیا تھا لہٰذا ۱۹۴۰ء میں اس نے امریکی شہریت حاصل کر لی۔

آئنسٹائن نے نیشنل سوشلزم کو مکمل طور پر مسترد کیا تھا۔ وہ ایک جمہوریت پسند تھا اور عسکریت کے مخالف کی حیثیت سے اسے جارحیت اور شر قرار دیتا تھا۔ طبعی طور پر وہ ہر قسم کی گروہ بندی کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ لکھتا ہے: "جو شخص بینڈ کی دُھن میں مست ہو کر ترتیب و قطار میں قدم سے قدم ملا کر مارچ کرتا ہے، میں اسے حقیر سمجھتا ہوں، اس کی کھوپڑی میں دماغ شاید غلطی سے رکھ دیا گیا ہے ورنہ دراصل اس کے لیے تو صرف حرام مغز ہی کافی تھا۔"

آئنسٹائن نے کہا: "ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ ہیروازم (دوسروں پر فوقیت حاصل کرنے کے رجحان) کے مروّجہ جذبے اور اس احمقانہ حب الوطنی کے خلاف جہاد کرے جس نے دنیا کو اس قدر مصائب سے دوچار کر دیا ہے۔" اس کا خیال تھا کہ بعض سیاسی اور تجارتی اداروں کو اسکولوں اور اخبارات کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کرنے سے روک

دیا جائے تو حالات سدھر جائیں گے۔ ساتھ ہی وہ فوجی سرشتے کو ختم کرنا اور حکومت کو قومیت کے جذبہ کی ہمّت افزائی سے روکنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر ریاستیں اپنے باہمی جھگڑوں کو ایک ثالثی عدالت کے سامنے پیش کرنے اور اس کے فیصلوں کو تسلیم کرنے کی پابندی اختیار کر لیتی تو جنگوں کے امکانات سے دنیا کو بچایا جا سکتا ہے اس سلسلے میں وہ افراد کو بھی ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ انھیں اس امید کے ساتھ ہتھیار اٹھانے سے انکار کر دینا چاہیے کہ ان کا عمل دوسرے ساتھیوں کے لیے ایک اخلاقی مثال بنے گا اور ایسا ماحول پیدا کرے گا کہ اسلحہ ساز کارخانوں کے افادی تقاضوں کے باوجود تخفیف اسلحہ کی تحریک کی کامیابی ممکن ہو جائے گی۔

فی الحقیقت وہ فرد کی اہمیت پر بہت زور دیتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سائنس کی دنیا میں تو سارا دارومدار کسی فرد واحد پر ہوتا ہے جو اہم انکشافات اور دریافتوں کا سبب بنتا ہے لیکن دوسرے معاملات میں بھی افراد کی یہی اہمیت ہونی چاہیے —— ہر فرد کو اپنی اپنی جگہ اپنے رویے پر غور کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس کے فکر و عمل سے معاشرے کی بہتری کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں یا خرابی کی؟ وہ مقابلہ برائے مقابلہ کا سخت مخالف تھا کیونکہ اس کے نزدیک یہ بات سماجی رواداری کے بجائے انسان میں خود غرضی پیدا کرتی ہے۔ سب سے اہم بات جو

وہ چاہتا تھا یہ تھی کہ فرد کی ایسی تربیت ہونا چاہیے کہ وہ خود اپنے کردار پر احتسابی نظر ڈال سکے ۔ بعض موضوعات میں خصوصی مہارت پیدا کرنے کے بجائے اسے ذہن نشین کرایا جائے کہ اس کی انسانی ذمہ داریاں کیا کیا ہیں ؟ اس میں اس بات کا جیتا جاگتا احساس موجود ہونا چاہیے کہ اخلاق اور سچائی کیا ہے ؟ افراد میں اس صلاحیت کو اجاگر کیا جائے کہ وہ دوسروں کے جذبات و احساسات کو سمجھ سکیں تاکہ ان کے اعمال اور تقاضوں کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اس کا مقصد صرف اتنا تھا کہ لوگوں میں ذمہ داری کا صحیح شعور جاگ اُٹھے

دوسری جنگِ عظیم شروع ہونے سے قبل اس نے جاپانی اسکولوں کے بچوں کو لکھا تھا کہ تمہیں ایک گراں قدر ترکہ ملے گا جس میں کئی پشتوں کی کارگزاریاں شامل ہوں گی ، یہ تمہارا فرض ہوگا کہ تم اس کی قدر کرو اور اس کو مزید ترقی دے کر آنے والی نسلوں کے حوالے کر جاؤ۔

حقیقتاً وہ بڑی ہی رنگارنگ خصوصیات کا حامل تھا۔ امن عالم کے لیے بھی کام کرتا ، بہتر اور خوش باش زندگی گزارنے کے لیے لوگوں کا دل بھی بڑھاتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایسے انقلابی نظریوں کو بھی پیش کرتا جیسے اضافیت ! اپنے اس نظریے میں اس عظیم سائنسدان نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام مظاہر قدرت ، ستارے ، سیّارے ، روشنی ، بجلی اور جوہری ذرّات عام قوانین کے پابند ہیں۔ اس کا تحقیقی کام جو ساری زندگی کا سرمایہ ہے ' اس نکتے پر

پر دلالت کرتا ہے کہ تمام مظاہر دو خاص اصولوں کی پیداوار ہیں، نقل یا قوتِ مدافعت اور برقاطیسی دائرۂ عمل یا قوتِ کشش۔ نظریہ اضافیت انسانی ذہن کی سب سے زیادہ اثرانگیز کامیابی ہے جس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۵۵ء میں وہ پرنسٹن میں فوت ہو گیا۔

(ایچ۔ جی۔ شوارک)

ایڈتھ اسٹین

(۱۸۹۱ء - ۱۹۴۲ء) ایک راہبہ اور ادیبہ

ایڈتھ اسٹین کا جشن تزئین تطہیر ۱۹۶۲ء میں کولون کے کیتھولک چرچ کے چیف گورنر کی موجودگی میں بڑے شاندار طور پر منایا گیا۔ اس سے نہ صرف کیتھولک دنیا میں بلکہ بہتیرے دوسرے حلقوں میں ایک زبردست ہلچل مچ گئی کیونکہ اس کا نام جرمنی کی ماضی قریب کی تاریخ سے ایک خصوصی وابستگی رکھتا تھا۔ اس کے سوانح نگار اسے ہماری صدی کی عظیم ترین عورتوں میں قرار دیتے ہیں اور کیتھولک چرچ نے تو اس کی شخصیت کو قابلِ احترام اور اس کی زندگی کو مجاہدانہ تسلیم کیا۔ کیونکہ یہی دو خاص شرطیں تھیں جن کے متعلق پورا پورا اطمینان کیے بغیر کسی کی رسمِ تطہیر ادا نہ کی جاسکتی۔ ایڈتھ اسٹین ایک یہودن تھی۔ منکر خدا، فلسفی، عیسائی معلّمہ اور آخر میں ایک کیتھولک نن جو نیشنل سوشلسٹوں کے ہاتھوں قتل کر دی گئی۔ یہ اس کی ۵۱ سالہ زندگی کے مختلف مدارج تھے۔ جو لوگ اسے اب بھی جانتے ہیں، وہ اس غیر معمولی خاتون کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں جس نے اپنی زندگی کے ہر دور میں نمایاں اہمیت حاصل کی ہے اور جس کا مقصد بقول خود سچائی کی

تلاش تھا۔

ایڈیتھ اسٹین ۱۸۹۱ء میں سلیشیا کے ایک قصبہ بریسلا میں پیدا ہوئی۔ یہ قصبہ جرمنی کے ان قصبات میں تھا جو آج پولینڈ میں شامل ہیں ایڈیتھ متوسط طبقے کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھی جوان کثیر خاندانوں میں سے تھا جنھوں نے مختلف اوقات میں جرمنی کو کتنی ہی برگزیدہ اور روحانی ہستیوں سے نوازا۔ ایڈیتھ اسٹین کو یہودی عقاید کے مطابق ترتیب دی گئی تھی حالانکہ یہ بات کسی حد تک رواج کے برعکس تھی کیونکہ اس دور میں یہودیت کسی کٹر مذہب کی تعریف میں نہ تھی۔ یہودی عموماً مذہبی تحریک کے سلسلے میں فراخدلی اور آزادخیالی برتتے تھے۔

ایڈیتھ اسٹین بچپنے ہی سے اندر کی کسی آواز کی قائل تھی۔ چنانچہ ماضی کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک موقع پر لکھتی ہے "میں نے اپنے خوابوں میں ہمیشہ تابناک مستقبل دیکھا ہے۔ ذہن کی آنکھوں سے میں ہمیشہ مسرت وشہرت کا مشاہدہ کرتی رہی ہوں۔ اس سے مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی عظیم مقصد کے لیے خلق ہوئی ہوں اور حقیقتاً اس متوسط طبقہ کی زندگی سے متعلق نہیں ہوں جس میں مجھے پیدا کیا گیا ہے"

بلاشبہ بیشتر نوجوان کسی نہ کسی وقت ایسے ہی یا اس سے ملتے جلتے جذبات کا اظہار کیا کرتے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر حالات کے دباؤ میں آکر یا خود اپنی نااہلی کی وجہ سے اپنے تصوّرات سے دست بردار ہو جاتے

ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جو کمتر درجہ کے مقاصد حاصل کرنے کی دھن میں لگ جاتے ہیں، صرف چند افراد اپنے تصورات یا خود اپنے آپ کو سمجھ پاتے ہیں۔ ایڈتھ اسٹین انھی مستثنیٰ لوگوں میں سے تھی خواہ وہ ذاتی طور پر اپنی حقیقت سے بے خبر ہی کیوں نہ رہی ہو۔ بہرحال جب اس نے اسکول کی تعلیم مکمل کرلی تو اپنے قصبے بریسلاہی میں پڑھنے لگی۔ نفسیات اس کا خاص اور محبوب مضمون تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس نے فلسفہ، تاریخ اور خالص جرمنی مضامین کا مطالعہ بھی کیا۔ دو سال بعد وہ گوٹنجن چلی گئی جہاں مشہور فلاسفر ایڈمنڈ ہیرل اشیا کے منطقی استدلال کے نظریات اور ان کے اصول متعین کرنے کے مرحلے طے کر رہا تھا۔ ایڈتھ اسٹین کو یہ طریقہ بہت پسند آیا جس میں دلائل کے ذریعے اشیاء کو سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہیرل ایک پیدائشی یہودی تھا جو بعد میں پروٹسٹنٹ عیسائی ہوگیا تھا۔ وہ شروع میں اشیا کا تجزیہ کرنے کے سلسلے میں خالصتہً مخالف مابعد الطبیعات رہتا پھر اشیاء کو ان کے وجود کے دائرہ میں سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد ہی جاکر کہیں ان کی ممکنہ اہمیت پر بحث کرتا تھا۔

ایڈتھ اسٹین نے ہیرل کی شاگردی اختیار کرلی اور ۱۹۱۵ء میں اپنے آخری امتحانات پاس کیے۔ دو سال بعد اسے اعلیٰ ترین اعزازات کے ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی۔ یہ احساسات کی ہم آہنگی کے مسائل ایک امتحان تھے جن سے نفسیات کے میدان میں سائنٹفک کام کے

سلسلے میں اس کی صلاحیتوں کا انکشاف ہوا۔ پھر وہ ہیرل کی نائب بن گئی۔ جنگِ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد، جس کے دوران اس نے انسانی فرض سمجھ کر رضا کارانہ طور پر ایک اسپتال میں کام کیا تھا، وہ ہیرل کے ساتھ جنوبی جرمنی کی فری برگ یونیورسٹی چلی گئی۔ جہاں اس نے فلاسفہ کے بعض اجتماعات کا اہتمام کیا اور خود اپنے خیالات کے مطابق کام کرنے لگی۔ اب ہیرل سے اس کے تعلقات منقطع ہو گئے پھر وہ فلسفی میکس شیلر سے بھی ملی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتی ہے: "اس عرصے میں اس نے نہ صرف مجھے بلکہ کتنے ہی ایسے لوگوں کو بھی خاصا متاثر کر لیا تھا جن کا فلسفے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب شیلر مکمل طور پر کیتھولک عقاید اختیار کر چکا تھا اور میں نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا جو میرے لیے بالکل نئی تھی۔ اس ماحول نے کیتھولک عقاید کی جانب میرے رجحانات کی قیادت نہیں کی لیکن اس سے ایک ایسی دنیا میرے سامنے آ گئی جو نوادرات سے پُر تھی اور جس سے میں زیادہ عرصہ تک آنکھیں بند کیے گزر نہ سکتی۔ آخر کار نسلی عصبیت اور جانبداری کے وہ حصار جو نادانستگی میں میرے گرد تعمیر کر دیے گئے تھے، مسمار ہو گئے اور ایمان کی بے اوٹ دُنیا میرے سامنے آ گئی۔

اس مقام تک پہنچنے کے بعد قبول عقاید کی منزل زیادہ دُور نہ رہی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ایڈتھ اسٹین باقاعدہ کیتھولک فرقے میں شامل

ہوگئی۔ ایک غیر متعلق شخص کے لیے یہ بات فطری طور پر قدرے مشکل ہوگی کہ وہ ایڈتھ اسٹین کے اس اقدام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھے اس لیے کہ اس قسم کے معاملات کا تعلق قطعی طور پر انسان کی اپنی داخلی کیفیات سے ہوتا ہے۔ بہرحال یہ بات تو خود اس نے کہی ہے کہ اس سلسلے میں جو چیز فیصلہ کن محرک ثابت ہوئی، وہ سینٹ تھریشیا کی خودنوشتہ سوانح حیات تھی۔ وہ لکھتی ہے: ”میں نے اس کتاب کو شروع کیا اور فی الفور اس سے متاثر ہوگئی۔ دنیا سے میرا تعلق ختم ہوگیا اور جب میں نے کتاب ختم کی تو بے اختیار پکار اُٹھی یہی حق ہے“۔

ایڈتھ اسٹین کا خاندان نہ اس کی تبدیلی کو سمجھ سکا اور نہ اس نے اس کو پسند کیا۔ اس کی ماں اس کے اس اقدام کو کبھی معاف نہ کرسکی اور خاندان کے ایک رکن نے تو تلخی کے ساتھ اس کو لکھا: ” ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہماری عالی مقام ایڈتھ کی رُوح ایسے باطل فرقے میں شامل ہوکر اپنے آپ کو اس قدر ادنیٰ کیونکر بنا سکتی ہے!“

اس کے بعد کا زمانہ اس کی انتہائی مصروفیت کا تھا۔ ڈومینکن آرڈرز ہائی اسکول اور اجتماعات برائے معلمات کے ہدایت کار کی حیثیت سے اسے اسقف کے قصبہ میں جگہ مل گئی جہاں وہ ۱۹۲۲ء سے لیکر ۱۹۳۲ء تک رہی اس کے بعد وہ منسٹر میں جرمن ادارہ برائے سائنسی تعلیمات میں ریڈر ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ تعلیمی سلسلوں اور اجتماعات

میں نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی جا کر لیکچر دیا کرتی تحقیقاتِ فلسفہ اور اشیا کے منطقی استدلال کی سالانہ کتاب کے لیے بھی لکھا کرتی تھی۔ جہاں تک عام آدمیوں کا تعلق ہے، ان میں اس نے اپنے ان ترجموں ہی کی وجہ سے شہرت پائی جو اس نے تھامس اکیونلس اور برطانوی کیتھولک چیف گورنر جان ہنری نیومین کی تحریروں کے جرمن زبان میں کیے۔

اگلے سال ۱۹۳۳ء میں نیشنل سوشلسٹ جرمنی میں برسرِ اقتدار آ گئے اور منظم جماعت کے محتاط سلسلے شروع ہو گئے۔ پھر ایک قانون پاس کیا گیا جس کے ذریعے ریاستی دفاتر کے عہدے یہودیوں کے لیے ممنوع قرار دے دیے گئے۔ ایڈتھ اسٹین بھی اس کی زد میں آ کر اپنے مناصب سے محروم ہو گئی، کیونکہ وہ آریا نسل کی نہیں تھی اور اب وہ کچھ کر بھی نہ سکتی تھی لہٰذا اِس نے فیصلہ کیا کہ وہ نن بن جائے گی۔ یہ وہ خیال تھا جو مدّت سے اس کے دل میں مچلتا رہا تھا۔ آخر اس نے آرڈر آف دی ڈسکالڈ کارمیلائٹ کے ادارے میں جو تھریشیا آف اویلا نے قائم کیا تھا، شمولیت حاصل کر لی۔ اس ادارے کی بانیہ کی کتاب ہی نے اسے کیتھولک عقیدہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ شہر کولون کی کارمیلائٹ خانقاہ میں اسے خوش آمدید کہا گیا اور وہ تقریباً بیس دوسری بہنوں کے ساتھ مکمل طور پر دنیا سے سارے رشتے منقطع کر کے رہبانیت کی زندگی گزارنے لگی۔ اس مسلک کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس

کی پیروا اپنی زندگی شفاعت کے لیے وقف کر دیں اور دوسری کیتھولک ننوں کی طرح لازمی طور پر پاکدامنی، مسکینی اور اطاعت کی زندگی گزار دیں ——— یہ بات عام آدمی کی سمجھ میں بڑی مشکل ہی سے آسکتی ہے کہ کوئی شخص کیوں دنیا سے اس قدر کٹ کر رہنا چاہے گا۔ لیکن ایڈتھ اسٹین کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا تھا کہ وہ اسی طرزِ حیات کو اپنا لے۔ اسے لکھنے کی خصوصی اجازت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ خانقاہ میں داخلے کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے خاندان کی کہانی لکھی۔ اس کتاب کا نام اس نے ایک یہودی خاندان کی زندگی سے" رکھا۔ تصنیف کا سبب اس نے کتاب کے پیش لفظ میں اس طرح بیان کیا ہے: "گزشتہ چند مہینوں سے یہودی معمول کے مطابق زندگی گزارنے سے محروم ہیں۔ انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر دیا گیا ہے کہ وہ کیا ہیں، ان کے طور طریق کیسے ہیں اور ان کا انجام کیا ہوگا؟ میری ایک یہودی سہیلی نے اس موقع پر، جب ہم یہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم پر اچانک کیا افتاد نازل ہو سکتی ہے، مجھ سے کہا کاش مجھے معلوم ہو سکتا کہ ہٹلر یہودیوں سے اس قدر نفرت کیوں کرتا ہے! نئے حکمرانوں کی سوچی سمجھی تحریروں اور تقریروں نے ہمیں اس سوال کا جواب دے دیا اور انھوں نے دہشت ناک حد تک بگاڑی ہوئی ایک تصویر پیش کر دی۔" ایڈتھ اسٹین نے اپنے خاندان کی زندگی پر کہانی لکھتے ہوئے اسی بگاڑی ہوئی تصویر کو درست کرنے

حق ادا کیا ہے۔

نازیوں نے جب یہودیوں کو ایذا دینے کا سلسلہ شروع کیا تو ایڈتھ اسٹین بھی دوسرے ہزاروں جرمن یہودیوں کی طرح اس کی لپیٹ میں آنے سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اسے لرزہ خیز مظالم سے دوچار ہونا پڑا۔ بہرحال ایک صاحب ایمان کیتھولک کے نزدیک مصائب کا مطلب قرب خداوندی بھی ہوتا ہے اور عیسائیت کی تو علامت ہی صلیب ہے جس پر حضرت عیسیٰ نے مصائب برداشت کیے۔ ایڈتھ اسٹین، جس نے اپنے بپتسمہ کے وقت تھریشا کا نام اختیار کیا تھا' اب "سسٹر تھریشیا بنڈ کٹا اے کرس" کہلاتی تھی۔ کرس کے معنے ہیں صلیب۔ اس نے اپنی زندگی کو ایک نن کی حیثیت سے متعین کر لیا تھا اور خانقاہ میں زندگی کا محرک، اصول اور مقصد ہی اپنے وجود کو عشق خداوندی میں گم کر دینا اور نفس کو دوسری ساری باتوں سے پاک کر دینا ہوتا ہے تاکہ خدائی زندگی کے حلول کے لیے جگہ خالی ہو جائے ـــــ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ان سارے راہبوں اور ننوں کو بھی اپنی زندگیوں کا خطرہ لاحق ہو گیا جو دنیا والوں سے الگ تھلگ خانقاہوں اور صومعوں میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہا کرتے تھے مگر جن کی پیدائش یہودی گھرانوں میں ہوئی تھی۔ ان حالات کے پیش نظر ۱۹۳۸ء کے آخر میں ایڈتھ اسٹین جرمنی سے فرار ہو کر ہالینڈ چلی گئی جہاں اس نے اپنے آخری تحریری کام کا آغاز کیا جو سینٹ جان کی تعلیمات سے متعلق ہے۔ اس

میں اس نے عارفانہ مشاہدات و محسوسات کی فلسفیانہ تاویلات پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کا یہ کام نامکمل رہا۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو "نیشنل سوشلسٹوں" نے اپنا دائرہ اقتدار یورپ کے کتنے ہی ملکوں تک پھیلا دیا۔ ہالینڈ بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ نازیوں کا قبضہ ہوتے ہی وہاں بھی یہودیوں پر ظلم و ستم شروع ہو گیا۔ پھر بھی ۱۹۴۲ء تک صومعے اور خانقاہیں بچی رہیں اور ایڈتھ اسٹین خود کو محفوظ سمجھتی رہی مگر اس کے بعد ہی انجام قریب آ گیا۔ ہالینڈ کے پروٹسٹنٹ بشپ نے کھلم کھلا ہالینڈ پر قابض نازیوں کے غیر انسانی مظالم کے خلاف آواز بلند کر دی اور انتقام کے طور پر کلیساؤں سے متعلق ہالینڈ کے سارے یہودی نژاد افراد گرفتار کر لیے گئے۔ نازی خفیہ پولیس گستاپو کا ایک ایجنٹ ایڈتھ اسٹین تک بھی جا پہنچا۔ اسے اپنی سہیلیوں اور دوستوں سے رُخصت ہونے کے لیے صرف پانچ منٹ کی مہلت دی گئی۔ یہ ۲, اگست ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے جس کے بعد وہ اپنی بہن روسا سمیت، خود بھی کیتھولک عقیدہ کی پیرو بن کر خانقاہی زندگی اختیار کر چکی تھی، ۷, اگست تک نظربندی کے کیمپ میں مقید رہی۔ پھر اسے آشوز بھیج دیا گیا جو اس کے گھر برسیلا سے سے زیادہ دور نہ تھا۔ تقریباً تین دن بعد اسے ہلاک کر دیا گیا۔

ایڈتھ اسٹین اپنے بعد ایک بڑی تعداد میں اپنی تحریری کاوشیں چھوڑ گئی اور اپنی انسانی عظمت کا گہرا نقش قائم کر گئی۔ جس نے حق

کی معرفت حاصل کر لی تھی اور اسی معرفت کے مطابق اپنی زندگی گزاری۔

(والٹراڈ ایشن)

جرمن شاہکار ادب

ہمعصر جرمن شاہکار افسانے:
ترجمہ
قرۃ العین حیدر

اس مجموعے کی اکثر کہانیاں جنگ اور مابعد جنگ سے تعلّق رکھتی ہیں — اور انھیں ہمعصر جرمن ادب کا بہترین نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔

مشاہیرِ جرمنی
ترجمہ
سیّد سعید احمد

جرمنی کے ان مایہ ناز عالموں، ادیبوں، فلسفیوں، سائنس دانوں، موجدوں اور سیاستدانوں کے حالاتِ زندگی اور اُن کے کارناموں کا تفصیلی جائزہ، جنھوں نے جرمنی کی حدود کے باہر بھی اپنی اہمیت کے اثرات مرتّب کیے۔ تصاویر سے مزیّن۔

ایک بچّہ ایک چور
ترجمہ
ابوضیا اقبال

ایک دلچسپ، حیرت انگیز اور جاسوسی کے کارناموں سے بھرپور ناول۔

شرارت کا پُتلا
ترجمہ
محمد سلیم الرحمٰن

ایک مسخرے کی شرارت بھری کہانیاں۔ جس کی حرکتوں سے لوگ تنگ بھی تھے، مگر ہنستے بھی تھے۔

چھنگلو میاں کے کارنامے
ترجمہ
ابوضیا اقبال

چھنگلو میاں صرف دو اِنچ کے تھے، لیکن اُنھوں نے کام ایسے کیے کہ بڑے بڑوں نے ان کے آگے کان پکڑ لیے۔

یہ کتابیں فیروز سنز نے ھارسٹ اِرڈمین ورلاگ، جرمنی کے اشتراک سے شائع کی ھیں

فیروز سنز
60- شارع قائدِ اعظم
لاہور